اوم

خمخانۂ رام

یعنی

کلیّاتِ رام

خُم سوم یعنی جلد سوم

جس میں رام بادشاہ کے بارہ گلنامے یعنی شریان سوامی
رام تیرتھ جی مہاراج زندہ جاوید کی بارہ تحریر و تقریر درج ہیں

مرتبہ

آر۔ ایس نارائن سوامی
شاگرد رشید شریان سوامی رام تیرتھ جی مہاراج

جسکو
شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ نے
مطبوعۂ ابراہیم پریس لکھنؤ میں طبع کرایا
باہتمام محمد رفیق منیجر مطبع ہذا سنہ ۱۹۳۷ء

خمخانۂ رام

یعنی

کُلّیاتِ رام

خُم سُوم یعنی جلد سُوم

مشمُولہ رام بادشاہ کے ۱۲ حکمنامے

مُرتبہ

شری۔ آر۔ ایس۔ نارائین سوامی

شاگرد رشید شری سوامی رام تیرتھ جی مہاراج

جسے

شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ نے

ابراہیم پریس امین آباد لکھنؤ میں طبع کرایا

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

مژدہ

شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ لکھنؤ گو وقتاً فوقتاً اپنی کتابیں مستحق لوگوں و لائبریریوں (خیراتی پستکالاؤں) کو مفت تقسیم کیا کرتی ہے۔ لیکن اب دھرم مورتی و نیکدل اصحاب کو اِس دھرم کاریہ میں ہاتھ بٹانے کا موقعہ دینے کے لئے لیگ نے یہ طے کر دیا ہے کہ جو حضرات اس مدعا سے ایک مستقل رقم لیگ کے پاس جمع کر دیں گے۔ لیگ اُس کے سُود سے (جو چھ فیصدی تک ہوگا) ہر سال اُن کے نام سے کتابیں برابر تقسیم کرتی رہے گی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ فیاض دِل اصحاب خوشی سے اس نیک کام میں ہاتھ بٹائیں گے اور اس طرح ناموری و ثواب ہر دو سے بہرہ مند ہوں گے

المشتہر۔ برجناتھ شرغہ۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔
آنریری سکرٹری۔ رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ۔ لکھنؤ

التماس

شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ گذشتہ اُنیس ۱۹ سال سے سوامی
رام تیرتھ جی مہاراج کے جملہ تحریرات و تقریرات کو حق کے مُتلاشیوں
تک پہنچانے میں مصروف ہے۔ اس وقت تک اُس نے ہندی
زبان میں اس کُل مجموعہ کو متعدد جلدوں میں شایع کردیا ہے۔
انگریزی میں سوامی جی موصوف کی محض انگریزی نظمیں۔ لیکچر اور
دیگر مضامین آٹھ جلدوں میں طبع کئے ہیں۔ اُردو داں متلاشیانِ حق
کا عرصہ سے اصرار تھا کہ اُن کے لئے بھی سوامی جی ممدوح کے
کلام کا مکمّل مجموعہ فراہم کیا جائے۔ چنانچہ اس وقت تک اُردو میں
خمخانۂ رام کے نام سے دو جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ جلد اوّل میں
سوامی جی کے رسالہ الف کے پہلے بارہ نمبر درج ہیں اور جلد دوم
میں سوامی جی ممدوح کی مفصل سوانح عمری بشمول بقیہ چھ نمبر رسالہ
مذکور ہے۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ رام کے فضل سے لیگ کو
آخرکار یہ نادر موقعہ اب ملا ہے کہ "خمخانۂ رام" کی جلد سوم
اُردو داں پبلک کی نذر کرے۔ اس جلد میں سوامی جی مہاراج

کے بارہ لیکچر ہیں جس میں سے پہلے دس بزبان ہندی دش آدیش یعنی رام بادشاہ کے دس حکمنامے کے نام سے شایع ہو چکے ہیں اور اس کے علاوہ آخری دو لیکچر جلد ہذا میں اضافہ کئے گئے ہیں۔

یقین ہے کہ جلد ہذا بھی ویسی ہی ہردلعزیز ہوگی جیسی کہ پہلی دو جلدیں ہوئیں۔ اور اُمید ہے کہ رام پیارے دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سُخنے لیگ کی امداد فرماکر اُس کا حوصلہ افزائی کریں گے تاکہ جلد چہارم بھی بہت جلد ہدیہ ناظرین ہو سکے۔

سب کا اپنا آپ

برجناتھ شرغہ ایم۔ اے

سیکرٹری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ۔ لکھنؤ

سوامی رام تیرتھ جی مہاراج

کی

عملی زندگی پر طائرانہ نظر

(از قلم بھائی پورن سنگھ جی ایڈیٹر رسالہ ٹھاٹ)

(جس سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کی جادو بھری تحریر و تقریر "رام بادشاہ کے بارہ حکمنامے" کے نام سے جلد ہذا میں درج ہے اُس کے پڑھنے سے خود بخود ناظرین کے دل میں یہ اُمنگ اُٹھ پڑتی ہے کہ سوامی جی ممدوح کی زندگی کے حالات سے بھی کچھ آگاہی ہو جائے۔ سوامی جی مہاراج کی مفصل سوانح عمری تو خمخانۂ رام جلد دوم میں دی جا چکی ہے اور اُن کی زندگی کے ہر طرح کے حالات سے آگاہی تو اُس جلد کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس مقام پر اُنکی عملی زندگی کے مختصر حالات جو سوامی جی ممدوح کے زندہ جاوید ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اُن کے پیارے بھگت سردار پورن سنگھ جی کی قلم سے بہے تھے اور جو ۲۵ جنوری ۱۹۰۷ء کے رسالہ ست اپدیش لاہور میں شائع ہوئے تھے ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں)

نوٹ۔ اس مضمون میں جس قدر شعر اور ترنگیں ہدیہ ناظرین کی گئی ہیں وہ سب رام کی اپنی شیریں زبان سے نکلی ہوئی ہیں۔　(پورن)

حُبابِ جسم لاکھوں مرمٹے۔ پیدا ہُوئے مجھ میں ؛

سدا ہُوں بحرِ واحد۔ لہر ہے دھوکہ فراواں کا

رامؔ کے من کی ترنگوں میں کون و مکان غرقاب ہوتے تھے اِس چھوٹے سے جسم میں گویا عشقِ الٰہی کا طُوفان ٹوٹ پڑا تھا۔ ہر وقت وہاں تو ایک قسم کی گھنگور گھٹا چھائی رہتی تھی۔ آنند کی جھڑی برستی تھی۔ مستیٔ مجسم رامؔ گاتا تھا۔

ہستی و علم ہوں۔ مستی ہُوں۔ نہیں نام مِرا

خود پرستی و خُدائی ہے یہ بس کام مرا

چشمِ لیلیٰ ہُوں۔ دِلِ قیس و دستِ فرہاد

غزل

بوسہ دینا ہو تو دے لے ہے لبِ جام مرا

گوشِ گُل ہُوں رُخِ یوسف۔ دمِ عیسیٰ۔ سرِ سرمد

تیرے سینے میں بسوں ہُوں ہے وہی بام مرا

حلقِ منصور۔ تنِ شمس و علمِ عُلماء

واہ وا بحر ہُوں اور بُلبلا اِک رامؔ مرا

کسی نے جو کچھ سوال کیا تو رامؔ کھِل کھلا کر ہنسے۔ آہ ہونٹوں تک رامؔ کے قہقہے بجلی کی طرح چمکتے بجلی ہی کی رفتار سے سوال کنندہ کے بند دروازوں کو وا کرتے ہُوئے اُس کے دِل کو نوراً علیٰ نور میں ڈبو دیتے تھے۔ کیسا جواب اور کیسا سوال! رامؔ کے آنند کے آنسو چل رہے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں اور زبان گاتی ہے۔

بانکی ادائیں دیکھو۔ چند کا سا مُکھڑا پیکھو

بادل میں بہتے جل میں وایو میں میری لٹکیں

تاروں میں نازنیں میں موروں میں میری مٹکیں

چلنا ٹُھمک ٹُھمک کر بالک کا رُوپ دھر کر
گھونگھٹ ابر اُلٹ کر ہنسنا یہ بجلی بن کر
شبنم گُل اور سُورج چاکر ہیں تیرے پد کے
یہ آن بان سج دھج اے رام! تیرے صدقے

رام کے پاس بیٹھنا بس زندگی کو از سرِ نو تر و تازہ کرنا تھا۔ نئی اُمیدوں سے چھاتی دھڑکنے لگتی تھی۔ نئے خیال اُس کو دیکھتے ہی سُوجھ پڑتے تھے۔ نیا طرزِ بیان۔ نئی چال۔ نئی ڈھال رام ہر ایک کو مرحمت فرماتے تھے۔ وہ چھوٹا سا دِل ہر دم یوں پُکارتا تھا۔

ہر چشم۔ ہر شَے۔ ہر بشر۔ ہر فہم۔ ہر مفہوم میں
ناظر۔ نظر۔ منظور میں۔ عالِم ہُوں مَیں۔ معلوم مَیں
ہر آنکھ میری آنکھ ہے ہر ایک دِل ہے دِل مِرا
ہاں بُلبل و گُل مہر و ماہ کی آنکھ میں ہے تِل مِرا
اِک بُلبلا ہے مجھ میں سب ایجادِ نَو۔ ایزادِ نَو
ہے اِک بھنور مجھ میں یہ مرگِ ناگہاں اور زادِ نَو

اُن کی پیشانی کا جمال۔ اُن کے چہرے کا جلال۔ اس پژمردہ مُلک میں فرحت آمیز اثر کے لحاظ سے طلوعِ آفتاب کی مانند تھا۔ اکیلا رُنڈ مُنڈ سنیاسی اپنے گیروا رنگ کپڑوں میں آزادی کا ہر دم بھڑکتا ہُوا شعلہ تھا۔ اُس کے پاس بیٹھنے سے ہر قسم کی غلامی سے طبیعت آزاد ہو جاتی تھی۔

اوم کی پُھکنی میں بھر کر بادِ جان کو دَمبدم
پُھونکتے ہیں ہر گھڑی اک آگ بھڑکانے کو ہم

اُن کی حضوری میں کمینہ پن۔ فکرمندی۔ کمزوری۔ ناداری وغیرہ کے

خیالات بھاگتے نظر بھی نہ آتے تھے۔ اُن کی حاضری میں انسانی رُوح ہر دم خیالات کے اونچے سے اونچے آسمانوں میں پرواز کرتی تھی۔ جسم پتّھر کی طرح ساکن ہو جاتا تھا۔ ماضی کے تمام خیالات مستقبل میں ایک طُوفانِ نُور کی طرح بکھر جاتے تھے۔ اور اپنے قالب میں گُزرا ہُوا زمانہ حال کی طرح منوّر ہوتا تھا۔ اور مستقبل کو نئے رنگ ملتے تھے۔

بدلے گا کوئی آن میں اب رنگِ زمانہ
آتا ہے امن جاتا ہے اب جنگِ زمانہ

ساری کائنات اُس پُرنور دماغ سے نیا لباس اختیار کرتی تھی۔ رام بادشاہ کے پاس کوئی چیز بغیر رام کا شاہی خراج ادا کرنے کے حاضر نہ ہوسکتی تھی۔ بیماری ناداری۔ اونچ نیچ جو کچھ حاضرِ دربار ہوتا تھا۔ اپنا اپنا گیت سُناتا تھا۔ اپنا اپنا راز بتاتا تھا۔ گذشتہ سال ہری دوار میں جب بیمار ہُوئے تو فرماتے تھے کہ بُخار بھی رام کے دربار میں کبھی کبھی آ ہی جاتا ہے۔ اور واجب نہیں کہ اُسے اُسی کشادہ پیشانی اور محبتِ دِل سے دیدار نہ ہوں۔ جس سے گنگا د سادھو مہاتماؤں کو ہوتے ہیں۔ چلتے چلتے گر پڑے۔ بولے:۔ واہ واہ! دیکھو یہ رام کا قاصد کیا خطِ معشوق لایا ہے۔ آؤ اسے پڑھ لیں۔ ٹھیک اُسی وقت رام نے اپنی آنکھ دلدارِ حقیقی سے ذرا جھینپ لی تھی۔ اور اے لو۔ دلدار کا تیر سے زیادہ مار کرنے والا خط آیا کون جانے ان رمزوں کو۔ کون قدر کرے اس نزاکت کی۔ کس کی آنکھیں ہیں جو دیکھے اس عجیب و ناز و ادا معشوقانہ کو۔ کون کہتا ہے۔ خُدا کی چھاتی محبتِ دُنیادی سے ویسی ہی نہیں ہلتی۔ جیسی کہ دُنیا کے لوگوں کی۔ اگر یہ چھوٹا سا دِل ایک اِنچ بھر اونچا محبّت سے اُبھرتا ہے۔ تو یقین جانو کہ خُدا کا دِل کوسوں اُچھلتا ہے۔ کوسوں آگے استقبال کو آتا ہے۔ بازو پسار گلے لگاتا ہے۔ ایسا صنم

میرا ہے۔ جو کبھی دھوکہ نہیں دیتا۔ ہمیشہ وفادار ہے۔ کبھی اچھا لڑکا بنکر میرے لئے دُودھ لاتا ہے کبھی دیوتا بن کر میرے پھیپھڑوں میں ہوا پہنچاتا ہے۔ کبھی کسی رنگ میں کبھی کسی ڈھنگ میں میرا ہی معشوق ہے۔ ہر ایک شئے میں اُسی کا دِل ہے۔ ہر ایک آنکھ میں اُسی کی مٹک ہے۔" یہ رام کا لیکچر ہولیا۔ اب ورزش کا وقت ہے۔ کوئی بھی ہو تُم۔ رام کے ساتھ تمہیں ورزش کرنی پڑیگی۔ اُتار دو اپنے دوشالہ کو۔ چھوڑ دو سوالات کو۔ آؤ پہلے رام کے ساتھ ہاتھ میں پھاؤڑا لیکر زمین کو تھوڑا گوڑ دو۔ نہیں تو یہ لو آری۔ اس سے جنگل کی لکڑیاں چیرو۔ تمہارے تپِ دِق کو آرام کرے گی۔ نہیں تو اُٹھاؤ اس گنگا کے پتھر کو۔ اور ڈم بل کی جگہ استعمال کرو۔ یہ کر چکے۔ آؤ اب رام کے ساتھ ناچو۔ کچھ پرواہ نہیں لمبی داڑھی ہو۔ بُڈھے ہو۔ جوان ہو۔ بچے نادان ہو۔ رام کے ساتھ اب آنند سے ناچنا ہی پڑے گا۔ اَے لو جنگل میں منگل ہوگیا۔ رام معہ اپنے پاس آئے ہوئے لوگوں کے دھم دھم۔ تھم تھم ناچ رہا ہے۔ تالی پیٹتی ہے۔ اور گاتے ہیں۔

اب دیون کے گھر شادی ہے۔ لو رام کا درشن پایا ہے۔

پاکو بان ناچتے آتے ہیں۔ ہپ ہپ ہُرّے۔ ہپ ہپ ہُرّے

سب خواہش مطلب حاصل ہیں۔ سب خُوبیوں سے میں واصل ہُوں

کیوں ہم سے بھید چُھپاتے ہیں۔ ہپ ہپ ہُرّے۔ ہپ ہپ ہُرّے

ہر اِک کا انتر آتم ہُوں۔ میں سب کا آقا صاحب ہُوں

مجھ پائے۔ دُکھڑے جاتے ہیں ہپ ہپ ہُرّے۔ ہپ ہپ ہُرّے

سب آنکھوں میں میں دیکھوں ہُوں سب کانوں میں میں سُنتا ہُوں

دِل برکت مجھ سے پاتے ہیں۔ ہپ ہپ ہُرّے۔ ہپ ہپ ہُرّے

گہ عشوہ سیمیں بر کا ہُوں۔ گہ نعرہ شیر ببر کا ہُوں

ہم کیا کیا سوانگ بناتے ہیں۔ ہپ ہپ ہُرّے۔ ہپ ہپ ہُرّے

مَیں کرشن بنا۔ مَیں کنس بنا۔ مَیں رام بنا۔ مَیں راون تھا

ہاں ویداب قسمیں کھاتے ہیں۔ ہپ ہپ ہُرّے۔ ہپ ہپ ہُرّے

سب رِشیوں کے آئینہ دِل میں۔ میرا نُور درخشاں تھا

مجھ ہی سے شاعر لاتے ہیں۔ ہپ ہپ ہُرّے۔ ہپ ہپ ہُرّے

کیا سما بندھ جاتا تھا۔ غم۔ درد۔ دُکھ۔ دُنیاوی ٹنٹے ایک دم کافور ہو جاتے تھے۔

سرود و رقص و شادی دمبدم ہے
تفکر دُور ہے اور غم کو رم ہے

مبارک ہو طبیعت کا یہ کھلنا
یہ رس بھینی اوسنہا جام جم ہے

مبارک دے رہا ہے چاند جھک کر
سلاموں سے کمر میں اُس کی خم ہے

پیئے جاؤ دما دم جام بھر کر
تمہارا آج لاکھوں پر قلم ہے

تھوڑی دیر بعد شام کو میدانِ دل کش۔ ہری ہری گھاس سے ملبوس۔ دریا کا کنارہ۔ ہوا خوشگوار۔ اور رام مرکز میں زینت افروز ہو رہے ہیں۔ سوال پر سوال چلتا ہے۔ جواب پر جواب آتا ہے۔ آنکھوں میں نُور۔ دل میں ٹھنڈک۔ اور سُننے والے کی ہستی کو مستی سے بھرپُور کرتا ہُوا۔ رام بول رہا ہے۔ ریاضی کیمسٹری طبیعات۔ فلاسفی۔ سائیکالوجی کے تحفے بڑے پریم سے حاضرین کے پیش کر رہا ہے۔ دلیل وہ جو گھر کیتی جاتی ہے ثبوت وہ جس کی گواہی سُننے والے کے اپنے تجربے دیتے جا رہے ہیں۔ زندگی کے مشاہدہ شُدہ واقعات رام ایک عجیب پیرایہ میں بیان کر رہے ہیں۔ سیکڑوں دِلکش مثالوں سے نتیجے اخذ کر رہے ہیں۔ ٹھیک اُسی صحت و راستی سے جس طرح ریاضی کے پیچیدہ مسئلے وہ کالج کے کمرے میں حل کیا کرتے تھے۔

اتنا علم ایسے نوجوان۔ چھوٹے سے قد۔ اور اُس چھوٹے سے پہاڑ کی چوٹی کی طرح گنبددار سر میں کیسے تحصیل ہُوا۔ ریاضی کی کوئی ہی کتاب چھوڑی ہوگی

کُل فلاسفی کیا مغربی اور کیا مشرقی - فارسی زبان میں کمال - اُردو میں بےنظیر روانیٔ طبع - انگریزی شُستہ اور شاعرانہ - سنسکرت میں ماہر - اُن کی گفتگو میں کبھی تو شمس تبریز اور مولانا روم - کبھی حافظ - سعدی - عمر خیام - اور کبھی وید کی سنگھتا کے منتر اور کبھی میراں بائی کے گیت - تُلسی کے دوہرے - گرو نانک اور گوبند سنگھ کے ویراگ کے بھرے ہُوئے بھجن - ایمرسن - شیلے - کارلائل - گیٹے - شوپن ہار - کینٹ - کپل - سویڈن برگ - تھورو - والٹ وہٹ مین - کارپنٹر - ڈالیسن - بدھ مہاتما - پنجابی بُلّا شاہ - گوپال سنگھ - مست الست - کبھی شاہ ولی - کبھی بوعلی قلندر - کبھی ہیمراج - کبھی سرمد - کبھی غالب اور بہت سی دہر کبھی نظیر اکبرآبادی - سُورداس - کبھی کبیر - اپنی اپنی باری آتے تھے - اور رام کی تائید کرتے چلے جاتے تھے - گھنٹوں شوپن ہار کی زندگی کی لہروں اور مستی بھری باتوں نے رام کو ہنسایا - نظیر کے ریچھ کے بچے - اژدہا کے بچے - آگرے کی ککڑی - جاڑے کی بہار - برسات کی بہار وغیرہ نے رام کو خوش کیا - کبھی گوپال سنگھ کی درد انگیز التجا برائے وصال خُدا نے رُلایا - کبھی وہٹ مین کی آزادیٔ طبع نے رام سے آشیرباد لی - کبھی عیسٰی کے الفاظ مقبول ہُوئے - کبھی بُدھ کو خطاب ملا - اکبر رام کے پاس آیا - اور اکبر دلی جیسی فلاسفی شخصیت لیکر گیا - کیا ہانگ کانگ کیا جاپان کیا امریکہ جہاں رام بادشاہ کا گذر ہُوا - وہاں ہی سب لوگوں کو حیرت میں ڈالا کہ ننھی سی جان میں کیا بھاری علم کا سمندر مَوجزن ہے - رام جب سے تارک الدنیا ہُوے اُنکے گرد ایک اُڑتی اُڑتی کتابوں کی لائبریری رہنے لگی - مطلب یہ کہ جہاں گئے - وہاں بہت سی کُتب حاضر دربار ہُوئیں - دیدار دینے اور لینے کے بعد رخصت - رام نے امریکہ میں دو سال کے اندر کئی ہزار کُتب فلاسفی پڑھ ڈالیں - ساری امریکن لٹریچر کی چیدہ چیدہ کتابیں نظر سے گذریں -

مصر میں رام کا مسلمانانِ مصر کی خاطر فارسی زبان میں مسجد میں لیکچر ہُوا - اور اُس کی وہ داد ملی - کہ سارے اہل اسلام اُن پر فریفتہ ہُوئے - اُن کی صداقت - اُنکا

عشق حقیقی! اُنکا اثر بھرا کلام کہیں بھی بغیر گھات کے خالی نہ جاتا تھا۔ اس قدر علم رام بادشاہ نے صرف ۲۳ سال کی عمر میں حاصل کیا۔ سنسکرت کی جو کمی تھی۔ وہ پچھلے سال بیاس آشرم میں ڈٹ کر صرف ایک سال کے اندر پوری کی۔ چاروں وید اور ویدانت اور دیگر سنسکرت شاستر کوئی آٹھ صندوقوں میں بھرے ہوئے آج کل رام کی اُڑتی ہوئی لائبریری میں تھے۔ ہر ایک سنگھتا کے منتر کو اُنہوں نے اُس چھان بین سے دیکھ لیا تھا۔ جو صرف ایک علم زبان کے ماہر میں ہی پائی جاتی ہے۔ سنسکرت ویاکرن نوک زبان تھا۔ آخری دفعہ جب میں زیارت کو گیا۔ تو سنسکرت کی پُرانی لٹریچر کی خوبیوں پر گفتگو گھنٹوں ہُوا کرتی تھی۔

کون تھا جو ایسے علم کے جنگل میں جاکر اپنے سارے ذہنی شکوک کو دھو کر اور سوالات پیچیدہ کو حل کر کے نہ آتا تھا۔

بس بھائی۔ اب تو رات کا آخری پہر ہوگیا۔ اور نہ رام کو ہی کچھ پتہ ہے اور نہ سُننے والے کو ہوش ہے۔ لو۔ اب جاؤ۔ سو جاؤ۔ دیکھنا۔ رام میں گُم ہو کر سونا۔ تفکرات تو تمہارے دُور ہو گئے۔ غم کافور۔ اندیشہ رہا ہی نہیں۔ آنند سے لات پر لات رکھکر ایسے سوؤ۔ جیسے کبھی جاگنا ہی نہیں۔

سویرے جاگ کر جو رام کے دربار میں عاشقِ وطن حاضر ہُوا۔ تو رام خوشی سے اپنے جامہ سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ اے لو۔ بھارت جاگ کر رام کے درشن کو آرہا ہے۔ بھائی پیارے! تُم بھارت رُوپ ہو۔ اپنے آپ کو سارا بھارت جاننا۔ کبھی اس سے کم نہ سمجھنا۔ ہمالہ تیرا ہی سر ہے۔ گنگا اور جمنا تیری ہی لٹا جٹا ہیں۔ مالابار اور کورو منڈل تیری ہی ٹانگیں ہیں۔ پنجاب اور مشرقی آسام تیرے ہی بازو ہیں۔ ہندوستان کے تینتیس کروڑ زن و مرد کا دل تیرا ہی شیر دل ہے۔ اُن کی طاقت تیرے ہی بازو کا زور ہے۔

آ بھارت! مَیں تجھے گلے لگاؤں- وہ رام ہنسے وہ سُورج چڑھا- وہ بھارت
جاگا-ہندوستان جاگا! جاگا- جاگا-

ع جاگ موہن جاگ رے بّل گئی ÷ ÷
اُٹھو جاگو- کھاؤ ماکھن- پھیر ڈاروُں رئی
رات بھاری گئی ساری بھَور اب تو بھئی
چڑی پنچھی ہیں بُلاوت کھیل اُن سے سہی

مطلب- اے پیارے بھارت ورش (موہن کرشن کالا ہند) اب جاگو اودیا (جہل)
کی نیند بہت سوئے- مَیں صدقے بلہار! اب اُٹھو ہُشیار ہو- سنسار روپی گائے کا
ماکھن کھالو- اپنے اندر داخل کرلو- یہ شکتی بھرا (تقویت بخش) سفید سفید میٹھا میٹھا
ماکھن چکھ لو- بڑا زور آجائے گا- طاقت بھر جائے گی- گوبردھن (سنسار کی مشکلات)
اُٹھانا بائیں ہاتھ کا کرتب نہیں اُنگلی کا کھیل ہو جائے گا- وہ دیکھو! تھّا کرشن کالا
(ہند کالا) جاگ پڑا- اُوں- اُوں- اُوں- نہیں- نہیں- اوم- اوم- اوم-
اے موہن (بھارت) یہ پنچھی گا گا کر تجھے جگایا چاہتے ہیں- کل کی طرح
اب بھی تیرے ہاتھوں دانہ چاول تِل وغیرہ کھائیں گے- اَے محبت بھرے
بال گوپال! تیرے ساتھ کھیلنے کو یہ جانور جمع ہو رہے ہیں- تیری دِل لگی کے
سب سامان تیار ہیں- اُٹھ کھڑا ہو- چڑیاں چُوں چُوں کر رہی ہیں- کوّے کائیں
کائیں کرتے ہیں- مور پیوں پیوں کوک رہے ہیں- کوئی کسی بیرونی ہُنر کے پیچھے
پڑا ہے کوئی کسی جسمانی سُکھ میں اڑا ہے- کوئی کسی ظاہری سائنس میں اُلجھا ہے-
یہ سب حواس تک پہنچنے والی راگنیاں ہیں- ہے بھگون بھارت! یہ سب صرف
تیرے پیار کرنے کے سامان ہیں- نیند میں بھی عجب مزا تھا- پر اب تو خُوب سوئے
تازہ ہو چُکے- مچلتے کیوں ہو- تُم بھی گاؤ-

یہ دیکھو تمہاری بانسری کون چُرا لے گیا؟ نہیں نہیں۔ تمہارے ہی پاس ہے۔

آہاہا! وہ بھارت نے سورج کی طرح روشن آنکھیں کھولیں۔ لب خنداں پر بانسری دھری۔ اور دل و جگر میں سما جانے والا رُوحانی نغمہ ہوا کے پروں پر سوار ہو چاروں طرف گونجنے لگا۔ کُل گوکُل (دُنیا) میں پھیلنے لگا۔ آسمان کی خبر لانے لگا۔ جَے! جَے! جَے! کیسے رہنمائے مذہب! کیسے محبِّ قوم!

؎ مذہبِ عشق از ہمہ مِلّت جُداست
عاشقاں را مذہب و مِلّت خُداست

اُن میں بھارت کی بہت سی خوبیوں کا نقشہ کھنچتا تھا۔ برہم گیانی کے سارے آثار اُن کی زندگی میں پُورے طور پر پائے جاتے تھے۔ گارگی۔ جنک شنکر۔ ویاس۔ گوڑپاد اور گوبند آچاریہ جیسے مہاتاؤں کے بعد آنے والے سوامی رام نے اپنی زندگی میں ان کے جیون کا پُورا فوٹو بھارت نواسیوں کے لئے کھینچ دیا تھا۔ پُورا فقیر۔ دانا اور مست۔ اپنی اندرونی باتوں کو صرف رمزوں میں جتلانے والا اور دوسروں کی مہما کو گانے والا۔ سوامی رام اپنا نمونہ آپ ہی تھے۔ منصور کی بلند آوازی اور لا دھڑک بیباکی۔ شمس تبریز کی مستی۔ اور مولانا روم کی دقیق خیالی رام بادشاہ کی ایک ہی مثال میں ایک جگہ نظر آتی تھی۔

؎ جب اُمڈا دریا اُلفت کا | ہر چار طرف آبادی ہے
ہر رات نئی اِک شادی ہے | ہر روز مُبارک بادی ہے
خوش خنداں ہے رنگیں گُل کا | خوش شادی شاد مُرادی ہے
بَن سورج آپ درخشاں ہے | خود جنگل ہے خود وادی ہے
نِت راحت ہے نت فرحت ہے نِت رنگ نئی آزادی ہے

ہر رگ ریشے میں ہر مُو میں | امرت بھر بھر بھرپور ہُوا
سب کُلفت دُوری دُور ہُوئی | من شادی مرگ سے چُور ہُوا
ہر برگ بدھائیاں دیتا ہے | ہر ذرّہ ذرّہ طُور ہُوا
جو ہے سو ہے اپنا مظہر | خواہ آبی ناری بادی ہے

رنت راحت ہے نت فرحت ہے نت رنگ نئی آزادی ہے

آخر یہ لو رام بادشاہ کو پیام یار کس زور سے آیا۔ بھارت روتا سارہ گیا۔ کتابیں کچھ نامکمل سی لکھی پڑی ہیں۔ وہ گیا۔ وہ گیا یار سے ایک ہُوا۔ رام تو کئی سال سے اپنے جسم اور اہنکار کی انانیت سے اُٹھکر معشوق کے ساتھ ذہنی اور دِلی طور پر ایک ہولیا تھا۔ پر جسم کبھی نہ کبھی تو اپنی مداخلت بیجا کیا ہی کرتا ہوگا۔ گھر چھوڑا باہر چھوڑا۔ آے لو اب سب کا سب سنّیاس بھی تیاگ دیا۔ آخری چیز دُنیا کی جو پاس پھڑک رہی تھی۔ وہ بھی کپڑے کی طرح اُتار کر پھینک دی۔ اب رام کی ساری عُمر کے خیالات پُورے ہوُے۔ جسمانیت کی بُو تک بھی نہ رہی۔

خُدائی۔ خدائی۔ خُدائی ہُوئی — جُدائی کا نام و نشاں نہ رہا

رام کے اس آخری تیاگ نے کئی آدمیوں کو رُلایا۔ جیسا کہ اُس کے سنّیاس نے اُس کے ننھے ننھے بچّوں اور اُس کی پیاری بیوی کے آنسو بہادئے تھے۔ عشقِ حقیقی کی بس یہی شرط ہے جس کو رام نے پُورا کر دکھایا۔ موت کے رُوپ میں رام کو اپنے دلدار۔ خُدا۔ آتما کا پیام آیا۔ "آؤ اب تمھاری اس ذرا سی جُدائی کو بھی میں گوارا نہیں کرسکتا۔ ننگے ہوجاؤ۔ کپڑے پھینکے۔ اب جسم بھی پھینکو"۔ رام کے جسم کو یہ فرمان قبول کرنا ہی تھا۔ عاشقِ صادق بھلا کب انکار کرتے ہیں۔ کئی سال پہلے رام بادشاہ یوُں کہہ چکے تھے

سختی سے کیوں چھینے ہے دِل۔ کیا یوُں نہیں انکار ہے

پھر فرمایا تھا

۵ بچھڑتی دُلہن وطن سے ہے جب ۔ کھڑے ہیں روم اور گلا رُکے ہے
کہ پھر نہ آنے کا ہے کوئی ڈھب ۔ کھڑے ہیں روم اور گلا رُکے ہے
یہ دین و دُنیا تمہیں مبارک ۔ ہمارا دُلہا ہمیں سلامت
یہ یاد رکھنا یہ آخری چھپ ۔ کھڑے ہیں روم اور گلا رُکے ہے

رام جیسے عاشقِ حقیقی کے سامنے کب تک وصلِ حق میں یہ دُنیا حائل ہوسکتی تھی ۔ جو زبانِ عمل سے ہردم پکارتا تھا ۔

تُو کو اتنا مِٹا کہ تُو نہ رہے
اور تجھ میں دُوئی کی بُو نہ رہے

۶
برائے نام بھی اپنا نہ کچھ باقی نشاں رکھنا | نہ تن رکھنا نہ دل رکھنا نہ جی رکھنا نہ جاں رکھنا
تعلق توڑ دینا چھوڑ دینا اُس کی پابندی | خبردار اپنی گردن پر نہ یہ بارِ گراں رکھنا
کسی گھر میں نہ گھر کر بیٹھنا اس دارِ فانی میں | ٹھکانا بے ٹھکانا اور مکاں بر لامکاں رکھنا

آخر آیا پیامِ یار! دیکھو رام کیسا کھیلتا جاتا ہے موت سے کچھ مسخری سی کرتا ہے ۔ یہ رام بادشاہ کے قلم سے نکلے ہوئے بس آخری الفاظ ہیں ۔ گنگا سے ہمکنار ہونے سے صرف چند منٹ پیشتر اُنہوں نے یہ الفاظ لکھے ۔

"اے موت! بیشک اُڑا دے اس ایک جسم کو ۔ میرے اور اجسام ہی کچھ مجھے کم نہیں ۔ صرف چاند کی کرنیں ۔ چاندی کی تاریں پہن کر چین سے کاٹ سکتا ہوں ۔ پہاڑی ندی نالوں کے بھیس میں گیت گاتا پھروں گا ۔ بحرِ امواج کے لباس میں لہراتا پھروں گا ۔ میں ہی بادِ خوش خرام نسیم مستانہ گام ہوں ۔ میری یہ صورتِ سیلانی ہر وقت روانی میں رہتی ہے ۔ اس رُوپ

میں پہاڑوں سے اُترا۔ مُرجھاتے پودوں کو تازہ کیا۔ گلُوں کو ہنسایا۔ بُلبل کو رُلایا۔ دروازوں کو کھٹ کھٹایا۔ سوتوں کو جگایا۔ کسی کا آنسو پُونچھا کسی کا گھونگھٹ اُڑایا۔ اِس کو چھیڑ اُس کو چھیڑ۔ تجھ کو چھیڑ وہ گیا! وہ گیا نہ کچھ ساتھ رکھا۔ نہ کسی کے ہاتھ آیا"

یہ الفاظ لکھکر رام دیوالی کے روز ٹھیک دوپہر کو بھلنگ گنگا میں جو بھاگیرتھی سے مقام ٹہری میں ملتی ہے اشنان کرنے جاتے ہیں حسب معمول کپڑے اُتار۔ ورزش کر گنگا میں غوطہ لگایا۔ اور کندھے کندھے گہرے پانی میں داخل ہُوئے۔ اس جگہ رام کا معمول تھا کہ روزمرہ گنگا کے شانت جل میں نہاتے تھے۔ اُس روز تھوڑا سا اوپر کو اپنی موج میں گنگا کی چکراتی ہُوئی لہروں میں گئے۔ اور غوطہ لگایا۔ اور بھنور میں لہروں سے کھیلتے رہے۔ اُس کے بعد کوئی پانچ منٹ تک پانی کی سطح کے اندر اشنان کرتے رہے۔ اور جب دوبارہ اُٹھے تو اوم اوم کی آواز اُس لڑکے کو جو رام کا رسوئیا تھا سُنائی دی۔ اور جھٹ اُس کے بعد رام کا جسم گنگا کی لہروں کے اوپر سوار ٹھیک بستر کے اوپر سوتے ہُوئے جسم کی مانند بہتا ہُوا اُسی ایک لڑکے نے دیکھا۔ تارک الدُنیا تو تھے ہی۔ اب تارک الجسم ہوکر اپنی اس غزل کے منشا کو پراپت ہُوئے

غزل

اپنے مزے کی خاطر گُل چھوڑ ہی دئے جب
رُوئے زمیں کے گلشن میرے ہی بن گئے سب
جتنے زباں کے رس تھے کُل ترک کر دئے جب
بس ذایقے جہاں کے میرے ہی بن گئے سب
خود کے لئے جو مجھ سے دیدوں کی دید چھُوٹی
خود حُسن کے تماشے میرے ہی بن گئے سب

اپنے لئے جو چھوڑی خواہش ہوا خوری کی
بادِ صبا کے جھونکے میرے ہی بن گئے سب
بج کی غرض سے چھوڑا سُننے کی آرزو کو
اب راگ اور باجے میرے ہی بن گئے سب
جب بہتری کے اپنی فِکر و خیال چھُوٹے
فِکر و خیالِ رنگیں میرے ہی بن گئے سب
آہا عجب تماشا! میرا نہیں ہے کچھُ بھی
دعوےٰ نہیں ذرا بھی۔ اس جسم و اسم پر بھی
یہ دست و پا ہیں سب کے آنکھیں یہ ہیں تو سب کی
دُنیا کے جسم لیکن میرے ہی بن گئے سب

SWAMI RAMA IN LECTURER'S DRESS.

سوامی رام تیرتھ لیکچرار کے لباس میں
امریکہ ۱۹۰۳

تمہید

یہ مضمون شریان سوامی رام تیرتھ جی مہاراج سے رائے بہادر لالہ بیجناتھ صاحب ریٹائرڈ جج مرحوم کی شاشتروکت اُپاسنا کی تمہید میں بزبان ہندی لکھا گیا تھا جیسا کہ اُن کے ذیل کے خط سے واضح ہوتا ہے۔

اوم

رائے بہادر لالہ بیجناتھ صاحب کا پتر (خط) پربتوں (پہاڑوں) میں رام کو پہنچا کہ وہ وید۔ ویدانت پوران وغیرہ سے سنگرہ (اجتماع) کر کے ایک اُپاسنا پُستک تیار کر رہے ہیں۔ رائے بہادر کے جمع کئے ہوئے شُوکت۔ شرُتی۔ بھجن وغیرہ کے نہایت عُمدہ ہونے میں تو شک ہی نہیں۔

رام کو اُس پُستک کی پرستاونا (دیباچہ) لکھنے کی فرمایش آئی۔ اُسکے جواب میں وہ چھوٹے چھوٹے وِچار اور من سمجھاوے (خیال اور من کو سمجھانے کے اشارے) سیدھی سادی زبان میں لکھ دئے گئے ہیں۔ جنھوں نے راقم کے لئے اندر و باہر رام ہی رام دکھا دیا۔ سارا سنسار ترارے بھرتا ہُوا ہیرے کی طرح چمکتا دمکتا رام ساگر یعنی بحرِ الٰہی بن رہا ہے۔

ब्रह्मैवेदममृतं पुरस्ताद्ब्रह्म पश्चाद्ब्रह्म दक्षिणतश्चोत्तरेण।

(मुण्डक उप० २, २, ११)

(برہم ہی یہ امرت ہے۔ برہم ہی آگے۔ پیچھے۔ دائیں اور بائیں ہے)

اوم
رام تیرتھ

اوم

اُپاسنا

युयोध्यस्मज्जुहुराणमेनो । भूयिष्ठान्ते नम उक्तिं विधेम॥

(शु० यजु० सं० ५,३६)

(ہے دیو! آپ ہم لوگوں کے پاپ کو ہم سے علیحدہ کریں۔ ہم آپ کی بار بار حمد کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہیں)

اُڑیں ٹیڑھی بانکی یہ چالاکیاں سب
رہیں ڈھال تلوار اک آپ ہی اب

من کو دیو (ایشور) کے پاس بٹھانا اُپاسنا ہے۔ یا اُپاسنا اُس حالت کا نام ہے جہاں روم روم میں رام رچ جائے۔ من امرت میں بھیگ جائے۔ دِل آنند میں ڈوب جائے۔

اس کے تین درجہ ہیں جیسے

(۱) پتھر کی شِلا (سِل) کا گنگا میں شیتل (سرد) ہو جانا
(۲) کپڑے کی گُڑیا کا اندر باہر پانی میں نچڑنے لگ جانا اور
(۳) مصری کی ڈلی کا گنگا رُوپ ہو جانا۔

کبھی کبھی بھجن (مناجات)۔ دھیان (مراقبہ)۔ آرادھنا (حمد) اور انوسندھان (غور و خوض) وغیرہ بھی اسی کو کہتے ہیں۔ سیدھی سادی بول چال میں ایشور کو یاد (سمرن) کرنا اُپاسنا ہے۔ خبردار بھُولنے نہ پائے۔

पश्यञ्शृण्वन्स्पृशञ्जिघ्रन्नश्नन्गच्छन्स्वपञ्श्वसन् ।

प्रलपन्विसृजन्गृह्णन्नुन्मिषन्निमिषन्नपि ॥

(गीता ५, ८, ९)

(دیکھتے۔ سُنتے۔ چھُوتے۔ سُونگھتے۔ کھاتے۔ پیتے۔ چلتے پھرتے۔ سوتے جاگتے
سانس لیتے۔ بولتے۔ چھوڑتے پکڑتے۔ آنکھ کھولتے اور میچتے ہُوئے بھی)

اَٹل نیم (قانُون بے بدل)

ناظرین! بہت باتوں سے کیا فائدہ؟ ایک ہی لکھتے ہیں۔ عمل میں لاکر آزمالو۔ ٹھیک نہ ہو تو راقم کے ہاتھ قلم کر دینا اور زبان نکال ڈالنا۔ ذرا کان کھول کر سُن لو اور دِل کی آنکھ کھول کر پڑھ لو۔

پیارے! چاہ (کنوئیں) میں کُود کر نیچے نہ گرنا تو شاید کبھی ہو بھی سکے مگر دُنیا کی کسی شئے کی چاہ (خواہش) میں پڑکر دُکھ درد سے بچ جانا کبھی نہیں ہوسکتا۔ آفتاب طلوع ہو اور روشنی نہ پھیلے یہ تو شاید کبھی ہو بھی جائے۔ مگر چت میں پوِتر بھاؤ (نیک خیالات و جذبات) اور برہم آنند (سُرورِ ذات) ہونے پر بھی طاقت۔ دولت وغیرہ گویا ہمارِی پانی بھرنے والی لونڈی نہ ہوجاویں کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔ مینار پر چڑھکر نقّارہ کی چوٹ سے پُکار دو۔

सत्यमेव जयते नानृतम्   (मुण्डक उप० ३, १, ६)

(ستیہ (حق) ہی جیتا ہے۔ جھُوٹ (غیرِ حق) نہیں)

सत्यं ज्ञानमनन्तं ब्रह्म ॥ (तैत्ति० उप० २, १, १)

سچّدانند (ہستی و علم و سُرور) برہم (حق) ہے

وہ ستیہ (حق) کیا ہے۔

ॐ

اُپاسنا

युयोध्यस्मज्जुहुराणमेनो । भूयिष्ठान्ते नम उक्तिं विधेम॥

(शु० यजु० सं० ५, ३६)

(ہے دیو! آپ ہم لوگوں کے پاپ کو ہم سے علیحدہ کریں۔ ہم آپ کی بار بار حمد کرتے ہُوئے سجدہ کرتے ہیں)

اُڑیں ٹیڑھی بانکی یہ چالاکیاں سب
رہیں ڈھال تلوار اِک آپ ہی اب

من کو دیو (ایشور) کے پاس بٹھانا اُپاسنا ہے۔ یا اُپاسنا اُس حالت کا نام ہے جہاں روم روم میں رام رچ جائے۔ من امرت میں بھیگ جائے۔ دِل آنند میں ڈُوب جائے۔

اس کے تین درجہ ہیں جیسے

(۱) پتھر کی شِلا (سِل) کا گنگا میں شیتل (سرد) ہوجانا
(۲) کپڑے کی گُڑیا کا اندر باہر پانی میں نُچڑنے لگ جانا اور
(۳) مصری کی ڈلی کا گنگا رُوپ ہوجانا۔

کبھی کبھی بھجن (مناجات)، دھیان (مراقبہ)۔ آرادھنا (حمد) اور انوسندھان (غور و خوض) وغیرہ بھی اسی کو کہتے ہیں۔ سیدھی سادی بول چال میں ایشور کو یاد (سمرن) کرنا اُپاسنا ہے۔ خبردار بھُولنے نہ پائے۔

प्रलपन्विसृजन्गृह्णन्नुन्मिषन्निमिषन्नपि ॥

(गीता ५, ८, ९)

(دیکھتے۔ سُنتے۔ چھوتے۔ سونگھتے۔ کھاتے۔ پیتے۔ چلتے پھرتے۔ سوتے جاگتے سانس لیتے۔ بولتے۔ چھوڑتے پکڑتے۔ آنکھ کھولتے اور میچتے ہوئے بھی)

اٹل نیم (قانون بے بدل)

ناظرین! بہت باتوں سے کیا فائدہ؟ ایک ہی لکھتے ہیں۔ عمل میں لاکر آزمالو۔ ٹھیک نہ ہو تو راقم کے ہاتھ قلم کردینا اور زبان نکال ڈالنا۔ ذرا کان کھول کر سُن لو اور دِل کی آنکھ کھول کر پڑھ لو۔

پیارے! چاہ (کنوئیں) میں کُود کر نیچے نہ گِرنا تو شاید کبھی ہو بھی سکے مگر دُنیا کی کسی شئے کی چاہ (خواہش) میں پڑ کر دُکھ درد سے بچ جانا کبھی نہیں ہوسکتا۔ آفتاب طلوع ہو اور روشنی نہ پھیلے یہ تو شاید کبھی ہو بھی جائے۔ مگر چِت میں پوِتر بھاؤ (نیک خیالات و جذبات) اور برہم آنند (سُرورِ ذات) ہونے پر بھی طاقت۔ دولت وغیرہ گویا ہماری پانی بھرنے والی لونڈی نہ ہوجاویں کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔ مِنار پر چڑھکر نقّارہ کی چوٹ سے پُکار دو۔

सत्यमेव जयते नानृतम्　(मुण्डक उप० ३, १, ६)

(ستیہ (حق) ہی جیتا ہے۔ جھُوٹ (غیرِ حق) نہیں)

सत्यं ज्ञानमनन्तं ब्रह्म ॥ (तैत्ति० उप० २, १, १)

ستچّدانند (ہستی و علم و سُرور) برہم (حق) ہے

وہ ستیہ (حق) کیا ہے۔

तमेवैकं जानथ आत्मानमन्या वाचो विमुञ्चथ ॥

(मुण्डक उप० २, २, ५)

(اُسی ایک آتما (ذات) کو جانو اور باقی کُل باتیں چھوڑ دو)

بس ایک آتم گیان ہے	امرت رس کی کھان
اور بات بک بک بچن	جھک جھک مرنا جان

नान्यः पन्था विद्यते ऽयनाय ॥

(श्वेत उप० ३, ८)

(اس کے سوا راہِ نجات اور کوئی نہیں ہے)

ज्ञात्वा तं मृत्यु मत्येति नान्यः पन्था विमुक्तये ॥

(कैवल्य उप० ६)

(اُس حق یا ذات کو جان کر موت کو ترجاتا ہے۔ سوائے اس کے نجات کا کوئی دوسرا راستہ نہیں)

मृत्योः स मृत्यु माप्नोति य इह नानेव पश्यति ॥

(कठ उप० ४, ११)

(جو یہاں غیریّت دیکھتا ہے وہ موت سے موت کو جاتا یعنی بار بار جنما مرتا ہے)

असन्नेव स भवति। असद ब्रह्मेति वेद चेत ।

अस्ति ब्रह्मेति चेद्वेद। सन्तमेनं ततो विदुरिति॥

(तैत्ति० उप० २, ६, १)

(است (غیرِ حق) کو جو برہم (حق) مانتا ہے وہ خود است (غیرِ حق) ہو جاتا ہے اور ست (حق) کو جو حق یا ہستِ مطلق جانتا ہے اس کو لوگ سنت کہتے ہیں)

؎ کبھی نہ چھوٹے پیڑ دکھ سے جب برہم کا گیان نہیں
؎ جے نر رام نام بِنا ہیں۔ سو نر کھر کُوکر سُوکر سم۔ برتھا جئے جگ ماہیں۔
(تُلسی داس)

سُور سُجان سپُوت سُولکشن۔ گنین گن گروائی۔
بِن ہری بھجن اندرا بن کے پھل۔ تجت نہیں کروائی

سو سنگت جل جائے کتھا نہیں رام کی
بِن کھیتی کے باڑ بھلا کس کام کی
جو نَین کہ بے نیر ہیں بے نُور بھلے ہیں

لکشیہ (مُدعا یا منزلِ مقصود)

आत्मानं रथिनं विद्धि शरीरं रथ मेवतु।
बुद्धिं तु सारथिं विद्धि मनः प्रग्रहमेवच॥
(कठ उप० १, ३, ३)

(آتما یعنی ذات کو رتھ کا مالک، جان اور شریر یعنی جسم کو رتھ۔ لیکن بُدھی یعنی عقل کو رتھوان اور من کو لگام سمجھ)

جسم کی بگھی میں جیو آتما نے بیٹھ کر کوچوان عقل کے ذریعہ عنانِ دل سے حواس کے گھوڑوں کو ہانکتے ہانکتے آخر جانا کہاں ہے؟

"विष्णोः परमं पदम्" (درگاہِ باری تعالیٰ کو)

؎ ہے خود شناسی چشمۂ آبِ حیات کا	ہاں اُسکو جان کے ملے رستہ نجات کا
جس کو نہ نامِ حق سے محبت ہو وہ بشر	ہے گدھے کتے اور سُوئر کی صفات کا
بے یادِ حق کے کون بہادر ہو اور گُنی۔	حنظل کے پھل میں ذائقہ کب ہے نبات کا
جس جا نہ ذکرِ حق ہو وہ صحبت جلے تو خوب	باڑا بغیر کھیتی کے کس کام و بات کا
نینوں میں نیر گر نہ ہو بے نُور ہیں بھلے	بے نیر نَین کو ہو کب علم ذات کا

لکشیہ (مُدعا) یا منزلِ مقصود تو برہم تتو (حقِ تعالیٰ) ہے۔ برہم ساکشاتکار (انکشافِ ذات) کئے بغیر نجات نہیں۔ اناتم درشٹی دُکھ رُوپ ہے یعنی نگاہِ ماسوائے حق رنج و الم ہے۔ خوشی خوشی شوق کے ساتھ چت میں سینہہ (موہ یعنی دُنیوی اُلفت و محبت) وغیرہ رکھتے ہو۔ بھائی جان! کالے ناگ کو گود میں (مارِ آستین کو) دُودھ پلا پلا کر مت پالو۔

ست رُوپ ایک پرماتما (وحدہٗ لاشریک) کے سوائے کوئی اور خیال دل میں رکھتے ہو؟ بندوق کی گولی کلیجے میں کیوں نہیں مار لیتے؟۔ مارگ (راہ) میں کہاں تک ڈیرے ڈالو گے؟۔ راستہ میں کہاں تک مٹھائیاں کھاؤ گے؟ یہاں اس سرائے دُنیا میں ماں تو نہیں بیٹھی ہوئی؟ آرام اگر چاہتے ہو تو چلو رام کے دھام (مقام) میں۔

اُپاسنا کی ضرورت

यस्त्व विज्ञानवान्भवत्ययुक्तेन मनसा सदा।
तस्येन्द्रियाण्यवश्यानि दुष्टाश्वा इव सारथेः॥
(कठ उप० १, ३, ५)

(جو بگیان وان یعنی عالِم باعمل نہیں ہوتا اور جس کا من ہمیشہ اُیکت یعنی مضطرب رہتا ہے۔ اُس کی اِندریاں نالائق کوچوان کے بے قابو گھوڑوں کے مانند ہوتی ہیں)

عالِم بے عمل و مُضطرب دِل والے کے حواس بے قابو بگڑے گھوڑوں کی طرح منزل تک پہنچانا تو درکنار۔ رتھ کو اور رتھ کے سوار کو کنووں اور گڈھوں میں جا گراتے ہیں۔ جہاں رونا اور دانت پیسنا ہوتا ہے۔ اگر اسی زندگی کے سخت جہنم سے بچنا مطلوب ہو تو گھوڑوں کو

سِدھانے اور سیدھی راہ پر چلانے کے یم اور نیم (روک تھام) کی ضرورت ہے۔ مگر لاکھ تدبیریں کر دیکھو۔ جب تک تمہارا کوچوان (رتھوان) دُھندھلی آنکھوں والا کانا سا ہے تب تک کیچڑ میں ڈُوبو گے۔ ریت میں دھسو گے۔ گڈھوں میں گرو گے۔ چوٹیں کھاؤ گے۔ چلّاؤ گے۔ بابا! دُنیوی عقل کو کوچوان بنانا دُکھ ہی دُکھ پانا ہے۔ اب بات سُنو فتح اسی میں ہے کہ اپنے دِل کی باگ ڈوری دیدو۔ دیدو اُس کرشن کے ہاتھ۔ بس پھر کوئی خطرہ نہیں۔ وہ اس سنسار رُوپی کورو کھشیتر (میدانِ جنگِ دُنیا) سے فتح کے ساتھ ہی نکلے گا۔ رتھ ہانکنے میں تو وہ مشہور اُستاد ہے۔ ضرورت ہے ہری (بھگوان) کو رتھ گھوڑے اور لگام سُپرد کر کے پاس بٹھانے کی یعنی اُپاسنا کی۔

सर्वधर्मान्परित्यज्य मामेकं शरणं व्रज ।
अहं त्वां सर्व पापेभ्यो मोक्षयिष्यामि मा शुचः ॥

(गीता १८, ६६)

(سب دھرموں یعنی تمام فرائض کو چھوڑ کر مجھ ایک ہی کی پناہ لے میں تجھے سب پاپوں سے چھڑا لوں گا۔ لہذا فکر مت کر)

संगात्संजायते कामः कामात्क्रोधो ऽभिजायते

(गीता २, ६२)

لذّاتِ دُنیا سے خواہشِ نفسانی پیدا ہوتی ہے۔ خواہش سے کرودھ یعنی غصّہ پیدا ہو جاتا ہے۔

مطلب: خواہشاتِ جسمانی اور لذّاتِ نفسانی سے عوام الناس کی وہ حالت ہوتی ہے۔ جیسے پانی میں پڑی ہوئی تونبی کی آندھی اور طوفان سے

اگر ایسی حرکت بیہودہ کا باعث صحبتِ بد تو ہروقت بنی رہے اور اس مرض کے دُور کرنے کی دَوا (اُپاسنا) آتم انوسندھان (یعنی غور و خوض ذات) کبھی نہ کی جاوے تو ایسی آتم ہتّیا (خودکُشی) کے عِوض ضرور

असुर्या नाम ते लोका अन्धेन तमसा वृताः।

(ईश० उप० ३)

(گھور اندھکار سے ڈھکے ہُوئے عالمِ تاریکی)

بھاری دوزخ میں سخت تکلیفیں سہنا پڑیں گی۔

اگر کانٹوں پر پڑجانے سے پرمیشور یاد آتا ہو تو پیارے! جب دیکھو کہ سنسار کے کام دھندوں میں اُلجھ کر رام بُھولنے لگا ہے جھٹ پٹ اپنے تئیں نُکیلے کانٹوں پر گرادو۔ اور کچھ نہیں تو درد کے بہانہ یاد آ ہی جائے گا۔ پردہ میں رونا۔ دِل کو پیٹنا۔ چُھپ کر ڈاڑھیں مارنا بھی ضرور فائدہ کرے گا۔

اُپاسنا کی دو قسمیں

اُپاسنا دو قسم کی مشہور ہے۔ پرتیک اور اہنگرہ۔ پرتیک اُپاسنا میں باہر کے پدارتھوں (اشیائے بیرونی) میں پدارتھ درشٹی (نگاہِ شے) اُٹھاکر برہم (ذاتِ مطلق) کو دیکھنا ہوتا ہے۔

اہنگرہ اُپاسنا میں اپنے اندر جو مادمنی فرض کر رکھی ہے اُس سے پلّہ چُھڑا کر (قطعِ تعلّق ہوکر) برہم ہی برہم دیکھنا ہوتا ہے۔ اگر باہر کی پرتیک (شئے بیرونی) کو ہیچ جان کر اُس میں ایشور فرض کیا جاوے تو وہ ایشور اُپاسنا یعنی حق پرستی نہیں بلکہ نِمر پُوجا یعنی

بُت پرستی ہے۔ اسی پر ویاس جی کے برہم میمانسا درشن کے ادھیای ۴۔ پاد۔۱۔ سُوتر ۵۔ میں یوں حُکم ہے

ब्रह्मदृष्टिरुत्कर्षात् ॥ (ब्रह्मसूत्र)

یعنی باہری چیزوں (پرتیک) میں برہم درشٹی (نظرِ حقّانی) ہو۔ برہم میں پرتیک بھاونا (خیالِ ماسوائے حق) مت کرو۔ اور اہنگرہ اُپاسنا کے بارہ میں یوں لکھا ہے۔

आत्मेति तूपगच्छन्ति ग्राहयन्ति च ॥

(ब्रह्ममीमांसा ४, १, ३)

یعنی برہم کو اپنا آتما (اپنا آپ) بارمبار خیال کرو۔ وید کا یہی مت (عقیدہ) ہے اور یہی اُپدیش (حکم) ہے۔ اِن دونوں قسم کی اُپاسنائوں میں مقصد اور مدّعا ایک ہی ہے۔ وہ کیا؟

सर्वं खल्विदं ब्रह्म तज्जलानिति शान्त उपासीत ॥

(छान्दोग्य० ३, १४, १)

(یعنی شانت ہوکر اس ظاہری دُنیا پر یہ خیال جمانا چاہئے کہ یہ سب برہم ہے۔ کیونکہ یہ دُنیا اُسی برہم سے پیدا ہوکر اُسی سے نشونما پاتی ہُوئی اُسی میں حذف ہوجاتی ہے)

अथ खलु क्रतुमयः पुरुषः ॥

(छान्दोग्य० ३, १४, १)

یعنی یہ پُرش (انسان) اپنی خواہشوں و عقیدوں کا پُتلا ہے

؎ ہرچہ بینی بدانکہ مظہرِ اوست	کہ زچشمانِ دل مبیں جز دوست
ٹھنڈھی چھاتی سے دیکھ برہم ہمہ اوست	اندر باہر ہو مغز ہو خواہ پوست

جیسا بھی انسان کا خیال و فکر رہتا ہے ویسا ہی وہ ضرور ہوجاتا ہے۔جب ایسا حال ہے تو برہم چِنتن (فکرِ حق) ہی کیوں نہ مضبوط کیا جاوے یعنی اپنے آپ کو برہم رُوپ ہی کیوں نہ دیکھتے رہیں؟ اسی پر شُرتی کا قول ہے کہ

स यो ह वै तत् परमं ब्रह्मवेद ब्रह्मैव भवति ॥

(मुंडक उप० ३, २)

(جواس پر برہم کو جانتا ہے وُہ برہم ہی ہوجاتا ہے)

اہنگرہ اور پرتیک اُپاسنا دونوں میں نام رُوپ سنسار (بُت) کو ڈھانا لازمی ہوتا ہے۔بنانا نہیں۔جل (پانی) برہم ہے۔ستھل (زمین) برہم ہے۔ پَون (ہَوا) برہم ہے۔ آکاش برہم ہے۔ گنگا برہم ہے۔ وغیرہ وغیرہ پرتیک اُپاسنا کے روپ درشک واکیوں (صُورت نُما الفاظ) میں پانی زمین۔ ہَوا وغیرہ کے ساتھ برہم کو کہیں جوڑنا نہیں ہے۔ جیسے "یہ سانپ کالا ہے"۔اس میں سانپ بھی ہے اور کالا بھی۔ بلکہ یہاں تو بادھ سمانا دھیکرن (مسئلہ نفی اثبات) ہے۔جیسے کسی مغالطہ کھائے ہُوئے کو کہیں "یہ سانپ رسّی ہے"۔یہاں رسّی کالے رنگ کی طرح سانپ کے ساتھ برابر حقیقت رکھنے والی نہیں ہے۔بلکہ رسّی ہی ہے سانپ ہے نہیں۔ اسی طرح سچّی اُپاسنا وُہ ہے کہ دھارا رُوپ جل نظر میں نہ رہے۔برہم (ذاتِ مُطلق) دِل میں سما جاوے۔ اور چلتی ہَوا نگاہ سے اُڑ جاوے۔ برہم ستّا ماتر ہی بھان ہو یعنی ذاتِ مُطلق حقیقتِ محض محسوس ہو۔پرتما سے پرتما پن یعنی بُت سے خیالِ بُت اُڑ جاوے۔چیتن سو رُوپ بھگوان کی جھانکی ہو (حق الیقین کا مشاہدہ ہو)۔

جیسے کسی پریم کے متوالے گھائل نے پیارے کا پریم پتر (محبت نامہ) پڑھا۔ اُس کی نگاہ تو پیارے کے سوُروپ (اصلی صُورت) سے بھر گئی۔ اب پتر کس کو دیکھو پڑے۔ (گوپیاں اُودھوؔ سے کہتی ہیں۔ یہ پاتی (خط) اب کہاں رکھیں۔ چھاتی سے لگاتی ہیں تو جل جائے گی آنکھوں پہ دھرتی ہیں تو گل جائے گی)۔

اُپاسنا میں مگن (مستغرق) کے لئے اِندریہ گیان (علمِ حواس) تو ایک چھیڑ جیسی رہ جائے گی۔ پیارے نے چُٹکی بھری۔ چُٹکی بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ پیارا ہی در اصل شے ہے۔ اسی طرح سب اِندریوں کا گیان (علم) ایک ہی ایک پیارے کی چھیڑ چھاڑ رُوپ معلوم دے گی۔

آئی پَون جب ٹُھک ٹُھک۔ لائی بُلاوا شیام کا

بھائی! اُپاسنا تو اسی کا نام ہے جبیں زُبان کو تو کیوں ہِلنا ہے جسم کی اُستخواں و رگ تک کے ذرہ ذرہ ہِل جائیں۔ یہ نہیں تو آنکھ مُوندو۔ کان مُوندو۔ مُنہ مُوندو۔ گاؤ چاہے چلاؤ۔ تمہاری اُپاسنا بس ایک تصویرِ محض ہے جس میں جان نہیں۔ نہایت خُوبصورت تصویر سہی۔ رَوِی وَرما کی مان لو۔ پر خالی تصویر سے کیا ہے؟

اشیاء میں اسی برہم درِشٹی (حق بینی) کو مضبوط کرنا اور خیالِ محسوسات کا مٹانا جو اُپاسنا ہے وہ کچھ تصوّر کی قوّت بڑھانا اور برتنا نہ جان لینا۔ جیسے شطرنج میں کاٹھ کے مُہروں کو پادشاہ۔ وزیر۔ فیل۔ اسپ پیادہ مان لینا ہوتا ہے۔ پانی برہم ہے۔ آکاش برہم ہے۔ پران برہم ہے۔ اگنی برہم ہے۔ من برہم ہے وغیرہ وغیرہ اُپاسنا کے روپ تو اَوستُو (غیرِ حق) کو مٹاکر وستُو (حق) کا خیال جانا ہے۔ اگر یہ خالی

مان لینا اور تصوّر محض ہی ہو تو یہ ایسا تصوّر ہے جیسا بچّہ اُستاد کے کہنے سے ضرب دینے اور تقسیم کرنے کے قاعدوں کو مان لیتا ہے۔ ضرب دینے اور تقسیم کرنے کا یہ قاعدہ "کیوں ایسا ہے اور کیوں ویسا نہیں؟ اس طریقہ سے جواب ٹھیک آنے کا سبب کیا ہے؟" یہ باتیں تو بعد میں سمجھ میں آئیں گی جب جبر مقابلہ (الجبرا) وہ پڑھے گا۔ مگر اُستاد کے اُس قاعدہ (طریقہ) پر یقین کرنے سے مثالیں سب ابھی ٹھیک نکلنے لگ پڑیں گی۔ پر خبردار! اُستاد کے بتائے ہوئے طریقہ کو ہی اور کا اور سمجھ کر مت یاد کرو۔

پرتما (بُت) کیا ہے؟ جس سے مان (پیمانہ) نکالا جائے۔ ناپا جائے۔ وزن کیا جائے۔ تولا جائے۔ (unit of measurement)۔ جب تولنے کا بٹّہ چھوٹا ہو تو تول کا مان بڑا ہوتا ہے۔ جیسے تولنے کا بٹّہ ایک پاؤ ہونے پر اگر کسی چیز کا مان چار ہو تو بٹّہ ایک چھٹانک ہونے پر مان سولہ ہوگا۔ اب ہندو دھرم کے یہاں پرتیک (प्रतीक) اور پرتما (प्रतिमा) کیا تھے؟ ایشور کو تولنے کا بٹّہ۔ ہندو دھرم میں نہایت اعلیٰ سُورج چاند روپی پرتیک بھی ہیں۔ اس سے اُتر کر پرتیک گُورو اور براہمن (مُرشد اور عالِم) ہیں۔ گئو گرُڑ رُوپ بھی۔ پیپل اور تلسی رُوپ بھی۔ کیلاش اور گنگا رُوپ بھی۔ اور ٹھنکنے سے گول مول کالے پتّھر کو بھی پرتما (پرتیک) رُوپ استھاپت (قائم) کر دیا ہے۔ یہ چھوٹے سے چھوٹا پرتیک کیا پرمیشور کو حقیر بنانے کے لئے تھا؟ نہیں جی۔ پرتیک کا چھوٹا کرنا اس لئے تھا کہ ایشور بھاؤ اور برہم درِشٹی کا سمندر (بحرِ عشقِ ربّانی اور نگاہِ حقّانی) بہہ نکلے۔ جب اُس ننھے پتّھر کو بھی

برہم دکھا تو باقی سب چیزیں اور سارا جگت ضرور برہم رُوپ معلوم ہونے چاہئیں۔ مگر جس نے مُورتی پُوجا اس سمجھ سے کی کہ یہ ذرا سا پتھر ہی برہم ہے۔ وہ ہو گیا پتھر کا کیڑا۔

پرا پُوجا (پرستش اُولے)

شئے کی شکل و صورت و نام وغیرہ سے اُٹھکر اُس کے آنند اور ستا (سُرور و حقیقت) کے رُخ میں خیال جانا۔ پد یا شبد (لفظ) سے اُٹھکر اُس کے ارتھ (معنی) میں لگنے کی طرح جسمانی آنکھ سے دیکھی جانے والی صُورت کو بھُول کر برہم (ذاتِ مُطلق) میں مستغرق ہوجانا رُوپی جو اُپاسنا ہے کیا یہ کسی نہ کسی مقررہ پرتیک کے ذریعہ ہی کرنا چاہئے؟ پرتیک تو بچّہ کی تختی کی طرح ہے۔ اُس پر جب لکھنے کا ہاتھ پُختہ ہوگیا۔ تو چاہے جہاں لکھ سکے۔ برہم درشن (دیدارِ حق) کا طریقہ جب آگیا تو جہاں نظر پڑی برہانند (سُرورِ حق) لُوٹنے لگے۔ پرتیک اُپاسنا تب سپھل (بار آور) ہوتی ہے۔ جب وہ ہمیں سب جگہ برہم (حق) دیکھنے کے قابل بنادے۔ سارا سنسار مندر بن جائے۔ ہر شئے رام کی جھانکی کرائے اور ہر فعل پرستش ہوجائے۔

جیتا چلوُں تیتی پرد کِشنا جو کچھ کرُوں سو پُوجا
گرِہ اُدیان ایک سم جانو بھاؤ مٹائیو دُوجا

سچّی اور جیتی اُپاسنا (پُوجا) جن کے اندر عالمِ شباب کو پہنچی ہے اُن کی حالت شرتی (تیتری شاکھا) یُوں بیان کرتی ہے۔

यावद् भ्रियते सा दीक्षा, यदश्नाति तद्धवि :,

यत्पिबति तदस्य सोमपानं, यद्रमते तदुपसदो, यत्संच
रत्युप विशत्युत्तिष्ठते च प्रवर्ग्यो, यन्मुखं तदाहवनीयो,
याव्याहृतिराहुतिर्यदस्य विज्ञानं तज्जुहोति ॥

(महानारायणोपनिषद, खंड २५)

(جو اس طرح دھیرج یعنی تحمل و استقلال اختیار کرتا ہے۔ وُہی دِکھشا ہے۔جو وہ بھوجن کرتا ہے وُہی اس کی ہَوَن یعنی قُربانی ہے۔جو وہ پیتا ہے وُہی اُس کا سوم پان ہے۔ رمن کرنا اُس کا اُپسد ہے۔جو اُس کا چلنا۔بیٹھنا اور کھڑا ہونا ہے وہی اُس کا پرورگیہ ہے۔جو اُس کا مُنہ ہے وہ ہَوَن کے قابل اگنی کُنڈ ہے۔ جو ویا ہرتی ہے وُہی اُس کی آہُوتی ہے۔جو اس کا گیان (علیٰ علم) ہے وُہی اُس کا ہوَن کرنا ہے)

مُکتی۔شانتی اور سُکھ چاہو تو بھید بھاؤ یعنی غیر بینی کا مٹانا اور برہم درشٹی یعنی حق بینی کا جانا ہی ایک ماتر سادھن (طریقہ محض) ہے۔ یہ نظر کیوں ضروری ہے؟کیونکہ در اصل یہ ہی بات ہے۔

"ब्रह्म सत्यं जगन्मिथ्या"

(برہم ہی ستیہ ہے یہ سب سنسار جھُوٹا ہے)

اگر گرمی بھاپ بجلی وغیرہ کے قانون کے مطابق ریل۔تار ٹیلیفون وغیرہ کلیں بناؤ گے تو چل نکلیں گی۔اور قانُون کو بھُلا کر لاکھ کوشش کرو۔اندھیری کوٹھری سے کہاں نکل سکتے ہو؟ اب دیکھو یہ رُوحانی قانُن (بھید بھاونا یعنی خیالِ یگانگت تو سائنس کے سارے اصُولوں کا اصُول ہے جو وید میں دیا ہے اس کو عمل میں لائے بغیر کیسے کامیابی ہو سکتی ہے

امریکہ کے مہاتما ایمرسن (Emerson) نے اپنے رنج کے روزانہ رُوحانی تجربوں کو بلا تعصّب دیکھ دیکھ کر کیا سچ کہا ہے۔ "کسی شئے کو دِل سے چاہتے رہنا اور دانت نکال کے عاجز گداگر کی طرح دُوسرے کی محبّت کا بھُوکے رہنا یہ پاک محبّت نہیں ہے۔ یہ تو نہایت ریچ موہ (ناپاک دُنیوی اُلفت) ہے۔" صرف جب تم مُجھے چھوڑ دو اور کھو دو اور اُس اعلیٰ حالت میں اُڑ جاؤ۔ جہاں نہ مَیں رہُوں نہ تُم۔ تب تو مُجھے کھنچکر تُمہارے پاس آنا پڑتا ہے اور تُم مُجھکو اپنے قدموں میں پاؤ گے۔ جب تُم اپنی آنکھیں کسی پر لگا دو اور محبّت کی خواہش کرو تو اُس کا جواب سوائے حقارت اور بے عزّتی کے کبھی اور کچھ نہیں ملا اور نہ ملے گا۔ یاد رکھو۔

بھائی! اس میں پنچھائی (فرقہ بندی) کے جھگڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ دُکھ روپی مُوت اگر منظور نہیں تو شانتی (اطمینان) کے ساتھ اپنے دِل کی حالت اور اُس کے ثمرۂ رنج و راحت پر تنہائی میں غور کرنا شروع کردو۔ سچ جھُوٹ آپ ہی نکل آئے گا۔ اگر تُم میں وِچار شکتی (قوّتِ ممیّزہ) دُرست ہے تو خود بخود یہ فیصلہ کروگے کہ دِل میں ترک اور سُرورِ حقّانی ہوتے ہی اقبال اور عرُوج اس طرح ہمارے پاس دوڑتے آتے ہیں جیسے بھُوکے بچے ماں کے پاس

यथेह क्षुधिता बाला मातारं पर्युपासते

(सामवेद)

جب ہمارے اندر سچے گُن (وصف) اور شانتی (سکُون) کا وِشنو ہوگا۔ تو لکشمی اپنے خاوند کی خدمت کو ہزاروں میں ہمارے دروازہ پر

اپنے آپ پڑی رہے گی۔ اکثر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ بھکتی اور دھرم کرتے کرتے بھی دُکھ اور افلاس اُنہیں ستاتے ہیں۔ اور ادھرمی لوگ ترقّی کرتے جاتے ہیں۔ یہ بیچارے بھولے بھالے کارج و کارن (علّت و معلول) کی تحقیقات کرنے میں طریقۂ نفی و اثبات عمل میں نہیں لاتے۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ دھرم کیا ہے اور بھکتی کیا۔ خود غرضی اور حسد (دیہ ابھمان یعنی انانیت) کو تو اُنہوں نے چھوڑا ہی نہیں۔ جس کا چھوڑنا ہی دھرم کو عمل میں لانا تھا۔ اب اُن کا یہ گِلہ کہ دھرم کو برتتے برتتے دُکھ میں ڈُوبے ہیں کیونکر ٹھیک اور سچ ہوسکتا ہے؟ اگر دھرم کو برتا ہوتا تو یہ شکایت جس میں خود غرضی اور حسد دونوں موجود ہیں کبھی نہ کرتے۔ وہ دان اور بھجن (خیرات اور مناجات) بھی دھرم میں شامل نہیں ہوسکتے جن سے اہنکار اور ابھمان (خودی اور تکبّر) بڑھ جائیں۔

جہاں پاپی پھلتا پھولتا پاتے ہو وہاں سُکھ بھوگ (خوشحالی) کا باعث ڈھونڈھو تو اُس شخص کا چِت آتماکار (محوِ ذات) اور یکسو رہا تھا جس کو تم نے دیکھا نہیں۔ اور اُس کے پاپ کرم یعنی افعالِ قبیحہ کا نتیجہ ڈھونڈھو تو سخت تکلیف نکلے گی جو ابھی تم نے دیکھی نہیں۔ اگر تم پر کسی نے بلا وجہ ظُلم کیا ہے تو خودی سے در گُذر اور تعصّب کو چھوڑ کر اپنے اگلے پچھلے حساب پر غور کرو۔ تم کو چابک صرف اس لئے لگا کہ تم نے کہیں نامناسب رجوگن (لذّاتِ دُنیوی) میں دِل دیدیا تھا۔ خود بجانب حق نہیں رہے تھے۔ قانونِ الٰہی توڑ بیٹھے تھے۔ من کے برہم آکار (محوِ ذات) میں نہ رہنے سے یہ سزا ملی۔ اب اُس ظالم دُشمن سے

جو بدلہ لینے اور لڑنے لگے ہو ذرا ہوش میں آؤ کہ اپنی پہلی بھُول کو اور بھی چوگُنا پچگُنا کرکے بڑھا رہے ہو۔ اور ہر فعل سے اُس مُجرمِ دُنیا کی اشیاء کو سچا بنا رہے ہو اور حق کو جھُوٹا۔

بچہ! یاد رکھو۔ اینٹھو تو سہی اُرد کے آٹے کی طرح۔ ٹکے نہ کھاؤ اور بار بار پٹکے نہ جاؤ تو کہنا۔ اکثر لوگ اوروں کے قصُور پر زور دیتے ہیں اور اپنے تئیں بے قصُور ٹھہراتے ہیں۔ ہاں ذاتِ مُطلق جو تُم ہو بالکل بے عیب ہی ہو۔ پر اپنے تئیں ذاتِ پاک ٹھانے بھی تو رہو۔ جُھگڑی اور دو کیوں کر بنیں؟ اپنے آپ کی جسم۔ دِل و عقل سے یکتائی کرنی اور بن کر دکھلانا بے گُناہ۔ یہی تو گُناہِ عظیم ہے باقی سب گُناہوں کی جڑ (اصل)

اب دیکھو جو رُدر یعنی رُلانے والا قانُون تُم کو ذاتِ مُطلق سے بے رُخ ہونے پر رُلائے بغیر کبھی نہیں چھوڑتا۔ وہ ایشور اُس اتیا چاری تمہارے بیری کی باری یعنی قادرِ مُطلق تمہارے اُس ظالم دشمن کے وقت کیا مرگیا ہے۔ کوئی اُس ترمبک کی آنکھوں میں دُھول نہیں ڈال سکتا یعنی کوئی باری تعالیٰ کی آنکھوں میں خاک نہیں جھونک سکتا۔ پس تُم کون ہو ایشور کے قانُون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے؟ تُم کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو۔ بدلہ لینے کا خیال وشواس شونیہ ناستک پن ہے یعنی کُفر بے اعتقادی ہے۔

اے پیارے میرے اپنا آپ کینہ پرور نادان! تُو اوروں کو جتنا چنے چبوانا چاہتا ہے اُتنا اپنے تئیں برہم دھیان (محوِ ذات) مراقبہ آلہی کی کھانڈ کھیر کھلا۔ دُشمن کی دُشمنی ایک دم اُڑ نہ جائے تو سہی۔

برہم ہے اور برہم کو بھول جانا ہی دُکھ روپ جھمیلا ہے۔ جو تمہارے اندر ہے یہی سب کے اندر ہے

यदे वेह तदमुत्र यदमुत्र तदन्विह॥

(कठ उप० २, ४, १०)

(جو یہاں ہے وُہی وہاں ہے۔ اور جو وہاں ہے وُہی پھر یہاں ہے)

جب تُم اندر والے سے بگڑتے ہو تو جگت (عالم) تُم سے بگڑتا ہے۔ جب تُم اندر کے انتریامی (مقلب القلوب) بن بیٹھے۔ تو جگت (دُنیا) کے پُتلی گھر میں فساد پھر کیسا۔ کسی کاٹھ کے ٹکڑے سے چوں بھی ہو سکتی ہے

यो मनसि तिष्ठन्मनसोऽन्तरो, यं मनो न वेद, यस्य मनः शरीरं, यो मनोऽन्तरो यमयति एष त आत्मा ऽन्तर्याम्यमृतः॥

(बृह० उ० ३, ७, २०)

(جو من میں بیٹھا من سے الگ ہے۔ جس کو من جانتا نہیں بلکہ من جس کا شریر ہے۔ وہ جو من کے اندر رہکر من کو باقاعدہ کام میں لگاتا ہے۔ یہ تیرا آتما انتریامی امرت ہے)

جب تُم دِل کے مکر چھوڑ کر سیدھے ہو جاؤ تو تمہارے ماضی مستقبل اور حال تینوں زمانہ اُسی دم سیدھے ہو جائیں گے۔ پیارے! جیسے کوئی موٹا تازہ انسان بگّی میں جا رہا ہو۔ تو تُم جانتے ہو کہ اُس کی موٹائی فیٹن میں کے گدے تکیوں سے نہیں آئی۔ اُس کے موٹے تازہ ہونے کا باعث ہنہناتی ہوئی خچریں نہیں ہیں۔ بلکہ

غذا کو ہضم کرنے سے جسم بڑھا پھیلا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں اقبال و عروج دیکھتے ہو۔ اُس کا سبب کسی کی چالاکی پھند فریب کبھی نہیں ہوسکتے۔ قسمیں دلاکر پُوچھ دیکھو۔ جس حد تک چالاکی پھند فریب برتے گئے۔ اُس حد تک ضرور کمی (ناکامیابی) ہُوئی ہوگی۔ آنند۔ سُکھ یعنی سرُور و راحت کا سبب کچھ اَور نہیں تھا۔ سوائے دانستہ یا نادانستہ دِل میں برہم بھاؤ (خیالِ حق) سمانے کے۔ یہ غذا کھاتے تُم نے اُس کو نہیں دیکھا تو کیا۔ اور وہ خود بھی اس بات کو بھُول گیا ہے تو کیا۔ (بچے کئی دفعہ رات کو دُودھ پیتے ہیں اور دن کو بھُول جاتے ہیں)۔ پر بھائی! تیل کو تو تِلوں ہی سے آنا ہے۔ سُکھ۔ آنند۔ اقبال کبھی نہیں کبھی نہیں آسکتا بغیر آتما کار ورتی یعنی محوِ ذات رہنے کے۔

यदा चर्मवदाकाशं वेष्ट यिष्यन्ति मानवाः

तदा देवमविज्ञाय दुःखस्यान्तो भविष्यति ॥

(श्वेता० उप० ६, २०)

(یعنی جب لوگ چمڑے کی مانند آسمان کو لپیٹ سکیں گے۔ تبھی بغیر آتم دیو کو جانے اُن کے دُکھ مِٹ سکیں گے)

مثال۔ حوالہ۔ دلیل و قیاس سے تو یہ ثابت ہے ہی۔ مگر مَیں اس وقت تدبیر و دبیر وغیرہ کو اپیل نہیں کرتا۔ مَیں تو بہت قریب کا پتہ دیتا ہُوں۔ یہ تُم ہو اور یہ تمہاری دُنیا ہے۔ اب دیکھ لو۔ خُوب آنکھیں کھول لو۔ جب تُمہارے دِل میں دُنیا کے تعلقات بمقابلہ خیالِ حق زیادہ ہو جاتے ہیں۔ جب مادمنی کا خیال تیاگ اور شانتی (ترک و سکُون) کو نیچے دباتا ہے۔ تو جس درجہ تک برہم سیتم جگن

متھیا (ब्रह्म सत्यं जगन्मिथ्या) کی تم اعمال سے پہلو تہی کرتے ہو اُسی درجہ تک تکلیف۔آفت اور مصیبت تمہیں ملتی ہے۔ اور اندھیرے کنوئے میں گرتے ہو۔علم نباتات (Botany) اور علم کیمیا (Chemistry) کی طرح ذاتی تجربہ اور مشاہدہ (observation and experiment) سے یہ مسئلہ ثابت ہے۔ دُنیا میں بیماری ایک ہی ہے اور علاج (دوا) بھی ایک ہی ہے۔خیال سے یا اعمال سے برہم (حق) کو ناحق اور عالم (جگت) کو حق جاننا۔ایک یہی خیالِ مخالف کبھی کسی مصیبت میں ظاہر ہوتا ہے کبھی کسی میں۔ اور ہر آفت کی دوا جسم وغیرہ کو نیست سمجھکر برہم اگنی یعنی آتشِ حق میں شعلہ ہو جاتا ہے۔لوگ شاید ڈرتے ہیں کہ دُنیا کی چیزوں سے محبت کی جاوے تو محبت کا جواب بھی پاتے ہیں مگر پرمیشور سے پریم تو ہوا پکڑنے جیسا ہے۔کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ دھوکے کا خیال ہے۔ پرمیشور کے عشق میں اگر ہماری چھاتی ذرا دھڑکے۔ تو اُس کی ایک دم برابر دھڑکتی ہے اور ہمیں جواب مِلتا ہے۔ بلکہ دُنیا کے پیاروں کی طرف سے محبت کا جواب تب ہی ملتا ہے جب ہم اُن کی طرف سے اپوش ہوکر ایشور بھاؤ ہی کی طرف جُھکتے (بجانبِ حق رجوع ہوتے) ہیں۔کسی نے کہا "لوگ تمہیں یہ کہتے ہیں"۔ کوئی بولا "لوگ تمہیں وہ کہتے ہیں"۔ کہیں حاکم بگڑ گیا۔کہیں مقدمہ آپڑا۔ کہیں بیماری آ کھڑی ہوئی۔

اَے بھولے مہیش! تُو ان باتوں سے اپنے دِل میں شِکن مت پڑنے دے۔ بھرمے میں مت آ۔ تُو ایک نہ مان۔ برہم بِنا دِرشیہ کبھی

ہُوا ہی نہیں یعنی بغیرِ حق کسی ظہور کا اظہار ہی نہیں ہوتا۔ چِت میں ترک اور سرُورِ ذات کو بھر تو دیکھو۔ سب بلائیں آنکھ کھولتے کھولتے سات سمندر پار نہ ہو جائیں تو مُجھکو سمندر میں ڈُبو دینا۔ ایک بچّے کو دیکھا دُوسرے بچّے کو دھمکا رہا تھا۔ "آج والد سے تو ایسا پِٹے گا کہ ساری عُمر یاد پڑا کرے"۔ دُوسرے بچّے نے شانتی سے جواب دیا۔ "اگر وہ مجھے ماریں گے تو بھلے ہی کو ماریں گے نا۔ تیرے ہاتھ کیا لگے گا؟" اس بچّے کے برابر وِشواس تو ہم لوگوں میں ہونا چاہئے۔ ڈراؤنی و ہیبتناک شُدنی کی خبر پاکر بگلے کی طرح گردن اُٹھاکر گھبرا کر "کیا کیا" کیوں کرنے لگے؟ آنند سے بیٹھ۔ میرے یار! وہاں کوئی اَور نہیں ہے۔ تیرا ہی پرم پِتا آتم دیو ہے۔ اگر ماریگا بھی تو بھلے کے لئے۔ اور اگر تُم اُس کی مرضی پر چلنا شروع کردو تو وہ پاگل تھوڑا ہے کہ یُوں ہی پڑا پیٹے۔

یکسوئی میں رُکاوٹیں

(۱) پہلی رُکاوٹ۔ متھیّا کارن شتا میں وِشواس

(عِلّتِ کاذب میں یقین)

اپنے تئیں پُورا پُورا اور سارے کا سارا پرماتما کے حوالے کردینے کا مزا تب تک تو آ نہیں سکتا جب تک دُنیا کی چیزوں میں عِلّت پن معلوم ہوتا رہے گا۔ یا جب تک ایشور ہی ہر بات کا ایک ماتر کارن (عِلّتِ محض) محسوس نہ ہونے لگے۔ عربی۔ فارسی۔ اُردو میں کارن

کو سبب کہتے ہیں اور عربی میں سبب کے ابتدائی یا لغوی معنی ہیں ڈور۔ رسہ۔ مُلکِ روم کے سوامی جُوال (جو اُن لوگوں کی زبان میں مولانا جلال کے نام سے مشہور ہیں) لکھتے ہیں یہ علّت و معلول کا رسہ جو اس دُنیا کے کنوئیں میں سب گھڑوں کے گلے میں بندھا پاتے ہو یہ کیوں پھرتا ہے؟ اس بے جان رسّی کو تو کیا پھرنا تھا۔ کنوئیں کے سر پر پرماتم دیو چرخی گھما رہا ہے۔ پر ہمیں رسہ ہی سب گھڑوں کو چلاتا معلوم ہوتا ہے۔ سب کارنوں کا کارن (مسبب الاسباب) تو پرماتم دیو ہی ہے۔

स यथा दुन्दुभेर्हन्यमानस्य न बाह्याञ्छब्दाञ्छक्नुयाद् ग्रहणाय, दुन्दुभेस्तु ग्रहणेन दुन्दुभ्याघातस्य वा शब्दो गृहीतः॥ ८॥

सयथा शंखस्य ध्मायमानस्य न बाह्याञ्छब्दाञ्छक्नुयाद् ग्रहणाय, शङ्खस्य तु ग्रहणेन शङ्खध्मस्य वा शब्दो गृहीतः॥ ९॥

सयथा वीणायै वाद्यमानायै बाह्याञ्छब्दाञ्छक्नुयाद् ग्रहणाय, वीणायै तु ग्रहणेन वीणावादस्य वा शब्दो गृहीतः॥ १०॥

(बृह० उप० ४, ५, ८-१०)

(جیسے نقّارہ یا ڈھولنا جب پیٹا جاتا ہے تو اُس کی آواز دوسرے کے قابو میں نہیں آتی لیکن نقّارے کو یا نقّارے کے پیٹنے والے کو پکڑنے سے نقّارے کی آواز بھی پکڑی جاسکتی ہے۔ جیسے سنکھ

(ناقُوس) جب پُورا (پھُونکا یا بجایا) جاتا ہے تو دُوسرے سے اُس کی
آواز پکڑی نہیں جاتی لیکن سنکھ کو یا سنکھ کے پُورنے والے کو
پکڑنے سے آواز بھی پکڑی جاتی ہے۔ اور جیسے بِینا جب بجائی
جاتی ہے تو اُس کے نغمے پکڑے نہیں جاتے لیکن بِینا یا بِینا کے
بجانے والے کو پکڑنے سے بِینا کے نغمے بھی پکڑے جاتے ہیں)

جیسے ڈھول۔ مردنگ۔ سنکھ۔ بِینا۔ ہارمونیم وغیرہ کی آواز سب اپنے آپ ہی پکڑی جاتی ہے جب ہم ان باجوں یا اوزاروں یا اُن کے بجانے والوں کو قابو میں کر لیتے ہیں۔ اسی طرح دُنیا کی قوّت، علّت، معلول ایک دم ہمارے ماتحت ہو جائے گی جب ہم ایک پرماتم دیو کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں گے۔ کسی بڑے آدمی کی سفارش۔ علم۔ طاقت۔ دھن دولت۔ مکان وغیرہ کو جو اپنی مطلب براری میں تُم باعث اور سبب ٹھان بیٹھتے ہو اور آتم درِشٹی (حق بینی) کا سہارا نہیں لیتے۔ دھوکے میں گرتے ہو۔ دُکھ پاؤ گے۔

کہتے ہیں کہ کرشن جب گوپیوں کا دُودھ ماکھن وغیرہ کھاتا تھا تو کچھ دہی وغیرہ گھر میں بندھے ہُوئے بچھڑوں کی تھوتھنی پر لگا دیتا تھا۔ گھر والے لوگ اپنے ہی بچھڑوں کو چور سمجھ کر اُن غریبوں کو ٹپڑے مارتے پیٹتے اور اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

پیارے! کارن (سبب) تو ہر بات کا اکیلا بھگوان ہے۔ باقی کارن تو صرف چٹّی تھوتھنی والے بیچارے بچھڑے ہیں۔ محتاج دیوالیوں کے نام ہزاری لال۔ لکھپت رائے۔ کروڑی مل وغیرہ رکھّے ہُوئے ہیں۔ کیوں چکّر میں مارے مارے پھرتے ہو؟ باہری دُنیوی جھُوٹی علّت وغیرہ

پر مت بھولو۔ یہ اصلی علّت نہیں۔ جب تک لڑکی بیاہی نہیں جاتی تب تک گڑیوں سے جی بہلاتی ہے۔ مسبب الاسباب رُوپ حق تعالیٰ جب مل سکتا ہے تو جھوٹے سببوں سے جی بہلانا کیوں؟

بھان متی کا تماشہ ہُوا۔ پُتلیاں ناچتی ہیں۔ ایک نے دوسری کو بُلایا اس لئے وہ آگئی۔ ایک نے دُوسری کو پیٹا۔ اس لئے وہ مرگئی۔ اس طرح کے رشتۂ علّت و معلول پر اکثر لوگ بھول رہے ہیں۔ اصلی سبب تو ایک پُتلی گر (انترجامی۔ سُوتر دھاری) ہے۔ رُبیت یا بانسری سُننے لگے۔ ایک سُر کے بعد دُوسرا سُر آیا۔ ان شبدوں اور سُروں میں ایک شبد دُوسرے شبد کو ضرور لایا۔ ان شبدوں اور سُروں کا آپس میں ضروری لگاؤ ہے۔ اس طرح کے علّت و معلولوں کے تعلّقات پر لوگ بھول بیٹھے ہیں۔ اصلی سبب تو گانے والا بنسی دھر ہے۔

ایک اُونچا مکان تھا۔ چوٹی کی یعنی سب سے اُونچی منزل کا سہارا کیا ہے؟ اس سے نیچے کی منزل۔ اور اُس کا سہارا اُس کے نیچے کی منزل۔ فرش کی منزل باقی سب کا سہارا اور سبب۔ اس طرح کے علّت و معلول کے تعلّقات پر لوگ بھول بیٹھے ہیں۔ اصلی زندہ سبب تو ان سب منزلوں کا مکان بنانے والا (کرتا دھرتا یا فاعلِ حقیقی) ہے۔

دُنیا کے سببوں کو اُمید کی نگاہ سے تکنا تو کھاری سمندر میں ڈوبنے کو تنکے کا سہارا ہے جب گول چندر (کرشن) کو وہاں سُدرشن تو ملا نہیں رتھ کا چکر (پہیہ) اُٹھا کر ہی اپنا عہد توڑ ڈالا تو بھیشم بُڈھے کو بھی یہ لڑکپن دیکھ بڑی ہنسی آئی۔ اب پھر وہی کام نہ ہونے پائے۔ یہ جسمانی

آنکھ سے نظر آنے والے کارن (اسباب) آشرے (سہارے) ان کو تکنا تو نا مناسب رتھ کے چکر کو اُٹھانا ہے۔ ان سے کیا بنے گا۔ تم اپنے اصلی سوروپ (ذات) کو تو یاد کرو۔ آنکھیں کھولو۔ کس چکر میں پڑے ہو۔ کس جھگڑے میں اڑے ہو۔ کس کل کل (پریشانی) میں پھنسے ہو۔؟ تم تو وُہی ہو وُہی۔ ذرا دیکھو اپنے اصلی سُدرشن کی طرف۔ تمہارے ڈر سے سُورج کانپتا ہے۔ تمہارے ڈر سے ہوا چلتی ہے۔ تمہارے خوف سے سمندر اُچھلتا ہے۔ تمہارے چابک سے موت ماری ماری پھرتی ہے۔

भीषाऽस्माद्वातः पवते। भीषोदेति सूर्यः।
भीषास्मादग्निश्चेन्द्रश्च। मृत्युर्धावति पञ्चम इति॥
(तैत्ति० उप० २, ८, १)

(اس برہم کے خوف سے ہوا چلتی ہے۔ اس کے خوف سے آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اسی کے خوف سے آگ۔ اِندر اور پانچواں ملک الموت دوڑا پھرتا ہے)

یہ ڈر سے مہر آچمکا اہاہا اہاہا اُدھر مہ ربیم سے پیکا اہاہا اہاہا
ہوا اٹکھیلیاں کرتی ہے میرے ایک اشارے سے ہے کوڑا موت پر میرا اہاہا اہاہا

ارے پیارے! وِشیوں کے وش (قابو) میں رہنا یعنی قیدِ محسوسات میں پڑا تو پرادھِینتا (حالتِ مجبوری) میں مرنا ہے (اس لئے بے لبی کا جینا تو جسم کو قبر بناکر مُردے کی طرح سڑنا ہے: निर्ममो निरहंकारः (مادمنی و خودی سے الگ) ہو تبھی آتم جیوتی (نُورِ ذات) اس طرح پھیلتی ہے جس طرح فانُوس میں سے روشنی جس کام میں ظاہری علامتیں دیکھکر قیاس کے بھروسے اُمید کی پھانسی میں دل پھنسا دیا جائے وہ کام کبھی نہیں ہوگا۔ جن کو قیاس اور علامتیں مان رکھا ہے انسان کو جھوٹی

دُنیا میں وہ اس طرح پھنساتے ہیں۔ جیسے مچھلی کو گوشت کی بوٹی جال میں۔ جب بیرُونی اسباب کو دِل میں نہ جاکر خود غرضی کے حصّہ کو چھوڑ کر کوئی بھی کام اس خیال سے کیا جائے کہ "ہے رامؔ! یہ تمہارا ہی کام ہے۔ اس لئے میں اپنا سمجھتا ہُوں۔ جو تمہاری مرضی سو میری مرضی۔ کام کے ہونے نہ ہونے میں مجھے نقصان نہیں۔ فائدہ نہیں۔ میرا آنند تو محض تُمہارے ساتھ (ابھید (ایک) رہنے میں ہے۔ کام کو اگر سنوار دو تو واہ واہ! بگاڑ دو تو واہ واہ!" جب سچّے دِل سے یہ یقین اور یہ نظر ہو تو کیا دُنیا اور دُنیا کے قانُونوں کی شامت آئی ہے کہ خادموں کی طرح فوراً سب کام نہ کرتے جائیں؟ بھلا رامؔ کے کام میں بھی رُکاوٹ ہوسکتی ہے؟ بھگوت گیتا کے بیچوں بیچ میں جو شلوک کہ گیتا کو آدھا اِدھر اور آدھا اُدھر مرکزِ ثقل (centre of gravity) کی طرح تول دیتا ہے یہ ہے۔

अनन्याश्चिन्त यन्तो मां ये जना पर्युपासते
तेषां नित्याभियुक्तानां योग क्षेमं वहाम्यहम्

(गीता ९, २२)

(اپنے دِل کو کسی اَور کی نذر نہ کرکے بلکہ محض میرے میں لگائے ہُوئے میرا دھیان جو کرتے ہیں اَیسے متواتر دھیان کرنے والوں کی کُل ضروریات و حفاظت کا ذمّہ مَیں اپنے اُوپر لیتا ہُوں)

بھگوان کا یہ تمسّک (اقرار نامہ) تب بھی جُھوٹ نہیں ہوگا جب آگ کا شُعلہ نیچے کو بہنے لگے اور آفتاب مغرب سے نکلنا شرُوع کردے اور مشرق میں غرُوب ہو۔

یارا! منُشیہ جنم (انسانی قالب) پاکر بھی حیران و مغموم رہنا بڑے

شرم کی بات ہے۔ رنج و فکر میں وے ڈُوبیں جن کے ماں باپ مرجاتے ہیں۔ تمہارا رام تو سدا جیتا ہے۔ کیا غم؟ ذرا تماشہ تو دیکھو۔ چھوڑ دو جسم کی فکر کو۔ مت رکھو کسی کی اُمید۔ پرے پھینکو خواہشاتِ نفسانی۔ ایک آتم درِشٹی (نگاہِ حقانی) کو مستقل رکھو۔ تمہاری خاطر سب کے سب دیوتا (رُوحانی طاقتیں) لوہے کے چنے بھی چاب لیں گے۔

रुचं ब्राह्मं जनयन्तो देवा अग्रे तदब्रुवन्।
यस्त्वैवं ब्राह्मणो विद्यात्तस्य देवा असन्वशे॥

(शु० यजु० अ० ३१ मं २१)

(دیوتا لوگ پرکاش سُروُپ برہم یعنی نُورٌ علیٰ نُور کو اپنے میں پرکٹ یعنی ظاہر کرتے ہُوئے بولے کہ جو برہم کو اس طرح اپنے باطن میں پرکٹ یعنی اُنوبھو کرے گا اُس کے تابع میں سب دیوتا ہوں گے)

सर्वाण्येनं भूतान्यभिक्षरन्ति॥

(बृह० उप० ५, १, ३)

(سب موجودات اُسی کی طرف مائل ہوتی ہیں)

सर्वेऽस्मै देवा बलिमावहन्ति॥

(तैत्ति० उप० १, ५, ३)

(سب دیوتان نذریں اُس کی ہی بھینٹ کرتے ہیں)

न पश्योमृत्युं पश्यति, न रोगं, नोत दुःखतां।
सर्वं ह पश्यः पश्यति, सर्वमाप्नोति सर्वशः इति॥

(छा० उप० ७, २६, २)

(جس کی نظر ایسی ہے کہ یہ سب کچھ آتما ہی ہے۔ اُس کی نگاہ میں نہ موت نہ روگ یعنی مرض اور نہ دُکھ ہی کہیں دکھائی دیتا ہے۔ ایسا دیکھنے والا سب کو دیکھتا ہے اور سب طرف سے سب اشیاء اُسے آملتی ہیں)

کوئی مشکوک الفاظ میں تو وید نے کہا ہی نہیں۔ جب سروآتم درشٹی یعنی نگاہِ حقانی ہُوئی۔ تب بیماری دُکھ اور موت پاس نہیں پھٹک سکتے۔ آتما کو جانے کیا نہیں جانا جاتا۔ اور ہر طرح سے ہر چیز ملجاتی ہے۔

(۲) دوسری رُکاوٹ۔ دَویش درشٹی (غیر بینی)

آنند دھام (منزلِ راحت اور سرور) کی طرف دِل چلا تو دُشمن اور مخالف کا خیال ڈاکو بن کر دِل کو لے اُڑا۔ یورپ میں ایک دِن فلسفہ کا ایک لائق حکیم اپنے پاس آنے والوں کی کچھ ہجو سی کرنے لگا۔ اُس سے پُوچھا کہ آپ شکایت کرتے ہو؟ تو بولا نہیں مَیں اُن کے دِلوں کی اندرونی حالت پر غور کرتا ہوں۔
I study the psychology of their minds.

دُنیا میں ہم لوگ برابر یہی تو کرتے ہیں۔ غیر بینی اور خیالِ بد کو کوئی اچھا سا نام دیکر آنکھوں پر پردہ ڈال لیا اور اس ناگن کو برابر سینہ سے لگائے پھرے۔ پھر جب کہا گیا "پیارے ڈاکٹر! متعلقین کی اندرُونی حالت اکیلی قابلِ غور نہیں ہوتی۔ اپنی اندرُونی حالت بھی اُس کے ساتھ ساتھ قابلِ غور ہے۔ ساتھی جو بگڑے دِل والے ملے ہیں تو کیا آج کل آپ کی اندرُونی حالت بالکل بے عیب تھی؟ ڈاکٹر آدمی تھا سچّا۔ کچھ دیر خاموش رہکر بعد غور بولا۔ "سوامی! کہتے تو بالکل سچ ہو"۔ حقیقت میں جیسا میرا دِل ہوتا ہے وَیسے ہی دِل اور خیالات میرے پاس کھنچے چلے آتے ہیں۔ اکردل

کی حالت پر بُرا بھلا خیال کرتے رہنے سے کبھی جھگڑا نپٹتا بھی نہیں۔
اُن لوگوں کو کیا پکڑوں۔سب منوں کا من میں، ہُوں۔ اندر سے ایسی
ایکتا ہے کہ اپنے تئیں شُدّھ (پاک و صاف) کرتے ہی سب شُدّھ ہی
شُدّھ (پاک و صاف) پاتا ہُوں۔ نزدیک کا علاج (اپنے تئیں برہم
مئے یعنی محوِ ذات کر دینا) تو ہم کرتے نہیں دُور کے بندو بست
(اَوروں کے سُدھار یا ریفارم) کو دَوڑتے ہیں۔نہ یہ ہوتا ہے نہ
وُہ۔ ایشور درشن (دیدارِ حق) تو تب ملے گا جب دُینوی نقطۂ نگاہ
سے نظر آنے والے دشمن۔مخالف اور بدگو کو معاف کرنے میں ہم
اتنی دیر بھی نہ لگائیں جتنی شری گنگا جی تنکوں کو بہا لے جانے
میں لگاتی ہیں۔یا جتنی روشن کرنیں تاریکی کو اُڑانے میں لگاتی ہیں۔
جب تک سب چیزوں میں سم (برابر) دھی (بُدھی) نہیں ہوتی۔تب
تک سمادھی کیسی؟ وِشم[۱] درشٹی (ناہموار نگاہ) رہتے یوگ کی سمادھی

---

[۱] لوگوں میں بُرائی بھلائی کا خیال اُٹھ جانے سے مُراد یہ نہیں ہے کہ جان بُوجھکر
ہم بُرے بھلے کی تمیز کھو ڈالیں۔ یا بُرے بھلے کی تمیز کو جواب دیکر من مَوجی عَیش وعشرت میں
لگ کر اپنے تئیں پہلے سے بھی زیادہ بے وقوف بنا کر گڑھے میں گرا دیں۔ بلکہ مُراد اس فقرہ
سے یہ ہے کہ انکشافِ ذات کا پہلا سادھن جو بیبک (قوّتِ ممیّزہ) ہے اُس کا بہتر استعمال
کرکے ست سے است یا بھلے سے بُرے کی تمیز کرکے است یا بُرے کی صحبت چھوڑ ست
یا اچھے کی صحبت کو اختیار کریں۔ دن رات سرب و یاپک (کُلِ شئے محیط) ذات
کا لگاتار منن (وِرد) کریں۔ اور جب اس طرح سے سب میں ست کا منن کرتے
کرتے چِت اُس ست میں محو و مستغرق ہوگا تو اُس وقت بُرائی بھلائی ست و
است کی تمیز ہرگز نہیں رہیگی۔ اور جب تک یہ حالتِ مذکورہ بالا وِرد سے
نہیں آجاتی۔تب تک حقیقت میں سم۔ دھی یعنی سمادھی نہیں ہوتی۔

اور دھیان تو کہاں دھارنا بھی ہونا غیر ممکن ہے۔ سم درشٹی یعنی نظر یگانگت تو تب ہوگی جب لوگوں میں بھلائی بُرائی کا خیال اُٹھ جائے۔ اور یہ کیونکر اُٹھے؟ جب لوگوں میں خیال غیریت کا نہ رہے اور لوگوں کو برہم (حق) سے علٰحدہ مانکر جو اچّھا یا بُرا فرض کر رکھا ہے نہ کرے۔

سمندر میں جیسے لہریں ہوتی ہیں۔ کوئی چھوٹی کوئی بڑی۔ کوئی اُونچی کوئی نیچی۔ کوئی ترچھی کوئی سیدھی اُن کی حقیقت سمندر سے الگ نہیں مانی جاتی۔ اُن کا وجود علٰحدہ نہیں جانا جاتا۔ اس طرح اچّھے بُرے آدمی اور امیر غریب لوگ تو لہریں ہیں۔ جن میں ایک ہی بحرِ حق لہریں مار رہا ہے۔ اہاہا! اچّھے بُرے لوگوں میں جب ہماری شخصی نظر اُٹھ جائے اور اُن کو بحرِ حق کی لہریں جان لیں۔ تو راگ دوِیش (رغبت و نفرت) کی آگ بُجھ جائے گی۔ اور چھاتی میں ٹھنڈک پڑ جائے گی۔ جو لہر اُونچے چڑھ گئی ہے وہ ضرور نیچے گرتی ہے۔ اسی طرح جس شخص میں بدی سماگئی ہے اُسے ضرور دُکھ پانا ہی ہے۔ مگر لہروں کے اُونچے اور نیچے بھاؤ (اعلیٰ اور ادنےٰ حالت) کو حاصل ہوتے رہنے پر بھی سمندر کی سطح کو مستوی ہی مانا ہے۔ اسی طرح ریچ رُوپ لوگوں کے کرم اور کرم پھل (فعل و ثمرۂ فعل) کو حاصل ہوتے رہنے پر بھی بحرِ حق کی یکسانیت میں فرق نہیں پڑتا۔ لہروں کا تماشہ بھی کیسا مسرّت خیز اور راحت انگیز ہوتا ہے۔ پر ہاں جو شخص اُن سے بھیگ جائے یا ڈوبنے لگے اُس کے لئے تو آفت کی صُورت ہے۔ سمُدر درشٹی (نظرِ بحری) ہونے سے سم دھی اور سمادھی ہوگی۔

(۳) تیسری رُکاوٹ: سوارتھ۔ کپٹ (خود غرضی۔ فریب)

اُپاسنا کی جان آتم سمرپن اور آتم دان (ایثارِ نفسی اور قربانی یا بلدان) ہے۔ اگر یہ نہیں تو اُپاسنا بے ثمر و بے جان ہے۔ بھئی! سچ پُوچھو تو ہر کوئی لینے کا یار ہے۔ جب تک تُم اپنی خودی اور اہنکار کو پرمیشور کے حوالہ نہ کروگے تب تک تمہارے پاس بیٹھنا تو کیسا کوسوں بھاگتا پھرے گا۔ جیسے کرشن بھگوان کال یَوَن سے۔ اُس آنکھوں والے بینئے سوزان سُورداس نے بلبلاتے بچّے کی طرح کیا زور سے سچ کہا ہے۔

کِن تیرو گوبند نام دھریو
لین دین کے تُم ہتکاری موسے کچھو نہ سریو
پیر سودا تاں کیو اجاچی تنڈل بھینٹ دھریو
درپدسُتا کی تُم پت راکھی امبر دان کریو
گج کے پھند چُھڑائے آکر پُشپ جو ہاتھ پڑیو
سُور کی برِیاں نِٹھُر ہوے بیٹھے۔ کان مُوند دھریو

اگر چاہو امتحان تو لیں کہ بھجن اُپاسنا سے پھل ملتا ہے کہ نہیں۔ تو پیارے! یاد رہے کہ امتحاں کا بھجن ناواجب ہے اور ناممکن ہے۔ کیونکہ بِنَش کپٹ (بلا فریب) بھجن تو ہوگا وُہ جس میں پھل اور پھل کے چاہنے والے اپنے آپ کو اس طرح پرمیشور کے نذر کردیں جیسے اگنی میں آہوتی۔

یہ بِنتی رگھوبیر گوسائیں
اور آس بشواس بھروسو۔ ہرو جیوُ جڑتائی

چاہوں نہ سُگتی سُمتی سمپت کچھو، رِدّھ سِدّھ بِپُل بڑائی
ہیتو رہت انوراگ رام پد۔ بڑھے انودِن ادھکائی
یہ بِنتی رگھوبیر گوسائیں

اگر کوئی کہے آہُوتی (قربان) ہوجانے میں کیا مزا رہا؟ تو ایسے سائل کو مزے (آنند یا سرور) کی اصلیت کا علم ہی نہیں۔ خود (انانیت) کے محو ہو جانے کا نام ہے مزا (آنند)۔ بچّے نے جب اپنا ننّھا سا تن اور بھولا بھالا من ماں کی گود میں ڈال دیا۔ تو سارے جہاں میں اُس کے لئے کون سا آرام باقی رہا۔ اور کون سی فکر باقی رہی۔ آندھی ہو۔ بارش ہو۔ زلزلہ ہو کچھ ہو۔ اُس کا بال بیکا نہ ہوگا۔ کیسا بے خوف ہے۔ کیا میٹھی نیند سوتا ہے۔ اور بیداری میں اُٹھتا ہے۔

(۴) چوتھی رُکاوٹ۔ پرکرتی نیم بھنگ
(خلافِ ورزئی قانونِ قدرت)

جب تک تمہارے افعالِ جسمانی اُپاسنا رُوپ نہ ہوں، تمہارا اوپر سے اُپاسنا کرنا فضول دِکھلاوا ہے۔ نِشچل من پرچاوا (بے سُود دِل لگی) ہے۔ افعال کی صورت میں اُپاسنا سے یہ مُراد ہے کہ کھانے پینے سونے ورزش وغیرہ میں جو قوانینِ قدرت ہیں وہ ایک ذرّہ بھی نہ توڑے جائیں۔ لذائذِ محسوسات میں پڑنا حکمِ الٰہی کے عملاً خلاف چلنا ہے۔ جس کی سزا بیماری مصیبت وغیرہ ضرور ملتی ہے۔ اور جب مصیبت کے قید خانہ میں بیت (بیدی) پڑ رہے ہوں

تب اُپاسنا کہاں ہوسکتی ہے جس شخص کا رُجحانِ طبع ویسے ہی افعال وغیرہ کی طرف لے جائے جیسا قوانین الٰہی چاہتے ہیں۔ جس شخص کی خواہش وُہی اُٹھے جو گویا ایشور کی خواہش ہے۔ جس کی عادت (nature) پرکرتی یا قُدرت کی عادت ہو۔ وہ عمل سے शिवोऽहम् (اناالحق) گا رہا ہے۔ اُسے دُکھ کہاں سے لگ سکتا ہے۔

नायमात्मा बलहीनेन लभ्यः

(मुंडक उप० ३, ४)

(یہ آتما یعنی انکشافِ ذات کمزور سے قابلِ حصول نہیں)

یہاں بَل سے مُراد صحتِ جسمانی ہے اور صحتِ رُوحانی بھی ہے۔ جس کو ہمّت (अध्यवसाय) بھی کہتے ہیں۔ گیتا کی پرگیا پرتیشٹھا (قایم العقلی) بھی بل (قوّت) کی صُورت ہے۔

نیند کیوں ضروری ہے؟

روز مرّہ کام کاج کرتے انسان اکثر دُنیا اور جسم وغیرہ کو ستیہ (حق) ماننے لگ پڑتے ہیں۔ مگر کاروبار کے لئے طاقت (زور) تو آنند روپ آتم دیو (سرورِ ذاتِ حق) سے ہی آتی ہے جس کی ستّا (حقیقت) کے سامنے دُنیا کے نام اور رُوپ یعنی اسماء اور اشکال کی حقیقت یا غیریّت رہ نہیں سکتی۔ دُنیا کے دھندوں میں پھنسے ہُوئے کو روز مرّہ نیند گھیر کر زمین پر پھینک کر یہ سبق پڑھاتی ہے کہ یہ جگت ہے نہیں۔ آتما ہی

آتما ہے۔ کیونکہ نیند میں دُنیا متھیا (جھوٹی) ہو جاتی ہے اور نادانستہ ایک آتما ہی آتما باقی رہ جاتا ہے۔

۵ پول سکالیو جگت کا سُپیتی رُوتھا ما نہ　　نام رُوپ سنسار کی جہاں گندھ بھی نا نہ

सयथा शकुनिः सूत्रेण प्रबद्धो दिशं दिशं पतित्वा
ऽन्यत्रायतनम लब्ध्वा बन्धन मेवोपश्रयत, एवमेव
खलु सोम्य तन्मनो दिशं दिशं पतित्वाऽन्यत्रायतनम-
लब्ध्वा प्राणमेवोपश्रयते ॥ (छांदो० उप० ६, ८, २)

(جیسے تاگے سے بندھا ہُوا پرند اِدھر اُدھر اُڑکر اور کہیں پناہ یا سہارا نہ پاکر پھر اُسی تاگے والی کھُونٹی پر آبیٹھتا ہے۔ بعینہٖ اَے پیارے! یہ من اِدھر اُدھر بھٹک کر اور کہیں پناہ یا آسرا نہ پاکر پھر پران کی ہی پناہ لیتا ہے۔ کیونکہ یہ من ہے پیارے! پران رُوپی تار سے بندھا ہُوا ہے)

قفس ایک تھا آئینوں سے بنا
تھا پھُول ایک پر عکس ہر طرف تھے
گُلِ عکس کی طرف بُلبُل چلی
جسے پھُول سمجھی تھی سایہ ہی تھا
جو داہنے کو جھانکا وُہی گُل کھلا
مقابل اُڑی مُنہ کی کھائی وہاں
قفس کے تھا ہر سمت شیشہ لگا
اُٹھا سر کو جس آن پیچھے مُڑی
جھجھکنے لگی اب بھی دھوکا نہ ہو
چلی آخرش کرکے دِل کو دلیر
مِلا گُل۔ ہُوئی مست و دِلشاد تھی
یہی حال انسان تیرا ہُوا
بھٹکتا ہے جس کے لئے در بدر

نکلتا گُل تازہ مرکز میں تھا؛
تھے معشوقِ سب بُلبُل بند کے
چلی تھی نہ دَم بھر کہ ٹھوکر لگی
یہ جھپٹی تو تڑ شیشہ سر پر لگا
جو بائیں کو دَوڑی یہی حال تھا
جو نیچے گری چوٹ آئی وہاں
کھِلا پھُول تھا وسط میں واہ واہ
تو خنداں تھا گُل آنکھ اُس سے لڑی
ہے پیچ پیچ کا گُل تو فقط نام کو
مِلا گُل۔ لگی اِک نہ دَم بھر کی دیر
قفس تھا نہ شیشے وہ آزاد تھی
قفس میں ہے دُنیا کے گھیرا ہُوا
وہ آرام ہے قلب میں جلوہ گر

سُشُپتی (خوابِ غفلت) میں نادانستہ پرم تتو (اصلی حقیقت) میں لیں (محو) ہو جانے سے اس قدر شکتی (طاقت) آ جاتی ہے۔ تو اُپاسنا دھیان وغیرہ کے ذریعہ دانستہ پرم تتو (ذاتِ مطلق) میں لین (مستغرق) ہونے سے شکتی۔ بل۔ آنند کیوں نہ بڑھیں گے؟

جب دیکھو کہ چنتا۔ کرودھ۔ کام (فکر۔ غصہ و شہوت یعنی تموگن) گھیرنے لگے ہیں تو چپکے اُٹھکر پانی کے پاس چلے جاؤ۔ آچمن کرو (تھوڑا جل پیو)۔ ہاتھ مُنہ دھوؤ یا نہا ہی لو۔ ضرور شانتی آجائے گی۔ اور ہری دھیان رُوپی کھشیر ساگر (مراقبۂ الٰہی کے بحرِ شیریں) میں غوطہ لگاؤ۔ غصہ کے دُھوئیں اور بھاپ کو گیان اگنی یعنی آتشِ معرفت میں بدل دو۔

اُپاسنا میں اُدارتا (فیاضی) کی ضرورت

اُپاسنا کی لگن یگیہ۔ کرم اور دان سے لگنی شروع ہوتی ہے۔ جب کچھ چیز یگیہ میں یا اور موقعہ پر دیگئی تو دل میں ٹھنڈک اور شانتی آئی۔ یہ مزا پھر لینے کو دل چاہنے لگا۔ بیرونی اشیاء کثیف کو کبھی کبھی دیتے دلانے نہایت اہم اور لطیف عطیات یعنی چت ورتی کا ہری چرنوں (ذاتِ پاک) میں کھویا جانا بھی آہستہ آہستہ آجاتا ہے۔ اُپاسنا۔ دھیان (استغراق) کا رنگ جمنے لگتا ہے۔ اب یہاں یہ حیرت انگیز ہے کہ جب ایک پہلو سے ہم نے کھو دینا (دان) کہا ہے۔ وہ دُوسرے پہلو سے دیکھیں تو لُوٹ لینا ہے۔ بھکتی (اُپاسنا) دل کی اُس درجہ کی فیاضی کا نام ہے جس میں اپنا آپ تک اُچھال کر ہری (بھگوان) کے نام پر نثار کر دیا جائے۔ اُپاسنا کے آنند (سُرور)

کو تنگ دِل والا کبھی نہیں پا سکتا۔ جس کا دِل بادشاہ نہیں وہ کیا جانے بھکتی رس (عِشق کے مزے) کو؟ اور بادشاہ وہ ہے جس کا اپنے دِل کے اندر سے ایک لنگوٹی (کوپین) کے ساتھ بھی دعوےٰ نہ ہو۔ دھن چُھرایا گیا۔ رونا کیوں ہے؟ کیا چور لے گئے؟ رو اس سمجھ پر۔ پیارے! اور کوئی نہیں ہے لینے لے جانے والا۔ ایک ہی ایک شگر کی آنکھ۔ یار پیارا اینک بہانوں سے تیرا دِل لیا چاہتا ہے۔ گوپیوں کی اس سے بڑھکر اور کیا خوش قسمتی ہوگی کہ کرشن مکھن چرائے۔ دھنیہ ہیں وہ جس کا سب کچھ چُرایا جائے۔ من اور چت تک بھی باقی نہ رہے۔

ककुभाय स्तेनानां पतते नमः,

नमो निचेरवे परिचराय ॥

तस्कराणां पतये नमः ॥ (शु० यजु० सं० १६, २०)

(چوروں کے مشہور سردار کو سلام۔ گُپت چر (مخفیہ لوگوں) کے پالک یعنی پرورش کنندہ کو سلام۔ ڈاکوؤں و لُٹیروں کے مالک کو سلام)

رِگ وید اور یجُر وید کے پُرش سُوکت میں دکھایا ہے کہ جب رِشی۔ دیوتا لوگوں نے وراٹ پُرش کی ہوی (قربانی) دیدی تو اُن کے سب کام آپ ہی سِدھ ہونے لگ پڑے۔ یعنی جب عالِم باعمل لوگوں نے عالمِ کبیر کی قُربانی دے دی تو اُن کے سب کاموں میں خود بخود کامیابی ہونے لگی۔ یگیہ (قُربانی) سے دُنیا کی پیدائش ہُوئی۔ برہدار نیک اُپنشد کے شروع میں تمام عالَم کو گھوڑا مان کر اس کی قُربانی کس

خوبصورتی سے بیان کی ہے۔ واہ۔ واہ! جب تک نام رُوپ تمام سنسار (وِراٹ رُوپی سارا جگت) پوری طرح سے دان نہ کردیا جائے اور یگیہ بلی میں آہُوتی (بھینٹ) نہ کردیا جائے۔ تب تک امرت یعنی آب حیات چکھنے کا مُنہ کہاں؟ सर्वं खल्विदं ब्रह्म یعنی ہمہ اوست کی آتشِ معرفت میں دُنیا کی چیزیں اور اُس کی خواہشیں جل بھُن جائیں تو سامراجیہ (سُوراجیہ) کے حصول میں دیر ہی کیا ہے؟

راجہ بلی نے جل کا کرَوا ہاتھ میں لیکر تینوں لوک بھگوان کو دان کردئے۔ تم سے ایک اُنگر کے برابر بھی نہیں بنتا۔ اپنے کاسئہ سرکو ہتیلی پر لیکر سارے عالَم کو سچا دیکھنے کی نگاہ برہم (حق) کے حوالہ کردو۔ بلا ٹلی۔ بوجھ ہٹا۔ پھر خُدا کو خُدائی دینے والے تم ہو۔ سُورج اور چاند تمہارے گداگر ہیں۔

لوگ کہتے ہیں اجی! بھجن میں من نہیں ٹھہرتا۔ یادِ الٰہی میں دِل نہیں لگتا۔ یکسُوئی نہیں ہوتی۔ یکسُوئی بھلا کیسے ہو؟ کنجوسی کے باعث بندر کی طرح مُٹھی سے چیزوں کو تو چھوڑتے نہیں اور مُٹھی میں لیا چاہتے ہو رام کو۔ آخر ایسا انجان بھولا تو وہ بھی نہیں کہ اپنے آپ ہی ہتھے چڑھ جائے۔

جہاں کام تہاں رام نانہ + جہاں رام نہیں کام

رام تو اُس کو ملتا ہے جو ہنومان کی طرح ہیروں۔ جواہروں کو پھوڑ کر پھینک دے۔ اگر اُن ہیروں میں رام نہیں ہے تو اِس انعام کو کہاں دھروں۔ کیا کروں؟۔

कुन्दकुञ्ज ममुं पश्य सरसिरुह लोचने।

अमुना कुन्द कुञ्जेन सखि मे किं प्रयोजनम्॥

(सभातरंग)

{مو بغیر کُند (کُنج) کو مَیں کیا دیکھوں۔ طلب یہ کہ مُکند (حق تعالیٰ)

نہیں تو کُند (کُنج) کو آگ لگا دوں ؟}

بھجن کرتے وقت بے شرم دِل میں مکان کے۔ کھان پان کے اپنے ان کے اپنی جان کے دھیان آجاتے ہیں۔ جاہل کو اتنی سمجھ نہیں کہ یہ چیزیں دھیان کے قابل نہیں۔ دھیان میں لانے کے قابل تو ایک رام ہے۔

आत्मसंस्थं मनः कृत्वा न किञ्चदपि चिन्तयेत्

(गीता-६, २५)

(من کو ذات میں مقیم کرکے دیگر کچھ بھی خیال نہ کرے)

پربھو کا ڈیرہ ہمارے چِت میں لگے تو پھر کون سی اُمید ہے جو خود بخود پُوری نہ پڑی ہو۔ جب تک شئے میں سچائی دکھلائی پڑتی ہے یا اُس میں دِل لگائے ہُوئے ہو۔ سر پٹک مارو۔ شئے کبھی نہیں ملے گی اور نہ باعثِ مسرت ہوگی۔ جب کوشش سے یا فطرتاً اُس شئے سے دِل اُٹھتا ہے یعنی آتما رُوپی اگنی کُنڈ (آتشکدۂ ذات) میں وہ شئے پڑتی ہے۔ من میں نِگیہ ہوجاتا ہے۔ تو خود بخود شئے مطلوبہ حاضر ہو جاتی ہے۔ ہمالیہ ہَوا کی ٹھوکر سے گیند کی طرح شاید کبھی اُچھلنے بھی لگ پڑے۔ مگر اس قانون میں بال کے برابر بھی کبھی فرق نہیں آسکتا۔

ब्रह्म तं परादाद्यो ऽन्यत्रात्मनो ब्रह्म वेद,

क्षत्रं तं परादाद्योऽन्यत्रात्मनः क्षत्रं वेद,
लोकास्तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो लोकान्वेद,
देवास्तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो देवान्वेद,
वेदास्तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो वेदान्वेद,
भूतानि तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो भूतानि वेद,
सर्वं तं परादाद्योऽन्यत्रात्मनः सर्वं वेद,
इदं ब्रह्म, इदं क्षत्रम्, इमे लोकाः, इमे देवा, इमे वेदाः,
इमानि सर्वाणि भूतानि, इदं सर्वं यदयमात्मा ॥

(बृह० उप० २,४,६)

ابراہمن پن اُس کو پرے ہٹا دیتا ہے جو ماسوائے ذات براہمن پن سمجھتا ہے۔ کھشتری پن اس کو پرے کر دیتا ہے جو ماسوائے ذات کھشتری پن سمجھتا ہے۔ لوک اس کو پرے پھینک دیتے ہیں جو لوکوں کو ماسوائے ذات سمجھتا ہے۔ دیوتا اس کو پرے ہٹا دیتے ہیں جو دیوتاؤں کو ماسوائے حق سمجھتا ہے۔ وید اُس کو پرے کر دیتے ہیں جو ویدوں کو ماسوائے حق سمجھتا ہے جاندار بھی اُسے دُھتکار دیتے ہیں جو جانداروں کو غیر از حق خیال کرتا ہے۔ ہر ایک شے اُسے چھوڑ دیتی ہے جو ہر ایک شے کو غیر از ذات محسوس کرتا ہے۔ یہ براہمن پن یہ کھشتری پن یہ لوک یہ دیو یہ وید یہ سب جاندار لوگ اور سب اشیاء وُہی ہیں جو کہ یہ آتما یعنی ذاتِ حق ہے۔

بات بات میں رام دکھلاتا ہے کہ مَیں ہی ہُوں۔ جگت ہے ہی نہیں۔ اگر جگت یعنی دُنیا کی چیزیں ہیں تو صرف میری آنکھ کا محض اشارہ ہے۔ بھئی! سادھی اور دل کی یکسوئی تو تب ہوگی جب

تمہاری طرف سے مال و دھن۔ بنگلے مکان پر گویا ہل پھر جائے۔
بیوی بچے۔ دُشمن دوست پر سُہاگا چل جائے۔ سب صاف ہو جائے
رام ہی رام کا طُوفان آجائے۔ کوٹھے دالان بہالے جائے۔

अत्र पिताऽपिता भवति, माताऽमाता, लोका अलोकाः,
देवा अदेवाः, वेदा अवेदाः, अत्रस्तेनोऽस्तेनो भवति
भ्रूणहाऽभ्रूणहा, चाण्डालोऽचाण्डालः, पौल्कसो
ऽपौल्कसः, श्रमणोऽश्रमणः, तापसोऽतापसः॥

(बृह० उप० ४, ३, २२)

(یہاں یعنی ایسی حالت میں باپ باپ نہیں رہتا۔ ماں ماں نہیں
رہتی۔ لوک لوک نہیں رہتا۔ دیو دیو نہیں۔ وید وید نہیں رہتا۔ یہاں
چور چور نہیں۔ ہتیارہ ہتیارہ نہیں۔ چانڈال چانڈال نہیں۔
پولکس پولکس نہیں۔ بھکاری بھکاری نہیں اور تپسوی تپسوی
نہیں رہتا ہے)

جانے کو کوئی جگہ نہیں رہی تو پھر بھٹر دے من کو کہاں جانا
ہے؛ سہج سمادھی ہے۔

جیسے کاگ جہاز کو سُوجھت اَور نہ ٹھور
موہے تو ساوّن کے اندھے جیون سُوجھت رنگ ہرو

کیا مانگنا بھی اُپاسنا کا جُزو ہے

مانگنا دو قسم کا ہے ایک تو حقیر "مَیں" (اہنکار) کو مقدّم
رکھکر اپنی دُنیوی ترقّی اور خواہشوں کی سیری کے لئے مانگنا۔ اور

اور دوسرا گیان پراپتی (تحصیلِ معرفت) تتو درشن (انکشافِ ذات) اور ہری سیوا (خدمتِ خالق) کو پرم پریوجن (خاص مدعا) ٹھانکر روحانی ترقی مانگنا۔ پہلی قسم کی پرارتھنا (دعا) تو گویا ایشور کو حقیر اسمار و اشکال (جیو) کا خدمتگار بناتا ہے۔ اپنی خدمت کے لئے ایشور کو بلاتا ہے۔ اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ دوسری قسم کی پرارتھنا (دعا) راہِ راست پر جانا ہے۔

آتما میں چت کے لین (دل کے محو) ہونے پر جو بھی سنکلپ (خیال) ہوگا۔ ستیہ (پورا) تو ضرور ہی ہوجائے گا۔ لیکن اگر وہ سنکلپ (خیال یا ارادہ) جہالت۔ ادھرم اور خود غرضی سے بھرا ہوا ہے تو کٹیلے زہریلے انکر (کوپل) کی طرح اُگ کر نتیجہ قبیحہ کا باعث ہوگا۔ مادمنی اور خواہشوں کی سیری کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرنا (دعا مانگنا) میلے تانبے کے برتن میں دودھ کو بھرنا ہے۔ دکھ پاکر جو سیکھوگے تو پہلے ہی ناپاک خواہشوں کو کیوں نہیں ترک کردیتے۔ خیالاتِ بد سے اوروں کا بھی بُرا ہوتا ہے اور اپنی بھی خرابی۔ نیک ارادے پاک جذبات اور گیان بگیان (معرفت و حقیقت) کے حاصل کرنے میں نہ صرف اپنا ہی بھلا ہوتا ہے بلکہ اوروں کا بھی۔ من میں ستوگن۔ شانتی (سکون)۔ آنند (سرور) اور شدھی (پاکیزگی) ہو۔ تو ہمارے کام خود خدا کے کام ہوتے ہیں۔ پورے ہوتے دیر لگ ہی نہیں سکتی۔ بھاگوت پوران میں ایک جگہ یہ شلوک دیا ہے

देवासुर मनुष्येषु ये भजन्त्य शिवं शिवं।
प्रायस्ते धनिनो भोजा न तु लक्ष्म्याः पतिं हरिम् ॥

(دیو۔ اسُر اور منشیوں میں جو بدقسمت بھی شو کی پوجا کرتے ہیں وے مالدار ہوجاتے ہیں۔ نہ کہ لکشمی پتی یعنی وشنو کی پوجا کرنے والے)

یعنی جو بھی کوئی تیاگی (تارک) وشنو کی اُپاسنا کرتے ہیں وہ اکثر

صاحبِ دولت ہو جاتے ہیں۔ اور جو لکھشمی پتی (وِشنو) کے اُپاسک ہیں وے اکثر غریب رہ جاتے ہیں۔ اس شلوک میں شِو اور وِشنو کی چھوٹائی بڑائی دکھانے کا مطلب نہیں ہے۔ شِو اور وِشنو تو در اصل ایک ہی چیز ہیں۔ مگر منشا یہ ہے کہ جن لوگوں کے دِل میں شِو رُوپ تیاگ اور بیراگیہ (بے تعلقی) بسا ہے۔ نعمت۔ دولت اور خوش قسمتی اُس کے پاس خود آتی ہیں۔ اور جن لوگوں کے دِل دھن دولت کی لاگ میں پھنسے ہیں وہ مفلسی کے گھر بنے رہتے ہیں۔ جیسے کوئی سورج کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنے سایہ کو پکڑنے دَوڑتا ہے۔ سایہ اُس سے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ کبھی قابُو میں نہیں آتا۔ اور جو کوئی سایہ سے مُنہ پھیر کر سُورج کی طرف دوڑے تو سایہ اپنے آپ ہی پیچھے بھاگتا آتا ہے۔ ساتھ چھوڑتا ہی نہیں۔

بھاگتی پھرتی تھی دُنیا جب طلب کرتے تھے ہم
اب جو نفرت ہم نے کی وہ بے اختیار آنے کو ہے

کون پرارتھنا (دُعا) ضرُور سُنی جاتی ہے

وہ پرارتھنا ضرُور سُنی جاتی ہے جس میں ہماری خود غرضی کا حصّہ اتنا کم ہو کہ گویا وہ ستیہ سوبھاؤ الیشور (حقِ مجسّم) کا اپنا ہی کام ہے۔ اگر اُپاسنا کے وقت مارے آنند کے چت کی یہ حالت ہو رہی ہو۔

यतो वाचो निवर्तन्ते अप्राप्य मनसा सह ॥

(तैत्ति० उप० २,४)

(جہاں سے تمام کلام مع من کے بغیر پہنچے واپس لوٹ آتے ہیں)

تو یہی حالت برہم اوستھا (حالتِ اُلُوہیّت) ہے۔ اور اسی وجہ سے تکمیلِ خواہش و ارادہ خود بخود ہو جاتی ہے۔ یہ تو رہی نہایت اعلیٰ درجہ کی اُپاسنا۔ اُپاسنا کی ذرا ادنیٰ سی حالت بچّے کا سا یقین اور اعتقاد ہے۔ اور یہ نشٹھا (حالت) بھی کیا پیاری پیاری اور زبردست ہے۔ بچّہ اپنی ماں کو لا انتہا طاقت والا مانتا ہے۔ اور اُس کی طاقت کو اپنی طاقت سمجھکر ماں کی گود میں بیٹھا ہُوا شاہنشاہی کرتا ہے۔ ریل کو بھی دھمکا لیتا ہے۔ ہوا اور پرندوں پر بھی حُکم چلاتا ہے۔ دریا کو بھی کوسنے لگتا ہے اور کوئی چیز ناممکن جانتا ہی نہیں۔ ماہتاب اور آفتاب کو ہاتھ میں بھی لیا چاہتا ہے۔

؎ چاند کھلونہ لے دے ری مَیّا - چاند کھلونا لے دے

مبارک ہیں وے خوش بخت جن کا اس زور کا وِشواس یا اعتقاد سچ مچ قادرِ مُطلق باپ میں جم جائے۔ جو کچھ بھی درکار ہو فوراً دیو (پرمیشور) کا دامن پکڑا اور کروا لیا۔ دُودھ مانگنا ہو تو دیو سے۔ روٹی کپڑا مانگنا ہو تو دیو سے۔ کیا اچھّا کہا ہے۔

جگ جاچیئے کوؤ نہ جاچیئے	جے جِیا جاچیئے جانکی جان ہی رے
جہیں جاچت جاچکتا جَر جائے	جہیں جارے جور جہان ہی رے

دُکھی دُشٹ (پریشان بد معاش) اور رنگیلے متوالے مست میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کے دِل میں خواہش کا جُزو اُوپر ہے اور عشق کا جُزو نیچے۔ اور دُوسرے کے دِل میں رامؔ اوپر ہے اور کام۔ نیچے۔ ایک اگر ساکشر (عالِم) ہے تو دُوسرا اُلٹ پھیر کر راکشش (ملعون) ہے۔ جب پریم اور تیاگ کا انش (محبت اور ترک کا جُزو) اُپاسنا میں مانگنے

کے جُزو سے زیادہ ہو تو وہ مانگنا بھی ایک طرح دینے ہی کے برابر ہے۔

پر بھائی! سچ بات تو ہے یوں کہ مانگنا سچّی اُپاسنا کا کوئی جُزو نہیں۔ ہاں دینا (فیاضی) تو عین اُپاسنا ہے۔ جب اپنے مطلب کے لئے مَیں تمہاری خدمت کروں تو اس میں بھکتی (محبّت) کا ہے کی۔ وہ تو دوکانداری ہے یا ٹھگ بازی۔ گداگر بھکھاری کو کوئی پاس نہیں چھُونے دیتا۔ پرمیشور تو بادشاہ ہے۔ بھکھ منگے کنگال بن کر اُس کے پاس جاؤ گے تو دُور ہی سے دُر دُر پڑی ہوگی۔ بادشاہ سے ملنے چلے ہو۔ پرے پھینکو میلے کچیلے پھٹے پُرانے خواہشات کے چیتھڑے۔ خانوں کے خان مہان جب تک تم بادشاہ نہ بنوگے بادشاہ کے پاس نہیں بیٹھ سکتے۔ خواہش اور آرزو کی پونک اُڑا دو۔ جم کر بیٹھو تیاگ (ترک) کے تخت پر۔ زیب تن کرو ویراگیہ (لاتعلقی) کے موتی۔ پہن لو گیان (علمِ معرفت) کا تاج۔ اور وہ تمہارے پاس سے کبھی ہلجائے تو مجھے باندھ لینا۔

ٹُونے کامن کرکے نی! + مَیں پیارا یار مناوانگی

اس ٹُونے نُوں پڑھ پھُوکانگی	سُورج اگنی جلا وانگی
سات سمندر دِل دے اندر	دِل سے لہر اُٹھاوانگی
بدلی ہو کر چمک ڈراوان	ہن بادل گھر گھر جاوانگی

ٹُونے کامن کرکے نی! + مَیں پیارا یار مناوانگی

عشق انگیٹھی اسپند تارے	سُورج اگنی چڑھا وانگی
لا سواں شوہ نُوگل اپنے	تد مَیں نار کہاوانگی

ٹُونے کامن کرکے نی! + مَیں پیارا یار مناوانگی

نائیں بیاہی نائیں کنواری || بیٹا گود کھلا وانگی
بُلّھا لامکاں دی پوڑی || اُتّے بہکے ناد بجا وانگی
ٹونے کامن کرکے نی! + میں پیارا یار منا وانگی

اُپاسنا اور گیان (عبادت و معرفت)

اُپاسنا ایسی ہے جیسے ضرب کی مثال حل کرنا۔ اور گیان یہ ہے کہ جبر و مقابلہ (الجبرا) تک پہونچکر اُس ضرب کے طریقہ کا سبب وغیرہ بھی جان لینا۔ اُپاسنا سادھن یا طریقہ ہے اور گیان سِدھ اوستھا (حالت رسیدہ)۔ اُپاسنا میں کوشش کے ساتھ اندر باہر برہم دیکھا جاتا ہے۔ گیان وُہ ہے جہاں بغیر کوشش فطرتاً اندر تو روم روم سے اہم برہم اسمی (انالحق) کے ڈھول دیگر تمام خیالات کو دبادیں۔ اور باہر ذرہ ذرہ تت توم اسی (انتُ الحق) یعنی "تُو ہی حق ہے" کا آئینہ دکھاتا ہُوا غیر بینی کو بھگا دے۔ یہ گیان ہی اصلی تیاگ (ترک) ہے۔

त्यागः प्रपञ्चरूपस्य चिदात्मत्वावलोकनात्।
त्यागो हि महतां पूज्यः सद्यो मोक्षमयो यतः॥

(انکشافِ ذات کے غلبہ سے نام و اشکال کا چھوڑنا ہی ترک ہے۔
جس ترک سے نجات حاصل ہو وُہی بزرگوں سے قابلِ تعظیم تسلیم کیا گیا ہے)

جہاں شُرتی نے تیاگ یعنی ترک کا سبق دیا ہے۔

"तेन त्यक्तेन भुञ्जीथा" (ایشا واسیہ اُپنشد)

(اُس نام رُوپ سنسار کے تیاگ سے تو سُرورِ ذات میں مگن ہو

وہاں ترک کی پہچان اتنی ہی بتلائی ہے

ईशावस्यमिदं सर्वं यत्किञ्च जगत्यां जगत् ॥

(ईश० उप० १)

جو کچھ دِکھے جگت ہیں سب ایشور میں ڈھانپ
کرو چَین اس تیاگ سے دھن لالچ سے کانپ

اوپر اوپر کے ترک اس اصلی ترک کے وسیلہ ہیں۔ اس تیاگ رُوپی برہم درشٹی (ترک مجسّم حق بینی) کو کوشش سے کرنا اُپاسنا ہے۔

اب یہ ترک مجسّم اُپاسنا بھی اور قسم کے ترکوں یا دانوں کی طرح ہوگی۔ کریں یا نہ کریں۔ کسی کو پیسہ دیں یا نہ دیں۔ ہماری مرضی پر ہے" جو ایسا سمجھتے ہیں دھوکے میں ہیں۔ یہ ترک مجسّم اُپاسنا ضروری ہے۔ ضروری کیوں؟ اس لئے کہ اَور کہیں ٹھنڈھ (شانتی) پڑنے کی نہیں۔

خیال تب تک یکسُو نہیں ہوسکتا جب تک دِل میں کبھی یہ اُمید رہے کبھی وُہ خواہش۔ شانت وہ ہوسکتا ہے جسے کوئی فرض و غرض کھینچ اور گھسیٹ نہ رہے ہوں۔ اپنے آپ تو ان آرزؤں نے پیچھا چھوڑنا ہی نہیں۔ جب بھی دامن چھُوٹے گا آپ چھُڑانا پڑے گا۔ اس لئے جینے کی اُمید کو بھی چھوڑ کر من کو برہم آنند میں ڈالدو۔ یعنی دِل کو سرُورِ ذات میں مستغرق کردو۔ ایک دن تو شریر (جسم) نے جانا ہی ہے۔ ہمیشہ کے لئے پٹّا تو لکھواکر لائے ہی نہیں تھے۔ آج ہی سے سمجھ لو کہ یہ ہے نہیں۔ اور سُرورِ ذات کے بحر میں شک اور شُبہوں کو دُور کرکے کُود پڑو۔

تعجّب یہ ہے کہ جب ہم ان تمنّاؤں کو چھوڑ ہی بیٹھتے ہیں وہ اپنے آپ پوری ہونے لگ پڑتی ہیں

गङ्गातीरे हिमगिरिशिला बद्धपद्मासनस्य।
ब्रह्मध्यानाभ्यसनविधिना योगनिद्रां गतस्य॥
किं तैर्भाव्यं मम सुदिवसैर्यत्र ते निर्विशंकाः।
कण्डूयन्ते जरठ हरिणाः शृङ्गमङ्गे मदीये॥ (भर्तृहरि)

ایہ گنگا کنارے ہمالیہ کی شِلا پر بدھ پدم آسن لگائے ہوئے برہم دھیان کا ابھیاس (مشق) کرتے ہوئے یوگ نِدرا میں مستغرق میرے جسم کو بوڑھے بوڑھے ہرن بے خوف ہوکر اپنے اجسام سے کھجلادیں۔ کیا ایسے اچھے دن میرے کبھی ہوں گے؟)

جب دِل میں تیاگ (ترک) اور گیان (عرفان) بھرتا ہے اور شانت ساکشی (شاہد خاموش) بن کر وِچار شکتی (observation- یعنی قوّتِ مشاہدہ) آتی ہے۔ وُہی دُنیا جو مایا کا پردہ ہو رہی تھی رام کی جھانکیوں کی لگاتار دھارا بن جاتی ہے۔ "درشن دھارا" کہلا سکتی ہے۔ ایک رس (لگاتار) مظہرِ حق ہوجاتی ہے۔ وہ لوگ جو بھید واد اور ابھید واد (یگانگت و بیگانگت) کے مباحثوں میں محو ہیں اُن کو جھگڑنے دو۔ اُس حالت کے لئے یہ عقل کی چھان بین بھی بیجا نہیں۔ مگر جب عقل یعنی سُوکشم شریر کی تہ سے اُتر کر کارن شریر (subjective mind, ganglionic consciousness) میں شمعِ عرفان جلتی ہے تو یہ جھگڑے طے ہوتے ہیں۔ اور جب تک انسان کے اندرون دِل (گویا ساتویں پردہ) میں رام کا ڈنکا نہیں

بجتا۔ تب تک اُسے نہ اُپاسنا ہی مزا دے گی نہ گیان۔ نہ وید کی سنگھتا کا ارتھ آئے گا۔ نہ اُپ نشد کا۔

سہ جیسے بھوکے بھوک اناج	ترکھاونت جل سیتی کاج
جیسے کامی کامنی پیاری	ویسے نامے نام مراری

(جیسے بھوکے کو غذا کی بھوک۔ پیاسے کو پانی کی پیاس اور شہوت پرست کو عورت پیاری ہے۔ ویسے ہی بھگت (سچے عاشق) کو پرماتما کا نام پیارا ہے)

ٹیلیفون کے ذریعہ پیارے نے باتیں کیں۔ ٹیلیفون پیاری لگنے لگی۔ جب تک موہن دُوسری جگہ ہے ٹیلیفون کی بڑی قدر ہے۔ جب موہن اپنے گھر آگیا تو اب ٹیلیفون سے کیا؟ یہ دوست متعلقین۔ راج۔ دھن دولت سب ٹیلیفون ہیں۔ جن کے ذریعہ رام ہم سے بولتا تھا۔ جب تک رام نہیں ملا تھا دِل کانپتا تھا کہ ہائے اِن کے بغیر کیسے نبھے گی؟ وہ پیارا گھر آگیا۔ آملا۔ اب تو اُے دوستو! مجھکو بھلے چھوڑ دو۔ متعلقین! تیاگ جاؤ۔ دھن دولت! لُٹ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ عزّت آبرو! بے شک پیچھا دکھاؤ۔ یہاں بیٹھے کیا کرتے ہو۔ راجہ جی! نکال دو اپنے دیش سے۔ دھر رکھو اپنی دُنیا۔

سہ راجہ رُوٹھے نگری راکھے اپنی + میں ہری رُوٹھے کہاں جانا

سہ اب دلبر گھر آیا ہے	نیَنوں کا فرش بچھاوُوں گی
گُن اوگُن پر دھر چنگاری	تَیہ میں دھوپ دُھکاؤُوں گی
پرانوں کی میں سیج کروں گی	ہری کو گلے لگاؤوں گی

شِووہم بھاؤ (اَدویت درِشٹی یعنی اعتقادِ انالحق) کے بغیر سمّیک شُدّھی (کامل صفائی قلب) نہیں ہوگی

شِووہم (انالحق) تو سب ہی کہتے ہیں۔ کیا بھید وادی (भेदवादी) کیا ابھید وادی (अभेद वादी)۔ کیا بھگت کیا کرم کانڈی۔ کیا ہندو کیا اور کوئی۔ سب ہی اپنے دِل کے اندر سے اپنے آپ کو بڑے سے بڑا مانتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں۔ وہ بھید وادی بھگت جو ابھی مندر میں دیو کے سامنے اپنے تئیں نیچ پاپی ادھم مُورکھ (ذلیل۔ گُنہگار۔ حقیر اور جاہل) کہتے کہتے تھکتا نہیں تھا۔ جب باہر بازار میں نکلا تو اُسے کوئی "ارے او نیچ" کہکر پکارے تو سہی۔ پھر دیکھو تو تماشہ۔ کچہریوں میں کیا کیا حالت ہوتی ہے۔

اندر کا شِووہم (انالحق) کبھی مر ہی نہیں سکتا۔ مرے کیونکر؟ سانچ کو آنچ کہاں؟ پر ہاں اپنے تئیں جسم وغیرہ رکھکر جو شِووہم (انالحق) کا ملع اُوپر چڑھاتا ہے۔ یہ تو پانڈرکؔ[1] کی طرح جھوٹا وِشنو بناتا ہے۔

---

[1] پنڈر دیش کا ایک راجہ ہے جو جراسندھ کا رشتہ دار تھا۔ اِس کے باپ کا نام بھی وسودیو تھا اس لئے یہ اپنے کو واسدیو کہتا تھا۔ راجسوئیہ یگیہ میں بھیم نے اِسے ہرایا تھا۔ یہ اپنی شکل شری کرشن کی طرح بنائے رکھتا تھا۔ رشی نارد سے شری کرشن کی تعریف سُنکر یہ بہت ناراض ہُوا اور کہنے لگا کہ سوائے میرے کوئی دُوسرا واسدیو ہے کہاں؟ اس نے ایکلویہ وغیرہ بہادروں کے ہمراہ دوارکا پر چڑھائی کی۔ لیکن شری کرشن کے ہاتھ سے یہ مارا گیا۔

اسی طرح واشدیو وہم (خدا ہم) ساری دُنیا خودی کی زُبان میں بول رہی ہے۔ یہ تو مَیلے تانبے کے برتن میں کھیر پکانا ہے۔ اور زہر سے مرجانا ہے۔ ویدانت کا اُپدیش تو یہ ہے کہ دُودھ تو پیا جائے مگر مَیلے تانبے کے برتن میں نہیں۔ دیہہ ابھمان (انانیت) تو اندر۔اور شِوہم (انالحق) کا اُوپر اُوپر سے مُلمع تو ہو نہیں۔ بلکہ شِوہم (انالحق) تو اندر ہو۔اور اندر سے بطور آگ بھڑک بھڑک کر دیہہ ابھمان (خیالِ انانیت) کو جلادے۔ یہ ہوگیا تو پھر دیہہ ابھمان (خیالِ جسمانیت) تنگ دِلی۔ خوف و غم کی جگہ کہاں؟ اس بھید (راز)۔نہیں نہیں۔ابھید یعنی یگانگت کو جس نے جانا بے دھڑک ہوگیا۔ فیاضئ مجسّم بن گیا۔ قوت۔ طاقت اور جلال کا دریا ہوکر بہ نکلا۔ کوئی بھی بل (زور) ہو۔کہاں سے آتا ہے؟ اُس فیاض دلی سے جس میں جسم و جاں کی قُربانی دینے کو ہم تیار ہوں۔ سر ہتھیلی پر لئے چلیں۔ دیکھو یارو! جب ज्योतिषां ज्योतिः نُورُ العلیٰ نُور اپنے آپ کو پایا۔ تو سر سے گُذر جانے کی بہادری خود بخود کیسے نہ آجائے گی؟

اب ذرا دھیان دے کر سُننا۔ مَیں تُم سے کچھ مانگتا تو نہیں؟

پُوت کہے اودھوت کہے۔رجپُوت کہے۔جُلاہا کہے کوؤ

کاہُو کی بیٹی سے بیٹا نہ بیاہوں | کاہو کی جات بگاڑوں نہ سوؤو
مانگ کے کھاؤں شمشان میں سوؤوں | لینے کو ایک نہ دینے کو دؤو

کسی کے ٹکے دینے نہیں۔کسی سے کوڑی لینی نہیں۔ لاگ لپٹ سے کیا؟ کڑوا مانو۔ میٹھا مانو۔سچ ہی کہُوں گا۔ پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر پکار کر رام سُناتا ہے۔ دُنیا کو سچ مان کر اُس میں کودتے ہو۔

پھوس کی آگ میں سُلگ سُلگ کر مرتے ہو۔ یہ سخت ریاضت کیوں؟ اس سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ دِیہ ابھمان (جسمانیت) کی کیچڑ میں تم اپنے شُدھ سچدانند سوُروپ (ہستی و علم و سُرورِ ذات) بھُول کر پھنستے ہو۔ دلدل میں دھنستے ہو۔ گل جاؤگے۔ برہم (حق) کو بھُلا کر دُکھوں کو بُلاتے ہو۔ سر پر گولے برساتے ہو۔ او گل اجل جاؤگے۔ ستیہ کو جواب دے کر جھُوٹے نام روپ میں کیوں دھکّے کھاتے ہو۔ جن کو سفید ماکھن کا پیڑا سمجھے ہو۔ یہ تو چُونے یعنی قلعی کے گولے ہیں۔ کھاؤ تو سہی۔ پھٹ جائیں گی انتڑیاں۔ جھوُٹ بولنے والے کا بیڑا غرق۔ میں سچ کہتا ہُوں۔ دُنیا کی چیزیں دھوکا ہیں۔ ہوش میں آؤ۔ برہم ہی برہم ستیہ ہے۔

جیٹھ۔اساڑھ کی دُوپہر کے وقت بھاڑ کی طرح تپتے ہُوئے ریگستان میں ہنکی مُنی جب بہت زیادہ بے تاب ہو رہا تھا اور اُس نے پاس کے ایک گانوں میں جاکر آرام کرنا چاہا۔ اُس وقت اُسے وشِشٹھ بھگوان کے درشن ہُوئے۔ وشِشٹھ جی کہتے ہیں "بیشک اس گرمی میں ہزار بار جل مر، پر وہاں مت جا۔ جہاں تن سے تندُور میں پڑے گا۔ یہاں پر تو جسم ہی جلتا ہے۔ وہاں جہالت کی تپش سے تو سارے کا سارا سڑے گا"

वरमंध गुहा हित्वं शिलान्तः कीटता वरम्।
वरं मरौ पंगु मृगो न ग्राम्य जन संगमः

(योगवासिष्ठ)

(اندھیرے غار کا سانپ ہونا۔ پتھر کے اندر کا کیڑا ہونا یا ریگستان

بیابان میں لنگڑا ہرن ہونا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ گنواروں
کے ساتھ صحبت ہو)

آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی۔ جب کبھی بھُولے سے کسی دُنیوی شئے میں رغبت یا نفرت کا خیال جماتا ہُوں۔ نفع نُقصان۔ چھُٹائی بڑائی میں دِل لگاتا ہُوں۔ تندرُستی (صحتِ جسمانی) وغیرہ کو بڑی بات گردانتا ہُوں۔ کسی آدمی کو یگانہ یا بیگانہ ٹھانتا ہُوں۔ کسی شئے آیندہ یا موجودہ کو سچ مانتا ہُوں۔ اپنے آپ کو محدود جسم وغیرہ جانتا ہُوں۔ یعنی ذاتِ پاک کو بھُول کر جسم میں جم کر غیر بینی سے دیکھتا اور سوچتا ہُوں۔ تو ضرور بالضرور مصائبِ ثلاثہ میں سے کوئی نہ کوئی آن گھیرتی ہے۔ میری نظر تھوڑی گرے تو مصیبت بھی تھوڑی ہوتی ہے۔ بہت گرے تو مصیبت بھی بہت۔ اس کوتاہ نظری۔ حقیر خیال کا نتیجہ غم و الم ملے بغیر کبھی نہیں رہتا۔ جب جسم وغیرہ کے خواب کو پرے پھینک غیر بینی کو اُڑا کر آتم درشٹی (چشمِ رُوحانی) کھولتا ہُوں۔ تو دُنیا کے عناصر ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کسی کے اپنے ہاتھ پَیر۔ جس طرح چاہے ہلا لے۔ قدرت کی چال میری آنکھوں کا اشارہ ہو جاتی ہے۔ یہی قانون دیگر تمام لوگوں کے دُکھ سُکھ (رنج و راحت) لانے میں بھی حاوی ہے۔ اس کو نہ جان کر لوگ مرتے ہیں۔ یہ قانون کہیں کچا سُوت نہ سمجھ لینا۔ اناڑی کا کاتا ہُوا۔ یہ وہ لوہے کا رسّہ ہے جس سے اِندر اور سُورج بھی باندھے پڑے ہیں۔ بحرِ عالم میں یہ وہ ایک پتھر کی چٹان ہے جس کو نہ دیکھ کر مہاراجے۔ پنڈت۔ دیو اور دانو اپنے جہازوں کو توڑ بیٹھے ہیں۔ خاندانوں کے خاندان۔

قوموں کی قومیں۔ مُلکوں کے مُلک اسی قانون کو بھُلا کر خاک میں مِل چُکے ہیں۔

اجگر (اژدہا) نے سمجھا کہ کرشن کو کھا ہی لوں گا اور پچا جاؤں گا۔ لو کھا گیا۔ پر پیٹ کے اندر چلیں کٹاریاں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آتشبازی کے انار کی طرح اژدہا اُڑ گیا۔ اور کرشن وَیسے کا ویسا باقی رہا۔ کیا تم اُسی ستیہ رُوپی (حقیقتِ مجسّم) قانون کو کھا سکتے ہو؟ دَبا سکتے ہو؟ چھُپا سکتے ہو؟ اس ستیہ (حقیقت) کو کسی کا لحاظ نہیں۔ اور تو اور خود کرشن کے خاندان والے جب ستیہ (حقیقت) کو مخول میں اُڑانے لگے اور اپنی طرف سے گویا اُسے رگڑ رگڑ کر ریت میں مِلا بھی گئے تب بھی یہ ستیہ (حقیقت) خاک میں مِل کر پھر اُگا۔ اور کیا کرشن اور کیا یادَوْ سب کے سب کو ہڑپ کر گیا۔ دوارکا پر پانی پھر گیا۔ بھائی! مُردہ کو اُٹھا کر جو چلّایا کرتے ہیں۔ رام رام سَتیہ ہے۔ آج پہلے ہی سمجھ جاؤ۔ ابھی سمجھ لو تو مرو گے ہی نہیں۔ مرنے کے وقت گیتا تمہارے کِس کام آئے گی؟ اپنی زندگی کو ہی بھگوت کا گیت (نغمۂ یزدانی) بنا دو۔ مرتے وقت دِیوا (چراغ) تمہیں کیا اُجالا کرے گا؟ دِل میں عرفانِ حق کی شمع ابھی روشن کر دو۔

कृष्ण त्वदीय पद पंकज पञ्जरान्ते ।
अद्यैव मे विशतु मानस राजहंसः॥
प्राण प्रयाण समये कफ़ वात पित्तैः।
कण्ठावरोधन विधौ स्मरणं कुतस्ते ॥

(पाण्डव गीता)

(اے بھگوان کرشن! آپ کے قدوم میمنت لزوم کے قفس میں میرا طائرِ دل آج ہی بیٹھ جائے۔ کیونکہ بروقت نزع کف۔ بات۔ پت (سودا، سفرہ۔ بلغم) سے گلا رُک جانے کے سبب سے صحت دل نہ ہونے پر آپ کی یاد کیسے ہو سکے گی۔)

पतितः पशुरपि कूपेनिःसर्तु चरणाचालनं कुरुते।
धिक्त्वा चित्त भवाब्धेरिच्छामपि नोविभर्षिनिःसर्तुम्॥

(کنواں میں گرا ہُوا حیوان بھی وہاں سے نکلنے کے لئے پیروں کو چلاتا ہے۔ لیکن اَے دِل! اس بحرِ عالم میں پڑے ہُوے تم اُس سے نکلنے کی خواہش تک نہیں کرتے۔ اس لئے تمہیں دھکار ہے)

ایک جولاہا بھوکوں مرگیا۔ اُس کی ماں اُس مُردے کے مُنہ اور پاخانہ کے مقام میں گھی لگاکر سب کو دِکھاتی تھی "دیکھو میرا پُتر بھوکا نہیں مرا۔ گھی کھاتا اور گھی ہگتا گیا ہے۔" پیارے! اُدھاری نجات تو جولاہے کا گھی ہے۔ روکڑ مُکتی (نقدِ نجات) یعنی جیون مُکتی جب مِل سکتی ہے تو کیوں نہ لیں؟

سچّا اُپاسک (عاشقِ صادق)

بھئی! سچّی کہیں؟ اُپاسک اور بھگت ہونے کا درجہ ہم کو تو نصیب نہیں۔ ہم نے تو سچّا اُپاسک ساری دُنیا میں ایک ہی دیکھا ہے۔ باقی بھگتوں۔ رشیوں۔ مُنیوں۔ پیروں پیغمبروں کا "پریم مئے اُپاسک" کہلانا ایک کہنے ہی کی بات ہے۔ وہ سچّا اُپاسک (عاشق) کون ہے؟ جس کو لوگ اُپاسیہ دیو (معشوق) کہتے ہیں۔ کیونکر؟ عاشق یار کی طرح

چھُپ چھُپ کر چھیڑتا ہے۔ آہستہ آہستہ خیال کا دامن (چِت کا آنچل) کھینچتا ہے۔ طرح طرح کے بھیس بدل کر رنگ و رُوپ دھارن کرکے سوانگ بھر کے پردے کی اوٹ میں نینوں کی چوٹ مار جاتا ہے۔ جب دِل ماسوائے حق میں کہیں لگ جاتا ہے۔ تو ہا! پھر اُس کے ناز کرنے یعنی رُوٹھنے کا کیا کہنا؟ ابرُو خم کئے کیسا کیسا غصّہ دکھاتا ہے۔ جب خیال کہیں راستہ میں رُک جائے۔ تو چٹکیاں بھرتا ہے۔ دم تو لینے نہیں دیتا۔ صرف اُس رام ہی کے نِشکام (بے غرضانہ) بسترِ استراحت کے علاوہ آرام تو نام کو بھی اور کہیں نہیں ملنے پاتا۔

اَے پیارے! اب عاشق ہوکر رُوٹھنا مچلنا کیسا؟ اب مزا چکھا کر بھاگتے ہو۔ ہے پران ناتھ! اِدھر دیکھو! وہ دُشٹ ششوپال آپڑا۔ چھین کرلے چلا تمہاری رُکمنی (حقانی) کو۔ کچھ شرم و حیا بھی ہے؟ یہ تو وقت ناز کرنے کا نہیں۔ آؤ آؤ۔

त्वमसि ममभूषणं, त्वमसि ममजीवनं,त्वमसि मयजलधिरत्नं।
भवतु भवतीह मयि सतत मनुरोधिनस्तात्र ममहृदयमतियत्नं॥

(जयदेव)

(آپ ہی میرے زیور ہیں۔ آپ ہی میری زندگی ہیں۔ آپ ہی میرے سمندر سے نکلے رتن ہیں۔ آپ ہی اس دُنیا میں میرے اوپر لگاتار مہربانی کرنے والے ہیں۔ لہذا آپ میں میرا دِل نہایت کوشش سے لگ جائے۔)

سُورج کو بارہ مہینے روشنی دے دی مُفت میں۔ ہم کو آٹھوں پہر نجانند (سُرورِ ذات) دیتے کنگال تو نہیں ہو چلے؟ اَے پربھو!

اب تو مجھ سے دو دو باتیں نہیں نبھ سکتی۔ کھانے پینے کپڑے گُٹیا کا بھی خیال رکھوں اور دُلارے کا بھی مُنہ دیکھوں۔ چُولہے میں پڑے پہننا۔ کھانا۔ جینا۔ مرنا۔ کیا ان سے میرا نباہ ہوتا ہے؟ میری تو مدھوکری (روٹی) ہو تو تُم۔ کملی ہو تو تُم۔ کُٹی ہو تو تُم۔ دوا ہو تو تُم۔ جسم ہو تو تُم۔ جان ہو تو تُم۔ جسم وغیرہ کو رکھنا چاہتے ہو تو پڑے رکھو۔ اَکرتا بن رہے ہو۔ نکمّے بیٹھے کیا کرتے ہو؟ کرو سیوا (خدمت)

آنکھیں لگا کے تُجھ سے نہ پلکیں ہلائیں گے
کھیلیں گے کھیل ہم تُمہیں آگے نچائیں گے

वयꣳसोम व्रते तव मनस्तनूषु बिभ्रतः ॥

(यजुर्वेद)

تُمہاری خاطر ہے پربھو! یہ من تھا تن بیچ

لے لو اپنی چیز۔ وار وار کر پھینک دو اپنے "بے نام" پر۔ تھالی بھر بھر کر ہیرے جواہرات تُجھ پر نثار کر کے پھینکے گئے۔ جن کو لوگ تارے۔ نکشتر۔ گرہ۔ چاند۔ سورج اور دُنیا کہتے ہیں۔ لُوٹ لو نجُومیو! لُوٹ لو سائینسدانو! لُوٹ لو سوداگرو!۔ راجاؤ! لُوٹ لو۔ پرہائے! مار ڈالو تو بھی میں تو یہ مال نہیں لُوں گا۔ ڈولی پر وار کر پھینکا ہُوا ٹکا لُوٹنا کوئی اور لوگوں کا کام ہے۔ میں تو وُہی لُوں گا وُہی پردہ والا دُلارا پیارا۔

اُپاسنا کے منتر

تاثیر اُس اُپاسنا کی ہوتی ہے جو دِل سے نکلے۔ گلے کے اوپر

سے نکلے ہُوئے اُپاسنا کے کلام تو گویا مخول بازی ہیں اور پرمیشور کو جُھٹلانا ہے۔ جیسی دِل کی حالت ہوگی۔ سچّی اُپاسنا کی ویسی صورت ہوگی۔

(۱) ودیارتھی (طالبِ حق) کی پرارتھنا (دُعا)

(क) ये त्रिषप्ताः परियन्ति विश्वा रूपाणि बिभ्रतः।
वाचस्पतिर्बला तेषातन्वो अद्यदधातु मे॥
पुनरेहिवाचस्पते देवेनमनसासह।
वसोष्पतेनिरमय नय्येवास्तु मयिश्रुतम्॥
इहेहे वाभिवतनूभे आर्त्नीइवज्यया।
वाचस्पतिर्नियच्छतु मय्येवास्तु मयिश्रुतम्॥
उपहूतो वाचस्पतिरुपास्मान् वाचस्पतिर्व्हयताम्।
संश्रुतेन गमेमहिमाश्रुतेनविराधिषि॥

(अथर्व वेद)

(ویدرُوپی بانی کا پالک (آج) میدھا وغیرہ پیدا کرتے وقت کُل جڑ چیتیں (ساکن و متحرّک) کائنات کو واجب پھل سے پرورش کرتے وقت۔ ہر روز ہر برس۔ ہر کلپ۔ ہر جسم میں تین اور سات کی تعداد سے نامزد دیوتاؤں کی غیر معمولی طاقت کو میدھا وغیرہ چاہتے ہُوئے میرے جسم میں داخل ہو۔ تین سے مراد پرتھوی وغیرہ تین لوک اور اُن کے ادھشٹھاتا (اگنی۔ ہَوا۔ آفتاب) ستوگن۔ رجوگن تموگن۔ برہما وشنو مہیش وغیرہ جو تین تین تعداد سے متصف ہے لی جاتی ہے۔ سات سے مُراد سپت رشی۔ سپت گِرہ۔ ساتوں مردگن۔

ساتوں لوک وغیرہ سات تعداد والے لئے جاتے ہیں۔

ہے واچسپتی (वाचस्पते)! وید مجسّم بانی کے پالک (پوشک یا پرورش کنندہ)! برہم بھاؤ رُوپی پھل کے دینے کی مہربانی سے متصف ہوکر میرے پاس آیئے۔ ہے وسوشپتی! گاؤں حیوان وغیرہ دھن کے سوامی (مالک)! آپ میں بھُومی وغیرہ بیشمار پھل دینے کی طاقت ہے۔ اس لئے ہم سے چاہے ہُوئے بیشمار پھلوں کو لگاتار دیتے رہنے سے ہم لوگوں کو سُکھ دیجئے۔ آپ سے ملے ہُوئے گائیں وغیرہ میرے پاس بنے رہیں۔ اور گورُو سے پڑھا ہُوا وید شاستر بھُولنے نہ پائے۔ اس لئے اُس کو دھارن کرنے کے لئے میدھا (بُدّھی) بھی دیجئے۔

ہے واچسپتی! اسی سادھک (طالب) کے لئے دونوں یعنی سُنی بات کو دھارن کرنے کی شکتی (میدھا) اور مختلف قسم کے بھوگوں کے دینے والے گاؤں وغیرہ دھن کو وسیع کیجئے یعنی سب لوگوں سے زیادہ مجھے ہی دولتمند بنائیے + جیسے دھنش (کمان) کی رسّی دھنش کے کونوں کو کھینچتی ہے۔ اُسی طرح مجھے مذکورہ بالا دونوں کو کھینچ کر دیجئے یعنی وے دونوں (میدھا و دولت) اگر نہ آنا چاہیں تو بھی زور سے کھینچ کر میرے پاس پہنچائیے۔

اے مدعو کئے ہُوئے واچسپتی (وید وغیرہ کے پالک)! ہمیں میدھا وغیرہ پھلوں کو جو کہ ہم چاہتے ہیں دیجئے۔ اور اس کرپا سے موصول میدھا (بُدّھی) کے ذریعہ سے ہمیں وید شاستر حاصل ہوں اور اُس وید شاستر سے ہماری علیحدگی کبھی نہ ہو۔ یعنی وید شاستر سے ہماری رغبت ہمیشہ سے ہو اور ہم اُن سے مستفیض ہوتے رہیں۔

اس میں واچ (بانی یا کلام) کے مالک واچسپتی رُوپ برہم کا دھیان ہے۔ جب لوہا آگ میں پڑا رہے۔ آگ کے اوصاف اُس میں آجاتے ہیں۔ اس طرح جب بُدھی واچ (یا من) کے پتی سرو دیاپی چیتن (کُلِ شئے محیط آتما) میں کچھ عرصہ ابھید (ایک) رہے۔ تو اُس میں عجیب و غریب طاقتیں کیسے نہ آجائیں گی؟ کوئی بھی منتر ہوں اُن کو خالی پڑھ یا گا کر ہی نہیں چھوڑنا بلکہ پڑھکر اُس کے معنی اور مفہوم میں دِل کو محو اور ساکن ہونے دینا چاہیئے۔

(ख) यज्जाग्रतो दूरमुदैति दैवं तदुसुप्तस्य तथैवेति।
दूरंगमंज्योतिषां ज्योतिरेकंतन्मेमनः शिव संकल्पमस्तु॥

(यजुर्वेद)

مطلب۔ کیا بیداری۔ کیا خواب۔ کیا غفلت، تینوں حالت میں میرا دِل کسی اور خیال کی طرف نہ جانے پائے سوائے شُبھ رُوپ آتم چِنتن کے۔ چلتے، پھرتے بیٹھے کھڑے میرا دِل شُبھ رُوپ ست سوروُپ آتما کے سوائے اور کوئی چِنتن نہ کرنے پائے۔ اسی طرح شُکل یجروید کے اگلے پانچ منتر بھی یہی بھاؤ پرگٹ کرتے ہیں۔

گائتری منتر

(ग) ॐ भूर्भुवः स्वः तत्सवितुर्वरेण्यं भर्गोदेवस्य धीमहि।
धियो यो नः प्रचोदयात् (गायत्री मंत्र)

(اوم جو بھُو۔ بھوَہ۔ سوَہ یعنی تینوں لوکوں یا کُل کائنات میں دیاپک ہے وہ سُورج دیوتا ہے یا اُس کا مظہر وہ سوتا یعنی سورج دیوتا ہے۔ اُس دیوتا کے قابل التعظیم یا پیارے تیج (جلال یعنی

سُروپ) کا جو ہماری بُدھیوں کو متحرک کرتا ہے ہم دھیان کرتے ہیں)

یہاں پر پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ دھی مہی (धीमही) اور نہ (न:) دونوں صیغہ جمع ہیں۔ تنہائی میں اکیلے تو اس برہم گائیتری کا دھیان ہے "اور ہم دھیان کرتے ہیں" "ہماری بُدھیاں"۔ ایسا کیوں؟ "میں دھیان کرتا ہوں" "اور میری بُدھی" کیوں نہیں لکھا؟ اس میں وید کا حُکم یُوں ہے کہ اوّل تو دِیہہ ابھمان (جسمانیت) کی صورت میں خودغرضی اور محدودیت کا ترک کرنا ہے۔ سب جگہ کے لوگوں کو اپنا سرُوپ (ذات) جان کر سب اجسام کو اپنا جسم مان کر سب کے ساتھ ایک ہو کر ابھید بُدھی (یگانگت) کے ساتھ یہ دھیان کرتا ہے۔ وہ سوِتا دیو! جو ہماری عقلوں کو متحرّک کرتا ہے اُس کے قابلِ تعظیم جلال (سُروپ یعنی تیج) کا ہم دھیان کرتے ہیں۔

پرچودیات (प्रचोदयात्) میں مہی دھر اور سائنیاچارج نے व्यत्यय (مضارع) مانا ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ سُورج رُوپی سوِتا دیو کو ہماری عقلوں کا متحرّک مانا ہے۔ وُہی جو سورج کو پرکاش کرتا ہے وُہی بُدھیوں کو پرکاشتا یا روشن کرتا ہے۔ وُہی آتما ہے۔

"योऽसावादित्ये पुरुषः सोऽसावहम्" ॥ "(यजुर्वेद)

(وہ جو سُورج میں پُرش ہے وُہی میں ہُوں)

اُس کا دھیان کرنے سے کیا فائدہ۔ بڑی آفت آن پڑی اور سندھیا کرتے وقت پرمیشور کو جُھٹلایا نہیں۔ لیکن سچ مُچ بار بار دِیہہ درِشٹی (دانانیت) کو درگُذر کر جو یہ دھیان کیا کہ "میں تو سُورج کے پیارے تیج یا جلال والا ہُوں۔ میرا تو وہی دھام (مقام) ہے"۔

تو کہئے فکر جل نہ جائے گی؟ ہر روز تین وقت یا دو وقت یا ایک وقت ہی سہی۔ سچے بھاؤ (عقیدہ) کے ساتھ جو اس حقیقت میں محو ہُوئے کہ "ان عقلوں کا چلانے والا آتم دیو ہُوں۔ میں تو وُہی ہُوں جس کا جلال آفتاب اور ماہتاب میں چمک رہا ہے" تو کہئے کون اندھیرا کھڑا رہ سکتا ہے؟

وِدیا پڑھ رہے ہیں یا کوئی کارِعظیم ہاتھ میں ہے۔ اور ہر روز خِلوت میں بیٹھ بیٹھ سب طرف سے خیال کو کھینچ کھینچ تیج کے پُنج میں (مخزنِ جلال) ایک ہوتے ہیں۔ تو یارو! دُہائی ہے۔ اگر عزّت اور شہرت کھینچ کر تمہارے سامنے ناچ نہ پڑی کریں۔ کیا شُرتی نے "खलु क्रतु मयः पुरुष:।" (یہ پُرش سنکلپ مئے یعنی خیالِ مجسّم ہے) جھُوٹ ہی کہدیا تھا؟

(۲) جب دِل دُنیا میں ڈُوب جائے۔ قانونِ روحانی ٹُوٹ جائے۔ پاپ کرم ہو جائے۔ آتم دیو بھُول جائے۔ تب آنسو بھری آنکھ جوڑے ہُوئے ہاتھ۔ رگڑتے ہُوئے گھُٹنے۔ خاک میں گِھستی ہُوئی پیشانی۔ جلتا ہُوا دِل۔ اگر اس طرح کی اُپاسنا کریں تو وہ کون پاپ ہے جو دُھل نہ جائے گا؟

मोषु वरुणामृन्मयं गृहं राजन्नहं गमम्। मृडा सुक्षत्र मृडय॥
यदेमि प्रस्फुरन्निव दृतिर्नध्मातो अद्रिवः। मृडा सुक्षत्र मृडय॥
क्रत्वः समह दीनता प्रतीपं जगमाशुचे।
मृडा सुक्षत्र मृडय॥ अपांमध्ये तस्थिवांसं तृष्णा-
-विदज्जरितारम्। मृडा सुक्षत्र मृडय॥ यत्किंचेदं

वरुण दैव्ये जनेऽभिद्रोहं मनुष्या३ श्चरामसि ।
अचित्तीयत्तव धर्मायुयोपिममानस्तस्मादेनसो
देवरीरिषः ॥

(ऋ० मं० ७ सू० ८६)

(اے راجا ورُن ! مَیں آپ کے مٹی وغیرہ سے بنے ہُوئے گھر میں نہ جاؤں۔ بلکہ خوبصورت سونے کے بنے ہُوئے آپ کے گھر کو جاؤں ایسا آپ مجھے سُکھ دیں۔

اَے شوبھن دھن والے ورُن ! آپ میرے اُوپر عنایت بھی کریں۔ اَے سدھن اور سوبھاؤ سے نرمل (غنی اور پاکیزہ طینت والے) ورُن ! مَیں کمزوری کے باعث نجی فرائض برخلاف کلام الٰہی کرتا رہا یعنی کلام الٰہی کے مطابق اعمال نہ کر سکا۔ اس لئے آپ سے باندھا گیا ہُوں۔ مُجھ اس حالت میں مقیم کو آپ سُکھ دیجئے۔

آپ سمُندر میں مقیم ہُوئے بھی مُجھ آپ کی تعظیم کرنے والے کو پیاس لگ رہی ہے۔ کھاری پانی ہونے سے آپ سمندر پیا نہیں جا سکتا۔ مُجھ ایسے پیاسے کو سُکھ دیجئے۔

ہے ورُن دیو! عوام میں جو کچھ بے ادبی ہم لوگ کر رہے ہیں۔ آپ کے مقرّرہ قوانین کی حفاظت کرنے والے افعال جو ہم نادانی سے بھُول رہے ہیں۔ اَے دیو! اس پاپ سے ہم لوگوں کو نہ مارئیے)

سونے کا گڈھ چھوڑ کر دھسُوں نہ کانٹوں بیچ
ہیرے موتی پھینک کر لیُوں نہ ماٹی کیچ

اب دَیا! ہے رَام! اب دَیا! مَیں بھُولا۔ مَیں اُڑا۔ میں پڑا۔

میں گرا - میں مرا - اب دیا - ہے رام! اب دیا!

(۳) جب تک جسم میں محبت اور کسی قسم کی آرزو بنی رہتی ہے تب تک تو بھید اُپاسنا (محبتِ امتیازی) ہی دِل سے نکلے گی - پریم انوراگ (جذبۂ محبت) جب بہت بڑھے گا تو اُپاسنا کی یہ شکل ہو جائے گی -

तं त्वा भग प्रविशानि स्वाहा। स मा भग प्रविश स्वाहा॥
तस्मिन्सहस्र शाखे। निभगाहं त्वयिमृजे स्वाहा॥
(तैत्ति० उप०)

(اے سب کے بیج رُوپی اوم! مَیں تجھ میں داخل ہوتا ہُوں - سوا!
اے سب کے کارن رُوپ (علّت) اوم! تُو مجھ میں داخل ہو جا - سوا!
تیری جو ہزاروں شاخیں (رُوپ) ہیں اُن میں غُسل کرتا ہُوں - سوا!)

یہ بھید اُپاسنا اعلیٰ درجہ کو پہونچ جائے تو اس کا ڈھنگ کچھ یوں ہوگا -

ॐ गणानांत्वा गणपति ँ हवामहे। प्रियाणांत्वा
प्रियपति ँ हवामहे। निधीनांत्वा निधिपति ँ हवामहे।
वसो मम, आहमजानि गर्भधमा त्वमजासि गर्भधम्॥
(प्रा० यजु० संहिता २३।१९)

(اے گنپتی (گنیش)! گنوں میں گنوں کے مالک! ہم آپ کو مدعو کرتے ہیں - پیاروں میں پیاروں کے مالک! ہم آپ کو مدعو کرتے ہیں - خزانوں میں خزانوں کے مالک! ہم آپ کو مدعو کرتے ہیں - اے بسو دیوتا! اے پرجاپتی! میری پرورش کیجئے - مثل حمل تمام

عالَم آپ اپنے میں لئے ہوئے ہیں۔ اے سب کو اپنے میں دھارن کرنے والے دیو! مَیں آپ کو سب طرح سے موجود رکھتا ہوں اور آپ سب طرح سے سامنے موجود ہوتے ہیں)

ہے رو کر یہ تکرارِ اُلفت تو تجھ سے
کہ اتنی یہ ہو میری قسمت تو تجھ سے
میرے جسم و جاں میں ہو حرکت تو تجھ سے
اُڑے ماؤمنی کی وہ شرکت تو تجھ سے
ملے صدقہ ہونے کی عزّت تو تجھ سے
سدا ایک رہنے کی لذّت تو تجھ سے
رقیبوں میں گر ہے مُروّت تو تجھ سے
عزیزوں میں گر ہے محبّت تو تجھ سے
خزانوں میں جو کچھ ہے دَولت تو تجھ سے
امیروں میں ہے جاہ وصَولت تو تجھ سے
حکیموں میں ہے عِلم و حِکمت تو تجھ سے
ہے رونقِ جہاں یا ہے برکت تو تجھ سے

महेचन त्वाद्रिवः परा शुल्काय देयाम्।
न सहस्राय नायुताय वज्रिवो न शताय शतामघ॥
(सामवेद इन्द्र पर्व, अ० २ ख० ६ मं० ६)

(اے بجر والے اِندر! مَیں تجھے بیش بہا دَولت کے عوض نہیں بیچتا ہوں۔ نہ ہزار اور نہ دس ہزار مُہر کے لئے مَیں تجھے بیچتا ہوں۔ اے بیشمار دولت والے اِندر! مَیں بیحد دولت کے عوض

بھی مجھے نہیں بیچتا۔ یعنی کتنی ہی دولت مجھے کیوں نہ ملے لیکن
میں آپ کا پُوجن تیاگنے کو تیار نہیں ہُوں۔)

(۴) پرہاں جو لوگ ہمیشہ کے لئے ادنیٰ درجہ کی اُپاسنا کا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ بیجا کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر کوئی پرارتھنا ایک دفعہ بھی سچے دل سے نکلی ہوتی۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ چت کی حالت بدل نہ گئی ہوتی۔ اور دل کا درجہ بڑھ نہ گیا ہوتا۔ اگر من دُوسرے درجہ میں چڑھ گیا۔ تو پہلے درجہ میں رونا کیوں؟ اگر نہیں چڑھا تو وہ پرارتھنا جھوٹی بکواس تھی۔ اب جھوٹی بک بک کو پیشہ بنانا چاہتا ہے۔

اُپاسنا کا مُدعّاء خاص یہ تھا کہ جسم کی محبت سے چت مُڑے اور آتما (نجی ذات) کے ساتھ جُڑے۔ سچے اُپاسک کو جب جسم سے کیا ہُوا گُناہ یاد آتا ہے تو وہ دُنیوی اپنے آپ سے بھاگنا چاہتا ہے۔ ہری کی شرن (خُدا کی پناہ) میں آتا ہے۔ اور آتما سے ایک ہو جاتا ہے۔ ایسا دھیان ایک دفعہ نہیں دو دفعہ بھی ہو جائے۔ تو فائدہ ہے۔ کوئی ڈر نہیں۔ مگر جو لوگ "पापोऽहं पापकर्माहं पापात्मा पापसम्भवः" "میں گنہگار ہُوں۔ گُناہ کرنے والا ہُوں۔ گُناہ میری ذات ہے اور گُناہ مجھ سے سرزد ہوتے ہیں" اسی کو ہر روز پڑھے رٹتے ہیں۔ اُن کی اس طرح کی عادت نہ صرف جسم سے اُن کا تعلّق پُختہ کر دیتی ہے بلکہ پاپ سنسکار (گُناہ کا تصوّر) دل میں مضبوط جما دیتی ہے۔ صاف باطن اور سچے دل والوں سے بھید اُپاسنا کبھی ہو ہی نہیں سکے گی۔ جیسے ایم اے کلاس کے طالب علم کا جی (دل) مڈل کلاس والوں کی کتابوں میں کبھی لگ ہی نہیں سکتا۔

گیانی (عارف)

اب ذرا چونکنے ہو کر سُننے کا موقع ہے۔ لو اب پھر پھوڑتے ہیں بھانڈا (کھولتے ہیں قلعی)۔ بے خوفی۔ جیون مُکتی (جیتے جی نجات) سامراجیہ۔ سُوراجیہ اور کسی کو کبھی بھی نہیں نصیب ہوتے۔ سوائے اُس شخص کے جو اپنے آپ کو شک و شبُہے دُور کر کے پُورن برہم۔ شُدھ سچدانند۔ نِت مُکت (ذاتِ کامل۔ محض ہستی۔ علم و سرُور اور آزادِ مُطلق) جانتا ہے۔ جو سب جگہ اپنے ہی سوُرُوپ (ذاتِ پاک) کو دیکھتا ہے۔ کیوں ہلے گا اُس کا دِل جو ایک آتم دیو کے علاوہ کچھ اور دیکھتا ہی نہیں؟ بڑی ہیبت ناک بلند آواز ہُوئی۔ پر شیر کیوں ڈرے؟ وہ تو شیر کی اپنی ہی گرج تھی۔ لوہا تلوار کے جوہروں سے کیا خوف مانے؟ وہ تو اُسی کی تیز آب و تاب ہے۔ آگ اپنے شعلہ سے آپ کیوں خائف ہو؟ تارے ٹُوٹ پڑیں۔ سمندر جل اُٹھے۔ ہمالیہ اُڑتا پھرے۔ سُورج مارے سردی کے برف کا گولا بن جائے۔ آتم درشٹی گیاوان (حق بیں عارف) کو کیا حیرانی ہو سکے گی۔ جس کے حُکم سے کچھ بھی باہر نہیں ہو سکتا؟

तत्र को मोहः, कः शोक एकत्वमनुपश्यतः ॥

(ईशा० उप० ७)

(اُس کے یہاں شوک اور موہ (غم و اُلجھن) کہاں۔ جبکہ وہ ایک ہی ایک دیکھ رہا ہے۔

अपि शीत रुचा वर्के सुतीक्ष्णो चेन्दु मराडले ।

अप्यध: प्रसरत्यग्नौ जीवन्मुक्तो न विस्मयी ॥
प्रलयस्यापि हुंकारैर्महाचल विचालकैः।
विक्षोभं नैति तस्यात्मा स महात्मेति कथ्यते ॥

(سُورج خواہ سرد ہوجائے۔ چاند خواہ نہایت گرم ہوجائے۔
شعلہ خواہ نیچے رُخ جلنے لگے۔ مگر جیون مکت کو تعجب نہیں ہوتا۔
بڑے بڑے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلانے والی قیامت کی ہُنکار
سے بھی جس کا دِل نہیں دہلتا۔ اُس کو مہاتما کہتے ہیں)

ع۔ بھید بھاؤنا دِل سے چھوڑ ۔ نربھے بیٹھا مُونچھ مروڑ

سُورج اُسی کے حُکم سے جلتا ہے۔ اِندر اُسی کا پانی بھرتا ہے۔
ہَوا اُسی کا قاصد ہے۔ اُسی کے آگے دریا ریت میں ماتھا رگڑتے ہیں۔
راجے مہاراجے۔ دیوی دیوتا۔ وید کتاب جو کچھ بھی ہے ایک آتم دِرشٹی
کا سنکلپ ماتر (خیالِ محض) ہے۔ ہر سہ عالم و ہر چہار طبقاتِ زندگی
(جمادات۔ نباتات۔ حیوان۔ انسان) جنگل ہیں۔ جن میں رونق صرف
ایک چیتن پُرش رُوپ گیان وان (ایک زندہ دِل عارفِ کامل) کی
ہے۔ ترلوکی لالٹین ہے جس میں جیوتی رُوپ گیاوان ہے۔ یعنی ہر سہ
عالم بمنزلہ ایک فانوس کے ہیں اور عارف بمنزلہ ایک شمع کے چودہ
طبقِ عالم ایک جسم ہے۔ جس کی جان عارف ہے۔ بس وہ ہی ست
یا حق ہے اور کچھ بھی نہیں۔

زمین غلّہ پیدا کرتی ہے کہ کبھی برہم نِشٹھ (عارفِ کامل) کے
قدم پڑیں۔ موسم بدلتے ہیں کہ کبھی آتم سورُوپ مہاتما کے درشن
نصیب ہوں۔ "सुर तिय, नर तिय, नाग तिय" یعنی دیوتاؤں

انسانوں اور ناگوں کی عورتوں کو پیٹ میں بوجھ اُٹھانے پڑے۔ دردِزِہ سہنے پڑے اُس ایک عارف کو ظاہرا دیکھنے کے لئے جو پیدایش اور موت سے مُبرّا ہے۔ دُنیا کے راج کاج اُس کے لئے تھے۔ وہ آیا تو راج کاجوں کی ڈیوٹی پُوری ہوگئی۔ گھر بنتے رہے تھے۔ کپڑے بُنے اور پہنے جا رہے تھے۔ برہم نشٹھ یعنی عارف کامِل کی تشریف آوری کے لئے۔ وہ آیا۔ ساری محنتوں کا ثمرہ مِل گیا۔ ریلیں چلتی تھیں۔ جہاز کھیتے تھے کبھی برہم نشٹھ تک پہونچنے کے لئے۔ یُدّھ (جنگ) ہوتے تھے۔ لوگ مرتے تھے کبھی جیون مُکت کی جھانکی کے لئے۔ طرح طرح کے وِکاس (صعودِ عالم evolutions) کا پھل ایک عارف پیدا کرنا تھا۔ اُپاسنا۔ پرارتھنا۔ بھگتی۔ ناک رگڑنا۔ آٹھ آٹھ آنسو رونا۔ پریم کی زردی کب تک تھی۔ جب تک گیان کی لالی نہیں آئی۔

ब्रह्मविद इव सोम्य ते मुखं भाति ॥

(छांदो० उप०)

(اے پیارے! تیرا چہرہ عارفِ کامل کی طرح چمکتا ہے)

پرسنکھیان (نظرِ ثانی)

ابھید اُپاسنا کی وِدھی مَنن۔ نِد دھیاسن

(عشقِ غیر امتیازی کا طریقہ عین الیقین اور حق الیقین)

شاستروں میں سے اُن کلاموں کو چُن لیا۔ جو من میں کھُبتے ہیں۔ دِل میں چُھبتے ہیں۔ اور اُن کو گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر حسب ذیل

طریقہ سے عمل میں لائے۔ جیسے شنکر کے آتم پنچک ستوتر کو لے لیا۔

नाहं देहोनेन्द्रियाण्यन्तरङ्गम्।
नाहंकारः प्राणवर्गो न बुद्धिः॥
दारापत्यं क्षेत्रवित्तादि दूरः।
साक्षीनित्यः प्रत्यगात्मा शिवोऽहं॥

مطلب :-

نہیں دِ یہہ اِندریہ نہ انتہ کرن	نہیں بُدھی۔ہنکار یا پران مین
نہیں کھیشتر گھر بار ناری نہ دھن	میَں شِو ہُوں میَں شِو ہُوں چدانندگھن

چوتھے پد یا مصرع کو بار بار دُہرایا۔ اور اسے ذیل کے خیال سے دُہراتے گئے۔یہاں تک کہ من ساکن ہو جائے۔ بے شک ایسی تحقیقات سے جس میں وِکلپ (وہم) کو کبھی خواب میں بھی گنجایش نہیں۔"میں جسم وغیرہ نہیں"۔ تب جسم کے وہم کو اپنے میں کیوں آنے دُوں گا؟ دِ یہہ ابھمان (خیالِ انانیت) کرنا دلیل کے خلاف چلنا ہے۔ بالکل نادانی ہے۔ بے عقلی ہے۔

میَں شِو ہُوں۔میَں شِو ہُوں۔چدانندگھن

بے شک وید ویدانت کی آخری نچوڑ اور کچھ نہیں۔ وید اور ست شاستر مجھکو جسم وغیرہ سے الگ بتاتے ہیں۔میرا اپنے تئیں جسم وغیرہ ماننا گھور ناستک یا کافر بننا ہے۔یہ گناہ میَں کیوں کروں؟

میَں شِو ہُوں۔میَں شِو ہُوں۔چدانندگھن

گُورُو جی نے مجھے اپنے ساکشاتکار (انکشافِ ذات) کے بل سے کہا"میَں جسم وغیرہ نہیں"۔ پھر میرا دِ یہہ ابھمان (خیالِ جسمانیت)

رکھنا قابلِ العظیم مُرشد کے مُنہ اور زُبان پر جُوتے مارنا ہے۔ ہائے! یہ ظُلم میں کیوں کروں؟

میں شِو ہُوں۔میں شِو ہوُں۔چدانند گھن

جسم وغیرہ کی تکالیف اور تعلّقات۔لوگوں کے حسد و بغض۔خدمت اور عزّت سے مجھے کیا؟ کوئی بُرا کہے کوئی بھلا کہے۔ میں ایک نہیں مانوں گا۔ جو آپ بھُولے ہُوئے ہیں۔ اُن کا کیا بھروسہ؟ کیول شاستر اور پران ہی مانیہ ہیں (صرف کُتبِ مقدسہ اور اُن کے حوالات قابلِ تسلیم ہیں) مجھ میں کوئی تکلیف نہیں۔کوئی غم نہیں۔حسد و نفرت نہیں۔رغبت نہیں۔پیدائش نہیں۔موت نہیں۔تن نہیں۔من نہیں۔

میں شِو ہوں میں شِو ہوُں۔چدانند گھن
میں شِو ہُوں۔میں شِو ہوُں۔چدانند گھن
میں شِو ہوں۔میں شِو ہُوں۔چدانند گھن

ماں چھوٹے بچے کو آم کا پھل کھیلنے کو دیتی ہے۔بچہ حسب دستُور ہاتھ سے پکڑ کر مُنہ کے پاس لے جاتا ہے اور لگتا ہے چُوسنے۔ چُوستے چُوستے آخر وہ پھل پھُوٹ پڑا۔ اور بچہ کے ہاتھ پر۔مُنہ پر۔کپڑوں پر رس ہی رس پھیل گیا۔ اب نہ تو کپڑے یاد ہیں۔ نہ ماں یاد ہے۔ نہ ہاتھ مُنہ کا ہوش ہے۔ رس رُوپ ہو رہا ہے۔ اُسی طرح شُرتی ماتا کا دیا ہُوا یہ مہاواکیہ (کلامِ عظیم) کی صورت میں پکا ہُوا آم کا پھل گوشہ تنہائی میں دل کی تہ کے ساتھ دُہراتے دُہراتے آخر پھُوٹ پڑتا ہے اور پرمانند سمادھی آجاتی ہے یعنی سرور

ذات کی محویت طاری ہو جاتی ہے۔

आवृत्तिरसकृदुपदेशात् ॥ (ब्रह्म सूत्र ४-१-३)

(آتم گیان (عِلمِ معرفت) کا جو اُپدیش ملا اُس کا بار بار دُہرانا ضروری ولازم ہے)

جب سب دیش (مقام و مکان) اپنے آپ میں پانے لگے تو پروکش یعنی دُور کیا رہا؟ اور گھربار کے متعلق فکر کیونکر اُٹھے؟۔ جب سب کال (زمانوں) میں اپنے تئیں دیکھا تو کل پرسوں وغیرہ کی فکر کہاں رہی؟۔

جب سب وستُو (انسان اور اشیاء) سچ مُچ اپنی ہی ذات جانے گئے تو یہ دھڑکا کیسے ہو۔ کہ ہائے! فلاں شخص مجھے کیا کہتا ہوگا۔ جب کاریہ کارن سَتا (علّت و معلول کی حقیقت) خود آپ ہُوئے۔ تو چت برتیوں (خیالات) کا بیڑہ کیسے نہ ڈُوبے؟ من پارہ کھائے ہُوئے چُوہے کی طرح ہلنے جُھلنے سے رہ جائے گا۔ گویا من کے بچّے ہی مرگئے۔ سہج سمادھی تو خود ہونی ہی ہوگی۔

کیا سوچے کیا سمجھے رام	تین کال کا واں کیا کام
کیا سوچے کیا سمجھے رام	تین لوک نہیں اُنچا دھام
نیتہ ترپت سُکھ ساگر نام	کیا سوچے کیا سمجھے رام

اس سر سے گُذر جانے میں جو لذت۔ شانتی اور طاقت آتی ہیں۔ وُہی جانتا ہے جو اس مزے کو چکھتا ہے۔ راجہ جنک نے یہ امرت (آبِ حیات) پی کر اپنا انوبھوَ (ذاتی تجربہ) یوں بیان کیا ہے۔

नाहमात्मार्थ मिच्छामि गन्धान् घ्राण गतानपि ।

तस्मान्मे निर्जिता भूमिर्वशे तिष्ठति नित्यदा ॥
नाहमात्मार्थ मिच्छामि रसानास्येऽपि वर्त्ततः।
आपो मे निर्जितास्तस्माद्वशे तिष्ठन्ति नित्यदा॥
नाहमात्मार्थ मिच्छामि रूपं ज्योतिश्च चक्षुषः।
तस्मान्मे निर्जितं ज्योतिर्वशे तिष्ठति नित्यदा॥
नाहमात्मार्थ मिच्छामि स्पर्शान् त्वचि गताश्चये।
तस्मान्मे निर्जितो वायुर्वशे तिष्ठति नित्यदा॥
नाहमात्मार्थ मिच्छामि शब्दान् श्रोत्र गतानपि।
तस्मान्मे निर्जिता शब्दावशे तिष्ठन्ति नित्यदा॥
नाहमात्मार्थ मिच्छामि मनो नित्यं मनोऽन्तरे।
मनोमे निर्जितं तस्माद् वशे तिष्ठति सर्वदा॥

(महाभारत)

اپنے مزے کی خاطر گُل چھوڑ ہی دئے جب
رُوئے زمیں کے گُلشن میرے ہی بن گئے سب
جتنے زباں کے رس تھے کُل ترک کر دئے جب
بس ذائقے جہاں کے میرے ہی بن گئے سب
خود کے لئے جو مجھ سے دِیدوں کی دید چھُوٹی
خود حُسن کے تماشے میرے ہی بن گئے سب
اپنے لئے جو چھوڑی خواہش ہوا خوری کی
بادِ صبا کے جھونکے میرے ہی بن گئے سب
نج کی غرض سے چھوڑا سُننے کی آرزو کو

اب راگ اور باجے میرے ہی بن گئے سب

جب بہتری کے اپنی فکر و خیال چھوٹے

فکر و خیالِ رنگیں میرے ہی بن گئے سب

آہا! عجب تماشہ۔ میرا نہیں ہے کچھ بھی

دعویٰ نہیں ذرا بھی اس جسم و اسم پر ہی

یہ دست و پا ہیں سب کے۔ آنکھیں یہ ہیں تو سب کی

دُنیا کے جسم لیکن میرے ہی بن گئے سب

ایک چھوٹے سے بالک وامدیو کا یہ اَنُبھو (ذاتی تجربہ) ہے۔

अहं मनुरभवं सूर्यश्चाहं कक्षीवां ऋषिरस्मि विप्रः।
अहं कुत्समार्जुनेयन्युञ्जेहं कविरुशना पश्यतामा॥
अहं भूमिमददामार्या याहं वृष्टिं दाशुषे मर्त्याय।
अहमपो अनयं नावशान्त मम देवासो अनुकेत मायन्॥

(ऋग्वेद, ४,३,२६)

(حمل ہی میں عرفان ہونے پر وامدیو رشی نے انکشافِ ذات کو یوں ظاہر کیا:۔ "میں ہی منو ہوں۔ میں ہی سورج ہوں۔ میں ہی ککشی وان برہم رشی ہوں۔ ارجن کے بیٹے کُتس کو میں ہی پیدا کرتا ہوں۔ کوی اُشنا میں ہی ہوں۔ میں نے ہی منو کو زمین دی ہے۔ میں ہی ہوی دینے والے ججمان کو ترقیٔ دولت کے لئے بارش دیتا ہوں۔ میں ہی گرجتے ہوئے بادلوں کو سب جگہ پہنچاتا ہوں۔ سب دیوتا میرے ہی اشارے پر کام کرتے ہیں۔)

پرنو (اوم) میں اِن منتروں کے ارتھ کا رنگ بھر کر یعنی اوم کو

مہا واکیہ (کلامِ عظیم) برہم اسمی (انا لحق) کا ارتھ دے کر جپنا (وِرد کرنا)- گانا- دم میں پھُونکنا- چلتے پھرتے خیال میں رکھنا برہم ساکشاتکار (انکشافِ ذات) میں بہت بڑا سادھن (عمل) ہے-

ایک عورت (باق) اپنی ذات کو جان کر یُوں گاتی ہے-

१- अहं रुद्रेभिर्वसुभिश्चराम्यहमादित्यैरुत विश्वदेवैः।
अहं मित्रावरुणाभा बिभर्म्यहमिन्द्राग्नी अहमश्विनोभा॥

२- अहं सोममाहनसं बिभर्म्यहं त्वष्टारमुत पूषणं भगम्।
अहं दधामि द्रविणं हविष्मते सुप्राव्ये३यजमानाय सुन्वते॥

३- अहं राष्ट्री संगमनी वसूनां चिकितुषी प्रथमा यज्ञियानाम्।
तां मा देवा व्यदधुः पुरुत्रा भूरिस्थात्रां भूर्या वेशयन्तीम्॥

४- मया सो अन्नमत्ति यो विपश्यति, यः प्राणिति य ईं शृणोत्युक्तम्
अमन्तवो मांत उप क्षियन्ति, श्रुधिश्रुतः श्रद्धिवं ते वदामि॥

५- अहमेव स्वयमिदं वदामि, जुष्टं देवेभिरुत मानुषेभिः।
यं कामये तंतमुग्रं कृणोमि, तं ब्रह्माणं तमृषिं तं सुमेधाम्॥

६- अहं रुद्राय धनुरा तनोमि, ब्रह्म द्विषे शरवे हन्तवा उ।
अहं जनाय समदं कृणोम्यहं द्यावापृथिवी आविवेश॥

७- अहं सुवे पितरमस्य मूर्धन्मम योनिरप्स्व१ न्तः समुद्रे।
ततो वितिष्ठे भुवनानु विश्वो तामूद्यां वर्ष्मणोप स्पृशामि॥

अहमेव वात इव प्रवाम्यारभमाणा भुवनानि विश्वा।
परो दिवा पर एना पृथिव्यैतावती महिना संबभूव॥

(ऋ० वे० ८-७-११ सूक्त १२५)

(اس سوکت میں واصلِ حق ہوتی ہوئی برہم ودُشی واک نام کی لڑکی (دُختر مہرشی انبھرن) اپنے کو ساری دُنیا اور اُس کا منبع سمجھتی ہوئی اپنی ہی حمد یوں کرتی ہے:-

(۱) مَیں ہی رُدر۔ بسو۔ آدتیہ اور وشو دیووں کی صورت میں گھومتی پھرتی ہوں۔ مَیں ہی متر اور ورُن کو نیز اِندر۔ اگنی اور ہر دو اشونی کماروں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہوں۔ میرے ہی میں سارا جگت ظاہر ہو رہا ہے۔

(۲) مَیں ہی سوم کی صورت میں اور مَیں ہی توشٹا۔ پُوشا اور بھگ (پیدا۔ پرورش اور فنا کرنے والے) کی صورت میں گھومتی پھرتی ہوں۔ وہ ججمان جو سوم رس کی آہوتی سے دیوتاوں کو ترپت (سیر) کرتا ہے۔ اُس کے یگ کے پھل کو مَیں ہی دینے والی ہوں۔

(۳) میں ہی عالم کی ملکہ ہوں اور اُپاسکوں (عابدوں) کو کُل خزانوں و کرم پھل کی دینے والی ہوں۔ یگ کرنے والوں میں مَیں مقدم ہوں۔ اس طرح اوصاف سے متصف۔ کُل عالم میں مقیم اور سب جانداروں میں جیو (رُوح) کی صورت میں داخل ہوئی مجھکو ہی تمام دیوتا سب جگہوں پر بلاتے ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں وہ میرے لئے ہی کرتے ہیں۔

(۴) جو غذا کھائی جاتی ہے وہ مجھ سے ہی کھائی جاتی ہے۔ جو دیکھتا۔ دم لیتا اور سُنتا ہے وہ سب میری ہی قوّت سے ہوتا ہے۔ جو اس طرح مجھے نہیں جانتے۔ وہ ناش (فنا) ہو جاتے ہیں۔ اے پیارے! وشواس اور کوشش سے ملنے والے برہم (حق) کا مَیں اُپدیش کرتی

ہوں۔ اُسے سُن۔

(۵) مَیں خود ہی اس برہم (حق) کو کہہ رہی ہوں۔ جو جو آدمی و فرشتے میری سیوا پُوجا کرتے ہیں۔ جس جس کی مَیں حفاظت کرنا چاہتی ہوں۔ اُس اُس کو ہی سب سے افضل مَیں کر دیتی ہوں۔ اُسی کو رشی اُسی کو برہما اور اُسی کو اعلیٰ عقل والا مَیں بنا دیتی ہوں۔

(۶) براہمنوں کے دُشمن و قاتل ترپُورا سُر کو مارنے کے لئے مَیں ہی مہادیو کی کمان کو تنتی ہوں۔ مَیں ہی بھگتوں کی حفاظت کے لئے دُشمنوں کے ساتھ جنگ کرتی ہوں۔ اور مَیں ہی زمین و آسمان میں انتریامی (اندرُونی محرّک) کی صُورت میں داخل ہوں۔

(۷) اِس دُنیا کے اُوپر جو پِتر رُوپ آکاش ہے اُس کو مَیں ہی پیدا کرتی ہوں (آتما سے آکاش۔ آکاش سے ہوا۔ ہوا سے آگ وغیرہ سلسلۂ پیدائش کی وجہ سے آکاش کو پِتر رُوپ کہا ہے)۔ نیچے بحر میں پانی بھی مجھ کارن رُوپ (مسبب الاسباب) سے ہی ملتا ہے۔ اور سب سورگ وغیرہ تبدّلات (تغیرّات) کا کارن (علتِ غائی) ہوتی ہوئی مَیں ہی سب کے جسموں سے وصل پائی ہوئی ہوں۔ مَیں چونکہ ایسی ہوں اِسی لئے سب کا کارن (علت) رُوپ ہو کر کُل جگت میں پھیلی ہوئی مقیم ہوں۔

(۸) ہوا کی مانند بغیر کسی کی تحریک کے کاریہ رُوپ کُل عالم کو مَیں خود کارن رُوپ سے پیدا کرنے میں لگی رہتی ہوں۔ زمین و آسمان وغیرہ کُل تبدّلات (تغیرّات) سے دُور۔ لاتعلق۔ اُداسین (وِدکت نشپکھ یعنی لاطرفین)۔ کوٹستھ برہم (ذاتِ بحت) چیتن رُوپ

(اصلی زندگی) جو مَیں ہُوں۔ اپنی ہی مہان (جلال) سے مَیں کُل
دُنیا کی صورت میں پیدا ہوتی ہُوں۔

گُل کھلتے ہیں گاتے ہیں رو رو بُلبُل۔ کیا بہتے ہیں نالے ندیاں
رنگِ شفق کُھلتا ہے بادِ صبا چلتی ہے۔ گِرتا ہے چھم چھم باراں
مُجھ میں۔ مُجھ میں۔ مُجھ میں

کرتے ہیں انجم جگ مگ۔ جلتا ہے سُورج دھک دھک۔ سجتے ہیں باغ و بیاباں
بستے ہیں لندن پیرس۔ پجتے ہیں کاشی مکہ۔ بنتے ہیں جنت و رضواں
مُجھ میں۔ مُجھ میں۔ مُجھ میں

اُڑتی ہیں ریلیں فرفر۔ بہتی ہیں بوٹیں جھر جھر۔ آتی ہے آندھی سر سر
لڑتی ہیں فوجیں مرمر۔ پھرتے ہیں جوگی دَر دَر۔ ہوتی ہے پُوجا ہر ہر
مُجھ میں۔ مُجھ میں۔ مُجھ میں

چرخ کا رنگ رسیلا۔ نیلا نیلا۔ ہر طرف دِکھتا ہے
کیلاش جھلکتا ہے۔ بحر ڈھلکتا ہے۔ چاند چمکتا ہے
مُجھ میں۔ مُجھ میں۔ مُجھ میں

سب وید و درشن سب مذہب۔ قرآن انجیل اور ترے پٹکا
بُدھ شنکر عیسیٰ اور احمد۔ تھا رہنا اِن سب کا
مُجھ میں۔ مُجھ میں۔ مُجھ میں

تھے کپل۔ کناد اور افلاطون۔ اسپنسر۔ کینٹ اور ہیملٹن
شری رام۔ یدھشٹھر۔ اسکندر۔ بکرم۔ قیصر۔ الزبتھ۔ اکبر
مُجھ میں۔ مُجھ میں۔ مُجھ میں

ہُوں آگے پیچھے۔ اُوپر نیچے۔ ظاہر باطن مَیں ہی مَیں

معشوق اور عاشق۔ شاعر۔ مضمون۔ بُلبل گُلشن میں ہی ہیں

اِندر (راجہ) کے آنند کا سمندر (بحرِ سُرور) یوں گرجتا ہے

१- इति वा इति मे मनो गामश्वं सनुयामिति ।
कुवित्सोमस्यापामिति ॥

२- प्रवाता इवदोधत उन्मापीता अयंसत । कुवि०

३- उन्मा पीता अयंसत रथमश्वा इवाशवः कुवि०

४- उपमा मतिरस्थित वाश्रापुत्रमिव प्रियम् । कुवि०

५- अहं तष्टेव वन्धुरं पर्यचामि हृदा मतिम् । कुवि०

६- नहि मे अक्षिपच्चनाच्छांत्सुः पञ्च कृष्टयः । कुवि०

७- नहि मे रोदसी उभे अन्यं पक्षं चन प्रति । कुवि०

८- अभिद्यां महिना, भुवमभी ३ मां पृथिवीमहिम् । कुवि०

९- हन्ताहं पृथिवीमिमानि दधानीह वेहवा । कुवि०

१०- ओषमित्पृथिवीमहं जंघनानीह वेहवा । कुवि०

११- दिवि मे अन्यः पक्षो ३ धो अन्यमचीकृपम् । कुवि०

१२- अहमस्मि महा महोऽभिनभ्य मुदीषितः । कुवि०

१३- गृहो याम्यरंकृतो देवेभ्यो हव्य वाहनः । कुवि०

(ऋ० मं० ८-६-२६ सू० ११९)

(اِندر اس شوکت سے اپنی تعریف یعنی حمد کرتا ہے۔

(۱) کیونکہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے اس لئے میرا من اب اس طرح کا ہے کہ حمد کرنے والوں کو میں گائے گھوڑے دیتا ہوں

(۲) نہایت سرسراتی ہُوئی ہوا جس طرح درخت وغیرہ کو پانی پہنچا دیتی ہے اُسی طرح نوش کئے سوم رس مجھے نہایت جلد (ذات تک) پہنچا دیتے ہیں۔ اس لئے کہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے
(۳) جس طرح تیز رفتار گھوڑے رتھ کو (منزلِ مقصود تک) پہنچا دیتے ہیں اُسی طرح نوش کئے سوم رس مجھے (اپنے سروپ تک) پہنچا دیتے ہیں۔ اس لئے کہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔
(۴) جس طرح اڑاتی گائے اپنے پیارے بچھڑے سے جا ملتی ہے۔ اُسی طرح لوگوں سے کی گئی حمد مجھے اُن سے ملا دیتی ہے۔ اس لئے کہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔
(۵) بڑھئی جس طرح گاڑی کو ٹھیک کرتا ہے اُسی طرح میں بھی من سے حمد کرنے والے کو ٹھیک (ثمرہ ور) کرنے کو جانتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔
(۶) دیوتا اور آدمی وغیرہ میری نگاہ سے شے کو چھپا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔
(۷) زمین و آسمان دونو میرے پر کی بھی برابری نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔
(۸) میں امر مذکورہ بالا کو اس منتر سے پختہ کرتا ہوں۔ میں اپنی عظمت سے آسمان کو نیچا (ادنےٰ) دکھلاتا ہوں اور اسی طرح اس بہت بڑی زمین کو بھی نیچی (ادنیٰ) دکھلاتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔
(۹) میں اس بات کو ممکن کرتا ہوں کہ اس زمین کو اُٹھا کر میں آسمان

آسمان یا خلا میں رکھ دُوں۔ اس لئے کہ مَیں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔

(۱۰) زمین کے مقابلہ اپنے تیج سے جلانے والے سُورج میں خلا یا آسمان مَیں پہنچاتا ہُوں اس لئے کہ مَیں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے

(۱۱) میرا ایک پر اُوپر آسمان میں مقیم ہے اور دُوسرا پر مَیں نے نیچے زمین پر قائم کیا ہے۔ اس لئے کہ مَیں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔

(۱۲) خلا میں طلوع ہُوے سُورج کی صورت میں مَیں ہی نہایت پُر جلال ہُوں اِس لئے کہ مَیں نے بہت بار سوم رس پیا ہے۔

(۱۳) مَیں آہُوتیوں (عطیات) کا قبول کرنے والا ہُوں۔ جگانوں سے النکرت (آراستہ) اِندر وغیرہ دیوتاؤں کو آہُوتی (عطیہ) پہنچانے والی آگ کی صورت میں آکر مَیں آہُوتیوں (عطیات) کو لیتا ہُوں۔ اس لئے کہ مَیں نے بہت دفعہ سوم رس پیا ہے۔ اِس طرح اِندر دیوتا نے اپنی حمد (تعریف) کی۔

(مذکورہ بالا مطلب کو سوامی رامؔ نے ذیل کی نظم میں نرالی طرز سے یوں ظاہر کیا ہے)

پیتا ہُوں نُور ہردم جامِ سرُور پیہم
ہے آسماں پیالا وُہ شرابِ نُور والا
ہے جی میں اپنے آتا دُوں جو ہے جس کو بھاتا
ہاتھی غلام گھوڑے۔ زیور زمین۔ جوڑے
ے جو ہے جس کو بھاتا۔ مانگے بغیر داتا

پیتا ہُوں نُور ہر دم .....

ہر قوم کی دُعائیں ۔ ہر مت کی اِلتجائیں
آتی ہیں پاس میرے ۔ کیا دیر کیا سویرے
جیسے اڑاتی گائیں جنگل سے گھر کو آئیں

پیتا ہُوں نُور ہر دم ....

سب خواہشیں نمازیں ۔ گُن کرم اور مُرادیں
ہاتھوں میں ہُوں پھراتا ۔ "معمار جیسے اینٹیں
ہاتھوں میں ہے گھُماتا" دُنیا ہُوں یُوں بناتا

پیتا ہُوں نُور ہر دم ....

دُنیا کے سب بکھیڑے ۔ جھگڑے ۔ فساد جھیڑے
دِل میں نہیں رڑ سکتے ۔ نہ رنگ کو بدل سکتے
گویا گلُال ہیں یہ ۔ سُرمہ مثال ہیں یہ

پیتا ہُوں نُور ہر دم ....

نیچر کے لاز سارے ۔ احکام ہیں ہمارے
کیا مہر کیا ستارے ۔ ہیں مانتے اشارے
ہیں دست و پا ہر یک کے ۔ مرضی پہ میری چلتے

پیتا ہُوں نُور ہر دم .....

کِشش ثقل کی قُدرت ۔ میری ہے مہر و اُلفت
ہے بگاہ تیز میری اِک نُور کی اندھیری
بجلی شفق انگارے ۔ سینے کے ہیں شرارے

پیتا ہُوں نُور ہر دم ....

میں کھیلتا ہُوں ہو کی۔ دُنیا ہے گیند گولی
خواہ اس طرف کو پھینکوں۔ خواہ اُس طرف چلادوں
پیتا ہُوں جام ہر دم ناچوں مُدام دھم دھم
دِن رات ہے ترنّم۔ ہُوں شاہِ رامؔ بے غم
پیتا ہُوں نور ہردم.....

किंकरोमिक्वगच्छामि किं गृह्णामित्यजामिकिम्।
आत्मना पूरितं विश्वं महाकल्पाम्बुना यथा॥
सबाह्याभ्यन्तरे देहे ह्यध जदूर्ध्वं च दिक्षु च।
इत आत्मा तथेहात्मा नास्त्यनात्ममयं जगत्॥
न तदस्ति न यत्राहं न तदस्ति न यन्मयि।
किमन्यदभिवाञ्छामि सर्वं संविन्मयं ततम्॥
स्फार ब्रह्मामलाम्भोधि फेनाः सर्वे कुलाचलाः।
चिदादित्य महा तेजो मृगतृष्णा जगच्छ्रियः॥

کہاں جاؤں؟ کسے چھوڑوں؟ کسے لے لوں؟ کروں کیا میں
میں اِک طوفاں قیامت کا ہُوں۔ پُر حیرت تماشہ میں
نہیں کچھ جو نہیں میں ہُوں۔ اِدھر میں ہُوں اُدھر میں ہُوں
میں چاہُوں کیا؟ کسے ڈھونڈھوں؟ سبھوں میں تانا بانا میں
میں باطن میں عیاں زیر و زبر۔ چپ راست پیش و پس
جہاں میں ہر مکاں میں۔ ہر زماں ہُوں گا سدا تھا میں

अस्मे सूर्या चन्द्रमसाभि चक्षे।
श्रद्धेकमिन्द्र चरतोवितर्तुरम्॥

The sun and the moon revolve in regular succession that we may have faith, O Indra! For this the universe did roll.

"اے اِندر! ہمارے دِل میں وِشواس (اعتقاد) جاگزیں ہو"
اس لئے ہی سُورج و چاند با قاعدہ باری باری سے ہمیشہ گھُومتے رہتے ہیں۔ اسی لئے برہمانڈ (عالم کبیر) بھی ڈھلکا)

اوم! اوم!! اوم!!!

عشقِ الٰہی

(یہ لیکچر قیصر باغ لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا)

ع نہ کبھی تھے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیفِ شراب ہے
لبِ یار چُوسے تھے خواب میں وُہی جوشِ مستیٔ خواب ہے

کہتے ہیں سُورج تیرا عکس ہے۔ آدمی تیرے نمُونہ پر بنایا گیا ہے۔ آدمی میں تیرا دم (نفس) پھُونکا ہُوا ہے۔ تُو پھُولوں میں ہنس رہا ہے۔ بارش میں زار زار آنسو بہاتا ہے۔ ہَوا تیری ہی سانس ہے۔ راتوں کو تُو گویا سوتا ہے۔ دِن چڑھنا تیری عالمِ بیداری یعنی جاگرت اوستھا ہے۔ ندیوں میں تُو گاتا پھرتا ہے۔ قوسِ قزح تیرا جُھولا ہے۔ نُور کے طُوفان میں تو کُوک مارچ کرتا چلا جاتا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے۔ کہ یہ رنگا رنگ پوشاک۔ یہ قوسِ قزح۔ یہ بادل۔ یہ ندیاں۔ یہ درخت یہ طرح طرح کے ملبوسات غیر نہیں۔ تیرے ہیں۔ تُو ہی ان تمام ساڑیوں میں جھلک رہا ہے۔ یہ تمام اسماء و اشکال۔ نام رُوپی کپڑے۔ ململ یا جالی کے کپڑے ہیں۔ جو تیرے بدن کو۔ تیرے نُورانی سُروپ کو آدھا دِکھاتے اور آدھا چھُپاتے ہیں۔ او پیارے! یہ چادریں اور لباس کیُوں؟ یہ اپنے تئیں پردوں اور جاموں میں چھُپانا کیسا؟ یہ گھونگھٹ کی اوٹ میں چوٹ کرنا کیا معنی؟ کیا پردوں کو اُٹھا کر باہر آنے

میں تجھے شرم آتی ہے؟ کیا تیرا بدن۔ تیرا سُروپ بدشکل ہے کہ تُو ننگا ہونے میں جھجکتا ہے؟ کیا تیرے سِوا کوئی اور ہے جس سے تُو شرماتا ہے؟ اگر یہ بات نہیں۔ تو پیارے! پھر یہ لباس۔ یہ جامہ۔ یہ بُرقع۔ یہ پردہ اُتار۔ آج تو ہم تُجھے ننگا دیکھیں گے۔ برہنہ دیکھیں گے۔ دیکھیں گے اور ضرور دیکھیں گے۔ پیارے! او پیارے!! اُتار دے کپڑے۔ آ میرے پیارے آ۔!!!

ے کیوں اوہلے بہ بہ جھا کیدا
یہ پردہ کس توں راکھیدا

(کیوں ایک کونہ بیٹھکر جھانک رہا ہے۔ اور یہ پردہ تُو کس سے رکھ رہا ہے)

اُس نے جو جواب دیا وہ برق کی طرح میرے دل میں چمک گیا۔ وہ جواب یہ تھا۔ "نہ تو شرم ہے مجھے ننگا ہونے میں۔ نہ ڈر ہے۔ نہ بدشکل ہُوں کہ کپڑے اُتارتے جھجکتا ہُوں۔ لیکن کیا تُو سچ مچ مُجھ سے عشق رکھتا ہے؟ کیا تُجھ کو مُجھ سے حقیقی محبّت ہے؟ مَیں بھی مُدّت سے تیرے عشق کے مارے بادلوں میں رو رو کر اور بجلی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تیری جُستجو میں تھا۔ کیا تُو میرا عاشق ہے؟ اگر ہے تو جلدی کر۔ کپڑے اُتار۔ تُو اپنے اُتار۔ مَیں اَپنے اُتاردوں۔ لے ابھی وصل ہوتا ہے۔ دیر نہ کر۔ گلے مِل۔ چِقیں اور پردے پھاڑ ڈال۔ دیواریں ڈھادے۔ ننگا تو ہو۔ ننگا خُدا سے چنگا۔ یہ درجہ۔ یہ اہنکار۔ یہ جسم و اسم کی پابندی۔ یہ میرا تیرا۔ یہ دعوے۔ یہ طرح طرح کے منصوبے۔ یہ طرح طرح کی حکومت بازیاں۔ یہ طرح طرح کی حیلہ سازیاں۔

اُتار دے یہ کپڑے۔ ارے! اُتار دے یہ کپڑے۔ کپڑے اُتار دے تو کیا تھا۔ اُس کی رضائیاں اور دُلائیاں۔ اُس کے لحاف اور توشک (یہ بادل۔ یہ مینہ۔ یہ رات اور دن) میرے لحاف اور توشک ہو گئے۔ دونوں ایک ہی بستر میں پڑ گئے۔ دونوں ایک ہی ہو گئے۔

ے من تو شُدم تو من شُدی من تن شُدم تو جاں شُدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(مَیں تُو ہُوا۔ تُو مَیں ہُوا۔ میں تن ہُوا۔ تُو جاں ہُوا۔ یعنی باہم ایسی ایکتا ہُوئی کہ بعد ازاں کوئی کہہ نہ سکے کہ تُو اَور ہے۔ مَیں اَور ہُوں)

اِس جوشِ مستی میں رضائیاں اور دُلائیاں بھی اُتر گئیں۔ نہ کپڑے رہے نہ رنگ رُوپ۔ نہ دُنیا رہی۔ نہ دین۔ اسماء و اشکال کا نام و نشان نہ رہا۔ آپ ہی آپ اکیلا رہ گیا۔

ے آپ ہی آپ ہُوں یاں غیر کا کچھ کام نہیں
ذاتِ مُطلق میں مری شکل نہیں نام نہیں

اصل لکچر تو بس اتنا تھا۔

ے دیا اپنی خودی کو جو ہم نے ہٹا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دُوسرا اُس کے سوا نہ رہا

اب سُننئے خودی کیونکر مٹتی ہے؟ کیا خودی کا ہٹنا اَور ہے اور خُدا کا پانا اَور؟ نہیں ایک ہی بات ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ خودی کو نکالنے سے خُدا ملتا ہے۔

ے ہردم از ناخن خراشم سینۂ افگار را - تا ز دل بیروں کُنم غیرِ خیالِ یار را

(اپنے سینہ کے زخم میں ہردم ناخن سے چھیلتا رہتا ہوں۔تاکہ
یار کے علاوہ خیال کو دِل سے بالکل باہر نکال دُوں)

لیکن اپنا تو یہ مشاہدہ ہے کہ خُدا کے پانے سے خودی نکلتی ہے۔
جب یار ہی یار رہ گیا تو خودی نکل گئی۔

؎ چُناں پُر شُد فضائے سینہ از دوست
خیالِ خویش گُم شُد از ضمیرم

(فضائے دِل دوست کے خیال سے اتنا بھر گیا کہ خیالِ خود
میرے دِل سے گُم ہوگیا)

ایک پیالہ میں پانی یا تیل بھرا تھا۔پارہ ڈالدیا۔تو پانی یا تیل آپ ہی
نکل گیا۔

بُلّھے شاہ پنجاب میں ایک فقیر ہُوا ہے۔ یہ قوم کا سیّد تھا۔ ذات
کا سیّد نہیں۔ ذات کا تو ہر شخص خُدا ہی ہے۔ اُس کا گُرُو (مُرشد)
قوم کا ارائیں (مالی) تھا۔ بُلھّا اُس گُرُو کے پاس گیا اور رو رو کر
بولا کہ حضرت! نوازش فرمائیے۔ مہربانی کیجئے۔کوئی ایسی تدبیر بتائیے
کہ خودی دُور ہو اور خُدا کو پاؤں۔ اُس وقت وہ مالی (گُرُو) پیاز
کی پنیری (کیاری) سے ایک ایک گُٹھی ایک طرف سے اُکھاڑ کر
دوسری طرف لگارہا تھا۔ اُس نے کہا "بُلھّا! خُدا کا کیا پانا۔ اِدھر سے
اُکھاڑنا اور اُدھر لگانا"

تُم کہتے ہو خُدا آسمان پر ہے۔ ارے آسمان پر بیٹھے بیٹھے
بادلوں میں رہتے رہتے تیرے خُدا کو زُکام نہ ہو جائے۔ اُکھاڑ
اُس کو وہاں سے۔ اور جادے اپنی چھاتی میں۔یہاں وہ گرم رہے گا

اور خیالِ خود (مَیں) کو اُکھاڑ اپنے سینے سے اور بو دے سب جسموں میں۔ یہ محبت پیدا کر کر سب جسموں کی "مَیں" کو تو اپنی "میں" سمجھنے لگے۔ خودی کا نکالنا اور خُدا کا پانا ایک ہی بات ہے۔ دونوں مترادف ہیں۔

مگر خودی کا یہ پردہ کس طرح ہٹتا ہے؟ دو طریقوں سے۔ اور دونوں طریقوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ دیکھو یہ رومال کا ایک پردہ ہے۔ جو میری آنکھ پر رکھا ہُوا ہے۔ اس پردہ کے اُٹھانے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آنکھ پر سے اُٹھا لیا۔ یا یُوں سرکا دیا۔ یا گرا دیا۔ معنی ایک ہی ہیں۔ مگر سب حالتوں میں پردہ صرف سرکایا گیا۔ پھاڑا نہیں گیا۔ ہٹایا گیا۔ پتلا نہیں کیا گیا۔ لیکن اگر پردہ کو صرف ہٹاتے ہی رہیں۔ تو یہ پردہ ایسا ہے جیسے جھیل یا تالاب پر کائی۔ جب ہم اس کائی کو سرکا دیتے ہیں تو صاف پانی جھلکنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ کائی پھر اپنی جگہ پر آجاتی ہے اور شفّاف پانی چھُپ جاتا ہے۔ یہی دُنیا کے لوگوں کا حال ہے۔ وہ پردۂ خودی کو ہٹاتے اور دیدارِ خُدا حاصل کرتے ہیں۔ مگر صرف تھوڑی دیر کے لئے ہی۔ وصلِ مدام حاصل کرنے کے لئے ایک اور عمل کی ضرورت ہے۔ وہ یہ ہے کہ کائی کو تھوڑا تھوڑا تالاب کے باہر پھینکتے جائیں تو وہ پتلی ہوتی چلی جائے گی۔ اور آہستہ آہستہ تالاب صاف ہو جائے گا۔

اسی طرح اگر اس پردہ کو جو انسان اور خُدا کے درمیان حائل ہے ہمیشہ کے لئے اُٹھانا ہے تو اس کی ترکیب اور ہے۔

رام ہمالیہ میں رہا ہے۔ جہاں اُس نے آمرناتھ۔ بدری ناتھ گنگوتری وغیرہ کی پیدل سیر کی ہے۔ اُس نے کئی دفعہ راستہ میں سانپ دیکھے جو بظاہر مُردہ نظر آتے تھے۔ وہ سردی میں جکڑے کُنڈلی مارے اس طرح پڑے ہُوئے تھے گویا اُن میں جان ہی نہ تھی۔ رام نے اُن میں سے ایک آدھ کو پکڑا اور ہلایا۔ تو معلوم ہُوا کہ جیتے ہیں۔ ایک آدمی ایک سانپ کو جو دیکھنے میں مُردہ تھا پکڑ لایا۔ بچّوں نے لیجا کر اُس کو دُھوپ میں رکھدیا۔ گرمی جو پائی تو جی گیا۔ اب تو لگا پُھنکارنے۔ ایک آدھ لڑکے کو اُس نے ڈس بھی لیا۔ اسی طرح آپ کے من رُوپی سانپ سے آپ کی خودی تھوڑی دیر کے لئے دُور ہوجاتی ہے۔ من بیحس بن جاتا ہے۔ اُس وقت تُم یوگ کی حالت میں ہوتے ہو۔ من کے ایک طرح سے مرجانے کا نام دیدارِ حق ہے۔ خودی کے مِٹ جانے کا نام وصالِ خُدا ہے۔ لیکن وصالِ مدام کے لئے من رُوپی سانپ کا مُردہ سا کردینا کافی نہیں ہے۔ سانپ کے دانت توڑ ڈالئے۔ پھر چاہے سانپ جاگتا ہو یا سوتا۔ مُردہ معلوم ہو یا زندہ۔ ہوش میں ہو یا نہو۔ کوئی پرواہ نہیں۔ کوئی خطرہ نہیں جب اس میں زہر ہی نہیں رہا تو پھر اُس کا چلنا پھرنا اُس کے نہ چلنے پھرنے کے برابر ہے۔ بیدانت تو بے دانت ہے۔ ایک ترکیب تو یہ تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے اس من کو مُردہ بنالو۔ مثلاً کسی ست سنگت میں بیٹھے من نے پریم کی ٹھنڈک پائی اور مُردہ ہو گیا۔ مگر جب گھر میں آئے اور بیوی نے گرم چُولھا دکھایا۔ گرمی پائی۔ پھر زہر ویسے کا ویسا۔

ایک آدمی نے شراب پی کر گھر فروخت کر دیا۔ جب ہوش میں آیا۔ عرضی دی کہ میں نے شراب پی کر مکان بیچدیا تھا۔ میرے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ اب میں اپنے اقرار نامہ سے انکار کرتا ہوں۔ اسی طرح انسان ایک طرف کہتا ہے کہ "اے خدا سب تیرے آرپن۔ میں تیرا مال تیرا۔ جان تیری۔ گھر بار تیرا۔ تیرا۔ تیرا وغیرہ" جب گھر میں گیا اور بیوی نے بانہہ دکھا کر کہا کہ میرا چوڑا پرانا ہوگیا۔ لڑکے کا بیاہ ہے اور اسی قسم کے ترش اچار کھلائے۔ تو سب نشے اُتر گئے۔ سب تن من دھن خدا سے چھین لیا۔ خودی کی قید میں آ پھنسے۔ شرابِ عشق (پریم صراحی) پی کر تھوڑی دیر کے لئے سب کچھ برہم ارپن کر دینا بھی خوب ہے۔ لیکن حقیقی تیاگ تو ہوش و حواس کے ہوتے گیان یعنی انکشافِ ذات کی بدولت ہوتا ہے۔ اگر انسان چاہے تو دوئی کے پردے کو ہمیشہ کے لئے دُور کر سکتا ہے۔ ترکیب یہ ہے کہ پردہ کی تہوں کو پتلا بناتے چلے جاؤ۔ اس طرح تہیں اُتارنے سے پردہ پتلا ہوتا چلا جائے گا۔ یہانتک کہ وہ اس قدر پتلا ہو جائے گا کہ اُس کا ہونا اور نہونا برابر ہو جائے گا۔ پردہ کا سرکا دینا مشاغلہ ہے اور سدا کے لئے پردہ کا پتلا کرتے کرتے اُٹھا دینا مکاشفہ ہے۔ اب دُنیا کے جتنے مذہب ہیں اُن کو رام تین درجوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اُس میں سب آ جائیں گے۔ ایک تو وہ ہیں جن کے پردہ کو رام کہتا ہے (तस्यैवाहं) تسئی واہم یعنی "میں اُسی کا ہوں" پھر وہ ہیں جن کی حالت کو ہم (तवैवाहं) توی واہم یعنی "میں تیرا ہی ہوں" نام دے سکتے ہیں۔ اس کے آگے وہ ہیں جن کا پردۂ دُوئی ایسا پتلا ہوگیا ہے گویا ہے ہی نہیں

(त्वमेवाह) توے واہم یعنی "میں تُو ہی ہُوں" انا الحق۔ شو وہم ہے۔ یہ بھی پردہ جب بالکل اُٹھ جاتا ہے تو یہ لفظ بھی نہیں کہے جاسکتے۔

تسئی واہم "مَیں اُس کا ہوں" والوں کے لئے خُدا غائب ہے۔ "تُومئی واہم" "مَیں تیرا ہُوں" والوں کے لئے خُدا حاضر ہے۔ سامنے آگیا۔ پردہ باریک تر ہوگیا۔ فاصلہ بہت کم ہوگیا۔ "توے واہم" "مَیں تُو ہی ہُوں" والوں کے لئے خدا خود متکلم ہی ہوگیا۔ فاصلہ بالکل مِٹ گیا۔ پردہ باریک ترین ہوگیا۔ لیکن موٹائی کے لحاظ سے پردہ خواہ کسی حالت میں ہو جب بالکل اُٹھایا جائے تو نُطق و زُبان سے پرے کی حالت ہوجاتی ہے۔ عقلِ کُل کہتا ہے۔

اگر یک سر مُوئے برتر پرم
فروغِ تجلّیٰ بسوزد پرم

(اگر بال کے سرے کے برابر بھی میں اس حالت سے آگے بڑھوں تو میرا پر (جزوی خودی) اس نُورِ علیٰ نُور کی تیزی سے جل جائے)

यतो वाचो निवर्तन्ते अप्राप्य मनसा सह

جہاں سے نُطق و زبان اسی طرح واپس آجاتے ہیں جس طرح دیوار کی طرف پھینکا ہُوا گیند واپس آجاتا ہے۔ وہاں پر لفظ بھی نہیں، زبان بھی نہیں۔ وہاں انا الحق کہنے کا پتلا پردہ بھی نہ رہا۔ جہاں سچّا عشق ہوتا ہے وہاں عشق کے بڑھتے بڑھتے فاصلہ یا تفاوت کا رہنا ناممکن ہے؟ پردہ کہیں رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ دُنیا کے عشق کی ایک مثال لیجئے۔ یہاں سب قسم کے لوگ موجود ہیں بتائیے کس کو کس کے ساتھ زیادہ عشق ہے۔ اُس کا جواب یہ ہے۔

اُس کے ساتھ جس سے دُوئی کا فاصلہ تھوڑا ہے"۔ انسان کو جو محبت اپنے بھائی سے ہے غیر سے نہیں ہے۔ جیسی بیٹے سے محبت ہو گی بھائی سے نہو گی۔ تو وجہ کیا؟ بیٹے کو سمجھتا ہے کہ یہ میرا خُون ہے۔ میرا لختِ جگر ہے۔ میری جان ہے۔ میرا پران ہے۔ کششِ ثقل کا قانون بھی یہی ہے۔ جس قدر فاصلہ گھٹتا چلا جائے گا۔ گھٹتی تفاوت کے مربع کی نسبت سے کشش بڑھتی جائے گی۔ جُوں جُوں فاصلہ کم ہوتا جاتا ہے عشق زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور یہی کیفیت اُس کے برعکس کی ہے جُوں جُوں عشق بڑھے گا فاصلہ کم ہوتا جائے گا۔

؎ وعدۂ وصل چُوں شوَد نزدیک
آتشِ شوق تیز تر گردد

(جب ملنے کے اقرار کا وقت نزدیک آتا ہے تو شوق کی آگ بھی دل میں تیز بھڑکنے لگتی ہے)

عورت یا معشوقہ سے عشق بھائی اور بیٹے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ بیٹا تو خون ہڈی اور چام سے پیدا ہُوا تھا۔ عورت کو تُم اردھنگی اپنا ہی آدھا جسم کہتے ہو۔ اپنا ہی دُوسرا اپنا آپ گُمان کرتے ہو۔ معشوقہ کے ساتھ کیا عشق گوارا کر سکتا ہے کہ وقت یا مُقام کی دُوری دونوں کے درمیان حائل ہو جائے؟ ہرگز نہیں۔ اگر دُوریٔ وقت ہے تو جی چاہتا ہے کہ دُنیا کی جنتریوں میں سے جُدائی کے ایام صاف اُڑ جائیں۔ اگر پچیس میل کا فاصلہ ہے تو خواہش ہوتی ہے کہ یہ فاصلہ نہ رہے۔ اگر صرف دیوار کا فاصلہ ہے تو کہتے ہو کہ یہ بیچ سے ہٹ جائے تو اچھا ہے اگر کپڑے کا فاصلہ رہ گیا تو نیّت ہوتی ہے کہ یہ کپڑا

بیچ سے اُٹھ جائے۔ اگر ہڈّی اور چام (چمڑے) کا فاصلہ رہ گیا ہے تو کہتے ہیں اوچھالی۔ ہڈّی۔لہو اور مانس! بیچ میں سے نکل نکل نکل جا۔ یار ہم۔ہم یار۔

۵ من تو شُدم تو من شُدی من تن شُدم تو جاں شُدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(میں تُو ہُوا۔ تُو مَیں ہُوا۔ مَیں تن ہُوا۔ تو جان ہُوا۔ یعنی ایکتا ایسی ہوگئی کہ بعد ازاں کوئی کہہ نہیں سکتا کہ میں اور ہوں اور تُو اور ہے)

جب تک تُم ایک نہیں ہوجاتے عِشق دم نہیں لینے دیتا۔ یہ دُنیا کے عِشق کے مدارج ہیں۔ جب دُنیا کے عِشق کے یہ مدارج ہیں تو کیا خُدا کے عِشق میں کوئی اور مدارج ہو جائیں گے۔ دُنیا میں ایک ہی قانُون ہے جو تینوں لوگوں پر حاوی ہے۔ جو ترلوکی پر حکُومت کرتا ہے۔ جب عاشق کی آنکھ سے آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں تو وُہی قانُونِ ثِقل کام کرتا ہے۔ جو آسمان پر ستارے ٹُوٹتے وقت کرتا ہے۔ اِدھر آنسو کا قطرہ گِرا اُدھر ستارہ ٹُوٹا۔ ایک ہی قانُون کی بدولت۔عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی کے لئے قانُون ایک ہے۔ اگر عِشق سچّا ہے تو جب تک وحدت (ایکتا) نہ آوے گی۔ دم نہ لینے دے گا۔

اب رام وہ مثالیں دے گا جن میں دکھایا جائے گا کہ پردہ موٹے سے موٹا کیوں نہو بغیر پتلا کئے بھی سرک سکتا ہے۔ مگر وہی تھوڑی دیر کے لئے۔ ہندو مسلمانوں کے یہاں سینکڑوں مثالیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوگا۔ کہ سچے پریم سے بھرے ہوئے بھگتوں اور

بزرگوں کی صداقت کے بل (طاقت) سے کیسا دلدار پردہ اُٹھ جاتا ہے۔ مولانا روم نے ایک گڈریئے کی مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں یہ گڈریا کوہِ طور پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا ہُوا دُعا کر رہا تھا کہ "اے خدا رحم کر۔ ترس کھا۔ اپنے درشن دے۔ دیکھ میں تیرے لئے اپنی کھانگڑ (وہ بکری جس کا دودھ گاڑھا ہوگیا ہو) بکریوں کا تازہ دودھ رکھے ہوئے آیا ہُوں۔ اپنی زیارت کرا۔ میں تجھے یہ دودھ پلاؤں گا۔ میں نے دہی جمایا ہے۔ جس سے تیرے بال دھوؤں گا۔ تیری مُٹھی بھرُوں گا۔ میں نے سُنا ہے تُو واحد ہے۔ احد ہے۔ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اکیلا ہے۔ ہائے جب تُو چلتا ہوگا تیرے پاؤں میں کانٹے چُبھتے ہوں گے۔ روڑے چُبھتے ہوں گے۔ کون تیرے کانٹے نکالتا ہوگا۔ کون روڑے الگ کرتا ہوگا۔ میں تیرے کانٹے نکالوں گا۔ روڑے الگ کروں گا۔ ہے پربھو! کرپا کریں تجھے پنکھا جھلوں گا۔ تیرے پاؤں دباؤں گا۔ تیری جوئیں نکالوں گا۔" یہ کہتا اور روتا جاتا تھا۔ اتنے میں حضرت موسیٰ تشریف لائے۔ عصا کھڑکا کر بیچارے کی پیٹھ پر دے مارا اور کہا "اے کافر! تُو کیا بکتا ہے خُدا کو الزام لگاتا ہے۔ خُدا کی شان میں کُفر کے کلمے نکالتا ہے۔ کہتا ہے میں تیری جوئیں نکالوں گا۔ ارے ظالم! کیا اس طرح خُدا ملتا ہے؟" گڈریئے نے کہا "کیا خُدا نہ ملے گا؟" موسیٰ نے کہا "نہیں تجھ ملعون کو نہیں ملے گا۔" یہ سُن کر بیچارہ گڈریا کہنے لگا "اگر تُو نہیں ملتا تو لے ہم بھی نہیں جیتے۔" یہ کہتا تھا کہ اُسی وقت ایک پیر مرد نے کود کر اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اگر خُدا ہے۔

اور ہے کیوں نہیں۔اور اگر وہ ایسے موقعوں پر بھی ہاتھ نہ رکھنے تو اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔

ع صد جاں فدائے آں کہ زبان و دِلش یکے است

(اُس پر سینکڑوں جانیں قربان ہوں کہ جس کا دِل و زبان ایک ہے)

اِس کا نام ہے مذہب۔مذہب جسم و عقل کی پُشت و پناہ ہے۔ من بُدّھی کا اُس میں غرق ہو جانا ہی مذہب ہے۔ اُس شخص میں خواہ وہ کسی طور یا کسی طریقہ کا تھا۔جسم اسم۔من بُدھی اُس کی خواہ کچھ ہی تھی۔ مگر وہ خُدا کو غیر نہیں جانتا تھا۔ وہ اُس کی ذات میں غرق یعنی لین ہو گیا تھا۔صداقت اِس کو کہتے ہیں بشواس اِس کو کہتے ہیں۔ موسٰے نے کہا "اے گڈرئے! تُو خُدا سے مخول کر رہا ہے" رام کہتا ہے کہ جو لوگ اُس گڈرئے سے زیادہ خُدا کا عِلم رکھتے ہیں لیکن اگر صداقت نہیں رکھتے۔اگر اُن کے زبان و دِل ایک نہیں۔ تو وہ لوگ خُدا سے مخول بازی کرتے ہیں۔ وہ گڈریا ایک طرح سے خُدا کو جانتا تھا۔خُدا کو ماننے والے کی بات اور ہوتی ہے۔جاننے والے کی اور۔ یہاں کوئی انگریز افسر آجائے جیسے ڈپٹی کمشنر۔کمشنر یا لفٹنٹ گورنر۔تو سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔سب دم بخود۔ کاٹو تو لہُو نہیں بدن میں۔ اُن کو اُس کے سامنے جھُوٹ بولنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔کسی عورت کی طرف بُری نظر سے دیکھنے کی ہمّت نہیں پڑتی۔وے کوئی اور بھی بُرا کام نہیں کرتے۔ پرمیشور کو مانتے اور حاضر و ناظر جانتے ہو مگر ہائے غضب! اُس حاضر و ناظر کو جانتے ہُوے کسی

عورت کو دیکھو اور بُری آنکھ پڑے! اُس عورت کی آنکھوں میں خُدا کا نُور تھا۔ اُس سے آنکھ لڑتی اور خُدا کو جانتے۔ تو کیا غش کھا کے گر نہ پڑتے؟ اب رام کہتا ہے۔ شاباش ہے اُس گڈریئے کو۔ اُس پر سے تمام مخول بازان خُدا نثار!

اس قسم کی مثالیں اور بھی ہیں۔ ایک ہندو کی مثال دُونگا۔ ایک لڑکا نام دیو تھا۔ اُس کا نانا ٹھاکر کی مُورتی کی پُوجا کرتا تھا۔ لڑکا اپنے نانا کے پاس آکر کہتا ہے۔ "نانا جی! یہ کیا ہے"۔ نانا نے کہا "یہ ٹھاکر جی ہیں۔ پرمیشور گوپال کے رُوپ میں آیا ہُوا ہے" لڑکے نے گوپال جی کی مُورتی دیکھی۔ کرشن ایک چھوٹا سا لڑکا ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل چل رہا ہے۔ وہ مکھن کا پیڑا چُرائے ہُوئے چُپکے چُپکے واپس آرہا ہے۔ کچھ دُور آگے بڑھکر پیچھے مُڑکر دیکھ رہا ہے کہ ماں نے تو نہیں دیکھا۔ ایک ہاتھ میں مکھن ہے اور دُوسرا ہاتھ زمین پر ٹکا ہُوا ہے۔ یہ پتّھر کی مُورتی ہے یا کسی دھات کی۔ یہ بال گوپال پیارے کرشن کی مُورتی ہے۔ اُس لڑکے نے اِس خدا کو دیکھا اور بمصداق۔

؎ کُند ہمجنس با ہمجنس پرواز
کبوتر با کبُوتر کاز با کاز

(ہم جنس اکٹھے اُڑتے ہیں۔ جیسے کبوتر کبوتر کے ساتھ اور کوّے کوّوں کے ساتھ)

چھوٹا سا بچّہ بڑے خُدا سے کیونکر محبّت کرتا۔ بچّہ کے لئے بچّہ ہی خُدا ہوگا تو اُس کو اُس کا عِشق ہوگا۔ عِشق سفارش سے

نہیں ہوتا۔ عشق وہیں ہوگا جہاں ہمارا مطلوب ہوگا۔ چھوٹے سے نام دیو کے دِل میں نراکار پرمیشور کا خیال کیونکر جمتا۔ اُس کے دِل میں تو یہی ماکھن چور پرمیشور جما۔ جب رام چھوٹا تھا تو اُس کے دِل کو بھی اِسی چور نے چُرایا تھا۔ لڑکا اپنے نانا سے کہتا ہے "مَیں اُس کی پُوجا کروں گا۔" نانا کہتا ہے "تو اُس کی پُوجا کرنے کے قابل نہیں۔ نہ تُو نہاتا ہے نہ دھوتا ہے۔" ایک دن نانا چلا گیا۔ تو نانی سے کہا "نانی! ٹھاکر کو نیچے اُتار دو۔ مَیں پُوجن کروں گا۔" نانی نے کہا "کل صبح کو جب نہا دھولو۔" اُس رات کو وہ کئی دفعہ چونک پڑا اور نانی وماں کو جگا کر کہتا ہے "صبح ہوگئی۔ ٹھاکر جی کو نیچے اُتار دو۔" وہ کہتی ہے "ابھی رات ہے۔ سو رہو۔" آخر صُبح ہُوئی۔ رات گئی۔ لڑکا دریا میں غوطہ لگا کر جلدی سے واپس آیا۔ قاعدہ واعدہ تو جانتا نہ تھا۔ پانی جو لایا تھا اُس میں ٹھاکر جی کو ڈُبو دیا اور جلدی نکال کر کچھ پونچھا۔ کچھ چھوڑ دیا۔ اب ماں سے لڑکا کہتا ہے دُودھ لا۔ بڑی مُشکل سے دُودھ آیا۔ کچھ کچا کچھ پکا۔ سامنے رکھدیا کہ پیجیے۔ بچّے کو خبر نہ تھی کہ نانا جھُوٹ مُوٹ ٹھاکر جی کو بھوگ لگاتے تھے۔ مگر بچّہ میں صداقت تھی۔ اکثر لوگوں کا عِلم صرف زُبان پر ہوتا ہے دِل میں نہیں۔ مگر بچّے میں یہ اُستادی نہ تھی اُس کے روئیں روئیں میں عشق چھا گیا تھا۔ وہ دُودھ رکھکر کہتا ہے "مہاراج! پیئیے۔" ٹھاکر نہیں پیتا۔ ارے! کیا تیرا دل پتّھر کا ہوگیا؟ بچّہ تو بچّہ۔ ماں اپنی ساڑی و اپنا دوپٹہ بیچ ڈالے مگر بچّہ کا حُکم بجالانا ہوگا۔ اَے ٹھاکر! تیرے دِل میں اتنا بھی رحم نہیں جو دُنیا کے والدین میں ہوتا ہے؟

۵ سیمیں بری تو جاناں لیکن دِلِ تو سنگ است
در سیم سنگ پنہاں دیدم ندیدہ بودم
(اے پیارے! چاندی جیسا تُو۔ لیکن تیرا دِل پتّھر کا۔ چاندی میں
پتّھر چھپا مَیں نے دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا)

اے پرمیشور! یہ پیارا بھولا بچّہ کہہ رہا ہے کہ دُودھ پی اور تُو نہیں پیتا۔ بچّہ نے سوچا کہ شاید آنکھ میچے سے دُودھ پیئے۔ اُس نے آنکھ میچ لی۔ مگر اُنگلیوں کے بیچ میں سے کبھی کبھی دیکھنے لگتا ہے کہ ابھی پینے لگے یا نہیں۔ مگر اُس نے نہیں پیا۔ اُس نے سمجھا کہ شاید زُبان ہلانے سے پیئے۔ وہ بُڑبُڑانے لگا۔ مگر اُس نے پھر نہیں پیا۔ لڑکے کو رات کی تکان تھی اور بھُوکا بھی تھا۔ ایک دو تین گھنٹے گُذر گئے۔ مگر ٹھاکر جی نہیں پسیجے۔ ہائے ربّا! رام کو بھی ایسے ٹھاکر پر غصّہ آتا ہے۔ لڑکا رونے اور بلبلانے لگا۔ روتے روتے گلا بیٹھ گیا۔ اور آواز نہیں نکلتی۔ سارا خُون آنسو بن کر نکل آیا۔ مگر ٹھاکر جی نے دُودھ نہیں پیا۔ آخر لڑکے کو غصّہ آ ہی گیا۔ یہ آتا کمزور کو نہیں ملتی کمزور کی دال نہیں گلتی۔ یہ لڑکا دیکھنے میں ذرا سا تھا۔ مگر بَل بُرا تھا۔ بَل کیا تھا؟ استقلال۔ بشواس۔ یقین۔ یہ یقین کی آندھی غضب کی آندھی ہے۔ ہٹ جاؤ درختوں! میرے آگے سے۔ ہٹ جاؤ دریاؤ! اُڑ جاؤ پہاڑو! یہ یقین یہ بشواس۔ یہی حقیقی بل ہے۔ کہتے ہیں فرہاد میں بھی بَل تھا۔ مارتا ہے کُلہاڑا۔ پہاڑ گر رہے ہیں۔ یقین والے جب چلتے ہیں تو دُنیا کو ایک دم سے ہلا سکتے ہیں۔ اس لڑکے میں بھی یہ بَل تھا۔ کسی نے کبھی اس کو برتا نہیں۔ اور کہتے ہو کہ وہ گپ

ہے۔ اس لڑکے کا بل ایشور کو کھینچ لاتا ہے۔

سہ اثر ہے جذبِ اُلفت میں تو کھنچکر آہی جائیں گے
ہمیں پروا نہیں ہم سے اگر وہ تن کے بیٹھے ہیں

لڑکے نے ایک تلوار پکڑلی۔ اور اُس کو گلے پہ رکھکر کہتا ہے "اگر تُم دودھ نہیں پیتے تو ہم بھی نہیں جئیں گے۔ جئیں گے تو تیری خاطر۔ ورنہ نہیں جئیں گے۔"

سہ مرنا بھلا ہے اُس کا جو اپنے لئے جیئے
جینا ہے وہ جو مرچکا اِک تیرے ہی لئے

اگر امریکہ میں سائیکالوجی کے متعلق ایسے تجربے کئے گئے ہیں کہ میز گھوڑا ہوجائے۔ تو ذرا اپنے یہاں کی بھی کہانی مان لو۔ یہ بھی مُمکن ہے۔ جس وقت لڑکا چھُری گلے پر رکھ رہا تھا۔ تو ایک دم سے نہیں معلوم عرش سے یا لڑکے کے دِل سے۔ وہ خُدا مورتی مان (مجسّم) ہوکر آ بیٹھا۔ لڑکے کو گود میں لے لیا اور ہاتھ سے دُودھ کا پیالہ اُٹھاکر دُودھ پینے لگا۔ یہ منظر دیکھکر بچہ روتے روتے ہنسنے لگا۔ جب دیکھا کہ وہ سارا دُودھ پئے جاتا ہے تو ایک تھپڑ مار کر کہنے لگا۔ کُچھ میرے لئے بھی چھوڑو۔ یہ وہ لڑکا ہے جس کے آنکھ کا پردہ بہت ہی کثیف تھا اُس کو خُدا کا گیان نہ تھا۔ مگر پردہ موٹا ہو یا باریک۔ پریم۔ صداقت۔ یقین وہ چیز ہے کہ ایک دفعہ تو اُس کو سَرکا ہی دیتا ہے۔ جب ایک چھوٹے سے لڑکے نے یہ کر دکھایا۔ تو حیف ہے مرد پر

سہ کیڑا ذرا سا اور وہ پتّھر میں گھر کرے
انسان وہ کیا جو نہ دِلِ دِلبر میں گھر کرے

سجدۂ مستانہ ام باشد نماز
وردِ دِل با او بوَد قُرآنِ من

(مستانہ سجدہ ہی میری نماز ہے۔ اُس کے واسطے وردِ دِل میرا قُرآن ہے)

حقیقی نماز یہ ہے کہ مارے مستی کے لڑکھڑا رہا ہے کبھی اِدھر گِرتا ہے کبھی اُدھر۔ ایک مالا میں ایک دم میں ہزار مالا کا اثر ہوتا ہے۔ مگر دِل سے مالا جپی جائے تو۔ تبت میں ایک چکر (پہیہ) ہے۔ جس میں سب مالا ایک دم سے گھوم جاتی ہے۔ اگر ایک دفعہ خُدا کا نام لو۔ لیکن ہر بال کی زبان ساتھ ہی بول اُٹھے تو ایک دفعہ جو زبان سے نکلا تھا اُس کو ہزار مالاؤں سے ضرب دے آیا۔ مطلب یہ ہے جو نکلے دِل سے نکلے۔ جگر سے نکلے۔ سیالکوٹ میں رام کے ایک دوست تھے۔ جنہوں نے جیتے جی نماز نہیں پڑھی تھی۔ یہاں جو اہلِ اسلام ہیں وہ میری بات کا بُرا نہ مانیں۔ بچے میں محبت کامل ہوتی ہے جس سے وہ ماں کو چپت مارتا ہے۔ اُس کی چوٹی کھینچتا ہے۔ سیالکوٹ میں چور بہت تھے اُن کے انسداد کے لئے واربرٹن بھیجا گیا۔ واربرٹن پولیس کا ایک نامی افسر تھا۔ اُس نے وہاں جاکر یہ انتظام کیا کہ پنج قوموں کی تین دفعہ حاضری لیجا دے۔ جس سے چوری کا کسی قدر انسداد ہوگیا۔ ایک دن جمعہ کو سب لوگ نماز پڑھنے جا رہے تھے۔ لوگوں نے شیخ سے پُوچھا تُم کیوں نہیں جاتے؟ اُنھوں نے کہا" ان لوگوں نے چوری کی ہے۔ حاضری دینے جاتے ہیں۔ مَیں نے چوری نہیں کی۔" جسم چوری کا مال ہے جو لوگ اس

جسم کو چُرا بیٹھے ہیں یعنی خودی میں ڈوبے رہتے ہیں وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ مَیں برہمن ہُوں۔ چھتری ہُوں۔ ویش ہُوں۔ مَیں مسلمان ہُوں۔ہاں ایک دفعہ شیخ صاحب نے نماز پڑھی مگر اس خیال سے کہ

ع سجدہ میں سر جُھکاؤں تو اُٹھنا حرام ہے

؎ سجدہ میں گر پڑوں تو پھر اُٹھنا محال ہے
سر کو اُٹھاؤں کیونکر ہر رگ میں یار ہے

نماز پڑھ رہے تھے۔ سجدہ کو سر جُھکایا مگر نہیں اُٹھا۔ پران چُھوٹ گئے۔ یہ نماز پڑھنا ہے۔مسلمان کے معنی ہے اسلام والا۔یقین والا۔ نام دیو کے دِل میں اُس وقت اسلام تھا۔یقین تھا۔ اور سچائی تھی جس نے خُدا کو ایک دفعہ مجسّم کر دکھایا۔گڈریے کے دِل میں بھی حقیقی اسلام تھا۔وُہی یقین تھا۔وہی اخلاص تھا۔خُدا نے اسی لئے موسیٰ کو جھڑکا۔

؎ تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

(تو مجھ سے لوگوں کو ملانے آیا ہے نہ کہ جُدا کرنے)

؎ می رسی درکعبہ زاہد بزود از راہِ تری
زُہد خُشک۔صوم تو بے دیدۂ گریاں عبث

(اے پارسا! تری کے راستہ تو کعبہ کو جلد پہنچ سکتا ہے۔تیرا خُشک روزہ۔ پارسائی اور بغیر روئے کے دیدہ بالکل بیفائدہ ہے)

خُشک نماز۔خُشک مالا۔ خُشک جپ۔ خُشک پاٹ۔ جن میں نہ آنسو ٹپکے نہ دِل ملے۔خُشکی کی راہ مکّہ کو جاتا ہے۔ لوگ تری کے

راستہ جلدی پہنچتے ہیں۔ اگر اس موقع پر مضمون اِدھر کا اُدھر ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں۔

؎ چنیں طاقت کجا دارم کہ پیماں را نگہدارم
بیا اے ساقی و بشکن بیک پیمانہ پیماں را

(الٰہی طاقت اب مجھ میں کہاں جو اقرار کا خیال رکھوں۔ اے ساقی (مُرشد)! آ۔ اور اپنی مستی کے ایک پیالہ سے اس وعدہ کو توڑ)

اِن دو مثالوں سے کثیف پردہ اُٹھ گیا۔ اب ایک مثال لیجئے کہ پردہ پتلا تھا اور اُٹھ گیا۔ پنجاب میں بابا نانک ہُوئے ہیں۔ وہ سب کی طرح دُوسرے درجہ کے تھے۔ ایک زمانہ میں مودی خانہ میں نوکر تھے۔ اُس زمانہ میں کچھ ٹھگ سادھو بن کر اُن کے پاس آئے۔ اُنہوں نے غلّہ بھر بھر کر اُن کو دینا شروع کیا۔ اوپر سے اُن کو گنتے جاتے تھے۔ لیکن دل میں کچھ اور ہی خیال تھا۔

؎ عشق کے مکتب میں میری آج بسم اللہ ہے
مُنہ سے کہتا ہوں الف دل سے نکلتی آہ ہے

مستی ہی اس مٹی پرستی میں کام کر رہی ہے۔ وہ بظاہر تو دو تین چار پانچ سات کہتے جاتے تھے مگر دل میں اس شمار کا کوئی خیال نہیں تھا۔ جب وہ تیرہ تک پہنچے سب بھول گئے اور اُن پر ایک بیخودی کی حالت طاری ہُوئی۔ اب اُنہوں نے تیرہ سے یہ خیال جمانا شروع کیا۔ "تیرے ہو گئے۔ ہو گئے" بارہ۔ اور تیرہ۔ تیرا اور تیرا۔ اس خیال سے بھر بھر کر ٹوکرے پھینکتے جاتے تھے۔ اور تیرا تیرا کہتے جاتے تھے۔ یہاں جو کچھ ہے تیرا ہی ہے۔ اور سب تیرے ہی ہیں۔

یہ کہکر عالمِ بیخودی میں زمین پر گر پڑے۔ زُبان بند ہوگئی۔ مگر ہر رُوئیں سے یہ صدا نکل رہی تھی۔ "مَیں تیرا ہُوں"۔ زبانِ حال کا یہ اثر ہُوا کہ وہ بنے ہُوئے سادھو ٹھگے گئے۔ گو وہ خود چور تھے لیکن پرمیشور نے اُن کو چُرالیا۔ وہ سب چوروں کا چور ہے۔ ٹھگوں پر یہ حالت طاری ہُوئی کہ وہ بھی تیرا تیرا کہنے لگے۔ یہ وہ مثال ہے جس میں بلحاظ مکاشفہ پردہ اُٹھ گیا ہے۔ لیکن عارضی طور پر۔ اب ایک آدھ مثال "میں تُو ہوں" کی اور دی جاوے گی۔ بلحاظ مکاشفہ بہت لوگ ہیں جنھوں نے اس مرحلہ کو طے کیا ہے۔ دو طرح کا پڑھنا ہوتا ہے۔ رام جب کالج میں تھا تو اس کا ہاتھ بہت تیز چلتا تھا۔ رام کا امتحان ہُوا۔ پرچہ بہت لمبا تھا۔ اُس میں سوّلہ سوال تھے۔ اُس میں آٹھ سوالوں کے حل کی شرط تھی۔ مگر رام نے کُل سوال حل کر ڈالے اور کاپی پر لکھدیا کہ ان میں سے کوئی آٹھ ملاحظہ ہوں۔ اُن کے حل دماغ میں تو تھے مگر ناخون میں اُترے نہ تھے۔ اسی طرح سے بہت لوگوں نے اس کو بھی عملی طور سے نہیں جانا ہے۔ اسی طرح سے رام دوسری مثال یہ دے گا کہ وہ ناخن میں اُتر آسکتا ہے۔ عرب میں محمدؐ صاحب سے پہلے لوگ وحشی تھے۔ اب ہم حیران ہوتے ہیں کہ محمدؐ صاحب نے کیسی لیاقت سے ان وحشی لوگوں کو اکٹھا کرلیا۔ اِن کے ملانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُن کو اکٹھا کرکے خُدا کے حضور میں لانا تھا۔ رام نے جاپان میں دو جن رکشا (گاڑی) والوں میں اس بات پر لڑائی ہوتی دیکھی کہ دونوں میں سے ہر ایک مجھ کو اپنی رکشا میں بٹھایا چاہتا تھا۔ جب اُن کی باہم آنکھیں لڑیں تو

دونوں ہنس پڑے۔ اُس وقت رام کو یقین ہُوا کہ آتما آنکھ میں رہتی ہے

ع جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروّت آہی جاتی ہے

اسی طرح جب زبانیں ایک ہوتی ہیں تو محبت ہو ہی جاتی ہے۔ جب خُدا کی درگاہ میں ایک زبان ہوکر دُعا کرتے ہیں تو اتحاد ہو ہی جاتا ہے۔ اول لفظ اوم ہے جو بچہ بھی بولتا ہے۔ بیماری میں اُوں اُوں ہی کہکر تسلی ہوتی ہے۔ جب بچّے خوش ہوتے ہیں تو اُن کے مُنہ سے بھی اَو۔ اَو۔ اَو نکلتا ہے۔ یہ نیچر کا نام ہے۔ اس پر کسی کا ٹھیکہ نہیں ہے۔ قُرآن میں ا۔ ل۔ م جب آتا ہے تو وہ اوم ہی ہے۔ جیسے جلال الدین۔ کمال الدین میں لام نہیں پڑھا جاتا۔ ذرا دیر کے لئے سب اوم بول دو (چنانچہ تھوڑی دیر کے لئے سب نے اوم کا نعرہ بلند کیا جس سے کُھلا میدان گونج اُٹھا)۔ رِکھی کیش کے پاس کا ذکر ہے کہ گنگا کے اِس پار بہت سادھو رہتے تھے۔ اور اُس پار ایک مست۔ اُس کے رگ و ریشہ میں اناالحق۔ شِوو ہم بسا ہُوا تھا۔ رات دن یہ آواز آیا کرتی تھی۔ "شِوو ہم۔ شِوو ہم۔ شِوو ہم۔ شِوو ہم" ایک دن ایک شیر آگیا۔ سادھو پار سے دیکھ رہے تھے کہ شیر آیا۔ اور شیر نے اُس مہاتما کی طرف رُخ کیا۔ وہ شیر کو دیکھکر آواز سے کہہ رہا تھا۔ شِوو ہم۔ شِوو ہم۔ اُس کے ذہن میں یہ جما ہُوا تھا کہ یہ شیر مَیں ہی ہُوں۔ شیر مَیں ہی ہوں۔ خود شیر کے جسم میں نعرہ مار رہا ہوں "شِوو ہم۔ شِوو ہم" شیر نے آکر اُن کے بازُو کو پکڑ لیا۔ تو وہ آنند کے ساتھ شیر کی حیثیت میں آدمی کے گوشت کا مزہ لے رہے تھے اور آواز نکل رہی تھی۔

"شودہم - شودہم" دیوالی میں کھانڈ کے کھلونے بنتے ہیں - کھانڈ کے ہرن - کھانڈ کے شیر - اگر کھانڈ کا ہرن اپنے تئیں اسماء و اشکال خالی صفت کے ساتھ سمجھے "میں ہرن ہوں" تو کیا یہ کہے گا کہ کھانڈ کا شیر مجھ کو کھا رہا ہے ؟ اگر وہ اپنے تئیں کھانڈ مان لے تو یہ کھانڈ کا ہرن کہہ سکتا ہے کہ بحیثیت کھانڈ کے میں ہی ادھر ہرن اور اُدھر شیر ہوں - اسی طرح جب تم جانو کہ تمہاری حقیقت کیا ہے - وہ مثل اس کھانڈ کے خدا کی ذاتِ الٰہی ہے - پس بحیثیت اس کھانڈ کے شیر بننے کے تم بحیثیتِ خدا یہ کہہ سکتے ہو کہ میں اِدھر ہِرن اور اُدھر شیر ہوں -

ع پگڑی پاجامہ دوپٹہ انگرکھا
غور سے دیکھا تو سب کچھ سُوت تھا
دامنی توڑی تومالا کو گڑھا
پر نگاہِ حق میں تھا وہ سب طِلا

پیارے ! یہ مہاتما وُہی نگاہ رکھتے تھے - جس وقت شیر کھا رہا تھا اُس وقت وُہ کیا کیا مزے لے رہے تھے - آج انسان کا خُون ہمارے مُنہ لگا ہے - "ٹانگ کھائی تو بھی "شودہم شودہم" - مُنہ سے نکلا - شیر بھی نعرہ مار رہا ہے - "شودہم - شودہم - پر وہ پہلے ہی پتلا تھا مگر سرکایا گیا -

سکندر جب ہندوستان میں آیا اور اُس نے دیکھا کہ جتنے مُلک میں نے جیتے سب میں صداقت والے عقیل و شکیل ہندوستان میں دیکھے - اُس نے کہا کہ اس ہندوستان کے سر یعنی حکیموں

اور عارفوں کو دیکھنا چاہتا ہُوں۔ سکندر کو سِندھ کے کنارے لے گئے۔ وہاں ایک ابدھوت بیٹھے تھے۔ سکندر تمام دُنیا کا بادشاہ۔ وہاں لنگوٹی بھی نہیں۔ مقابلہ کس غضب کا ہے! سکندر میں بھی ایک رُعب تھا۔ مگر مست کی نگاہ میں تو یہ تھا کہ

ع شاہوں کو رُعب اور حسینوں کو حُسن وناز
دیتا ہُوں جب کہ دیکھُوں اُٹھا کر نظر کو مَیں

سکندر پر اُس مست کا رُعب چھا گیا۔ اُس نے کہا۔ "مہاراج! کرپا کیجئے۔ یہاں کے لوگ ہیرے کو گُدڑی میں لپیٹ کر رکھتے ہیں۔ مغرب میں ذرا ذرا سی چیزوں کی بڑی قدر کی جاتی ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ مَیں تمہیں راج پاٹ دُوں گا۔ دھن دُوں گا۔ دولت دُوں گا۔ ہیرے جواہرات دُوں گا۔ جو کچھ چاہو سب دُوں گا۔ لیکن میرے ساتھ چلو۔" مہاتما ہنسے اور کہا "مَیں ہر جگہ ہُوں۔ میری نگاہ میں کوئی جگہ نہیں ہے۔" سکندر نہیں سمجھا۔ سکندر نے کہا "ضرور چلئے اور وہی لالچ پھر دلایا۔" مست نے کہا "مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ مَیں اپنا پھینکا ہُوا تھُوک چاٹنے والا نہیں۔" سکندر کو غُصّہ آگیا اور تلوار کھینچ لی۔ اُس پر سادھو کِھلکِھلا کر ہنسا اور کہا۔ ایسا جھُوٹ تو تُونے کبھی نہیں بولا تھا۔

ع مُجھکو کاٹے کہاں ہے وہ تلوار

بچّے ریت میں بیٹھکر ریت اپنے پاؤں پر ڈالتے ہیں۔ خود گھر بناتے ہیں۔ خود ڈھاتے ہیں۔ ریت کا کیا بگڑا۔ جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے۔ پیارے اسی طرح اس سادھو کی کیفیت تھی۔ یہ جسم

اُس باؤ کے گھر کی طرح ہے جو لوگوں کے زعم میں ذہنی گھر بنا تھا۔ مَیں تو ریت ہُوں۔ گھر کبھی تھا ہی نہیں۔ اگر تُم یا جو کوئی اس گھر کو بگاڑتا ہے وہ اپنا خانہ خراب کرتا ہے۔

تارے کیا روشنی سے نیارے ہیں
تُم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں

یہ جواب سُن کر سکندر کے ہاتھ سے تلوار چھُوٹ پڑی۔

ایک بھنگن تھی۔ جو کسی راجہ کے گھر میں جھاڑُو دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اُس کو سونا یا موتی انعام میں مِل جاتا تھا۔ کبھی گِرے پڑے موتی اُٹھا لاتی تھی۔ اُس کے ایک لڑکا تھا۔ جو بچپن سے پردیس گیا ہُوا تھا۔ جب پندرہ برس کا ہُوا۔ تو گھر آیا۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں نے جھونپڑی میں لعلوں کا ڈھیر لگا رکھا ہے۔ اُس نے پُوچھا "یہ چیزیں کہاں سے آئیں" مہترانی نے کہا "بیٹا! میں ایک راجہ کے یہاں نوکر ہُوں۔ اُس کی رانی کے یہ گِرے پڑے موتی ہیں۔ جن کا یہ ڈھیر ہے" لڑکا اپنے دِل میں کہنے لگا "جس کے گِرے پڑے موتی ایسے عمدہ ہیں۔ وہ آپ کیسی حسین ہوگی" یہ خیال آیا تھا کہ اُس کے دِل میں عِشق طاری ہوگیا اور اپنی ماں سے کہنے لگا کہ مجھے اُس کے درشن کراؤ۔ یہ تارے ستارے۔ یہ چاند سورج۔ یہ جھلکتے ہُوئے دریا۔ یہ دُنیاوی حُسن و خوبی۔ اس حقیقت کے گِرے پڑے موتی ہیں۔ ارے! جس کے گِرے پڑے موتیوں کا یہ حال ہے تو اُس کا کیا حال ہوگا۔

؎ لگا کر بیڑ پھُولوں کے کئے تقسیم گلشن ہیں۔ جمایا چاند سُورج کو سجائے کیا ستارے ہیں

جس وقت لڑکیوں کا بیاہ ہوتا ہے اُس کے ڈولے پر سے روپے پیسے اشرفیاں نچھاور کرتے ہیں۔ اور اے مہاتماؤں! تم اِن چیزوں کو چھُو۔ رام کی آنکھ اُس دُلہن کے ساتھ لڑے گی۔ جس کا جی چاہے ان موتیوں کو بھرے۔ رام کے پاس تو جامہ بھی نہیں ہے۔ دامن کہاں سے لاوے۔

اوم! اوم!! اوم!!!

(یہ لیکچر فیض آباد میں ستمبر ۱۹۰۵ء میں ہُوا تھا)

سوامی جی مہاراج نے فرمایا "رام کا لیکچر شروع ہونے سے پہلے آپ لوگ اپنے اپنے ہردیہ میں اپنے اپنے اِشٹ دیو کا اس طرح دھیان کریں کہ ہمارا اِشٹ دیو جو ہمارے ہردیہ میں ہے اُس کی کرنوں سے چاروں طرف روشنی پھیل رہی ہے" تو تھوڑی دیر تک ایک عالمِ خاموشی رہا۔ اور سوامی جی مہاراج و حاضرین سب کے سب دھیان میں مستغرق ہو گئے۔ پھر سوامی جی نے اوم کو اُونچے سُر سے بول کر اس عالمِ سکوت کو توڑا اور لیکچر شروع ہُوا

؎ جو نر رام نام ہو ناہیں - سو نر خر کُوکر سُوکر سم برتھا جئے جگ ماہیں

اوم! اوم!! اوم!!!

؎ تُجھے دیکھیں تو پھر اوروں کو کن آنکھوں سے ہم دیکھیں
یہ آنکھیں پھُوٹ جائیں گرچہ اِن آنکھوں سے ہم دیکھیں

؎ جن اَرگن ہوتے چاہ چلی خر کُوکن کی دِھکّار اُسے
جن کھا ٹیکے امرت بانچھا رہی لد پشُوؤن کی دِھکّار اُسے

جن پائیکے راج کو اچھّا رہی چلّی چاٹن کی دھکار اُسے
جن پائیکے گیان کو اچھا رہی جگ بشین کی دھکار اُسے

او ہو۔ او ہو۔ او ہو

جیتا تو وُہی ہے۔ جو ستّ میں۔ نارائن میں۔ رام میں رہتا سہتا چلتا پھرتا اور سانس لیتا ہے۔ زندگی تو یہی ہے۔ اب کہو گے کہ تم بس آنند ہی بوٹتے ہو۔ دُنیا کے کام کاج کیسے ہوں گے۔ اور دُکھ درد کیسے مٹیں گے۔ لیکن

ع ہرجا کہ سُلطاں خیمہ زد غوغا نماند عام را

جہاں پرستّ۔ پریم۔ نارائن کا نواس ہے۔ جس ہردے میں ہری نام بس جاوے۔ تو وہاں شوک۔ موہ۔ دُکھ۔ درد وغیرہ کا کیا کام۔ کیا بادشاہ کے خیمے کے سامنے لُنڈی بُچّی کوئی پھٹک سکتی ہے؟ سُورج جس وقت اُدے ہوجاتا ہے۔ تو کوئی بھی سویا نہیں رہتا۔ پشوؤں کی آنکھیں بھی کُھل جاتی ہیں۔ دریا جو برفوں کی چادریں اوڑھے پڑے تھے۔ ان چادروں کو پھینک کر چل پڑتے ہیں۔ اسی طرح سُورجوں کا سُورج۔ آتم دیو جب آپ کے ہردے میں نواس کرتا ہے۔ تو وہاں کیسے شوک۔ موہ اور دُکھ ٹھہر سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!! دیپک جل پڑنے سے پتنگے آپ ہی آپ اُس کے ارد گرد آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ چشمہ جہاں بہ نکلتا ہے۔ پیاس بُجھانے والے خود بخود جانے لگ پڑتے ہیں۔ پُھول جہاں خود کِھل پڑا۔ بھنورے آپ ہی آپ اُدھر کھینچ کر چلے آتے ہیں۔ اِسی طرح جس مُلک میں دھرم۔ ایشور کا نام روشن ہوجاتا

ہے۔ تو دُنیا کی نعمتیں۔ سنسار کا اقبال آپ ہی کھچا ہُوا اُس مُلک میں چلا آتا ہے۔یہی قُدرت کا قانُون ہے۔ یہی پرکرتی کا نیم ہے۔اوم اوم! اوم! بیشک رام کو سوائے آنند کے اور بات نہیں آتی۔ بادشاہ کا خیمہ لگ جانے پر چور چکار نہیں آنے پاتے۔ اسی طرح آنند کا ڈیرہ جم جانے سے شوک اور دُکھ ٹھہر ہی نہیں سکتے۔پس آنند کے سوا رام سے اور کیا نکلے۔ اوم آنند! اوم آنند۔لیکن آنند کا ڈیرہ ڈالنے سے پہلے زمین کا صاف کرلینا بھی ضروری ہے۔ لہذا آج رام جس کے یہاں آنند کی بادشاہت کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں۔ جھاڑُو لیکر جھاڑنے بُہارنے کا کام کر رہا ہے۔ جس طرح دُودھ یا کسی اور اچھی چیز کو رکھنے کے لئے برتن کا صاف کرلینا ضروری ہے اُسی طرح آنند کو ہردیہ میں رکھنے کیلئے ہردیہ کا صاف کرلینا بھی ضروری ہے۔ سو آج رام اس صفائی کا جتن بتلائے گا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ گھی کے کھانے سے طاقت آتی ہے۔ مگر جب تک تپ دُور نہ ہولے گھی مُضر ہی مضر ہے۔ کڑوی کونین یا چرائیتا یا گلو کھائے بغیر بُخار دُور نہ ہوگا۔ یعنی جبتک کہ من پوتّر اور شدّھ نہ ہوگا گیان کا رنگ ہرگز نہ چڑھے گا

۵ اُورا بچشمِ پاک تواں دید چوں ہلال
ہر دید جلوہ گاہِ آں ماہ پارہ نیست

(اُس کو صاف آنکھ سے ہلال کے چاند کی طرح دیکھ سکتے ہیں
ہر ایک آنکھ اُس پیارے کو نہیں دیکھ سکتی ہے۔)

جب رام پہاڑوں پہ تھا۔ تو اُس نے ایک دن ایک شخص کو دیکھا۔ کہ گلاب کا ایک خوبصُورت پھُول ناک تک لے گیا۔ اور

چلّا اُٹھا۔ کیا تھا؟ اُس سُندر پھُول میں ایک شہد کی مکھی بیٹھی تھی۔ جس نے اُس شخص کی ناک کی نوک میں ایک ڈنک مارا۔ اسی وجہ سے وُہ چلّا اُٹھا۔ اور مارے درد کے بیتاب ہوگیا۔ اور پھُول ہاتھ سے گر پڑا۔ اِسی طرح تمام خواہشاتِ نفسانی اور جذباتِ حیوانی دیکھنے میں اُس گلاب کے پھُول کی طرح خوبصُورت اور دلفریب معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اُن کے بیچ میں درحقیقت ایک زہریلی بھِڑ بیٹھی ہے۔ جو بغیر ڈنک مارے نہ رہے گی۔ آپ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم سُندر سُندر پھُولوں اور عیشوں کو بھوگ رہے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ زہر جو اُن کے اندر ہے۔ آپ کو بھوگے بغیر نہ رہے گا۔ دُنیادار جس کو مزا یا سواد کہتے ہیں۔ وہ اپنا زہریلا اثر پیدا کئے بغیر بھلا کب رہ سکتا ہے۔ ہائے! آج بھیشم کے دیش میں برہمچرج پر دو باتیں کہنی پڑتی ہیں۔ اُس بھیشم کو برہمچرج توڑنے کے لئے رِشی مُنی اور سوتیلی ماں اُپدیش کرتی ہے۔ جس کی خاطر اُس نے برہمچرج کی پرتگیا یعنی عہد کیا تھا۔ وزیر۔ امیر۔ رِشی مُنی سب اصرار کرتے ہیں۔ کہ تم برہمچرج کو توڑ دو۔ تمہاری شادی کرنے سے خاندان کی نسل قائم رہے گی۔ راج بنا رہے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر نوجوان بھیشم عنفوانِ شباب (جوانی کے آغاز) میں جبکہ شاذو نادر ہی کوئی جوان ہوگا۔ کہ جس کا دِل ظاہری آب و تاب اور دلفریب خط و خال کے دام تزویر میں نہ پھنستا ہو۔ جوانمرد بھیشم۔ سُوربیر بھیشم یوُں جواب دیتا ہے۔ تینوں جہاں کو ترک کرنا۔ بہشت کی حُکمرانی چھوڑ دینا بلکہ ان سے بڑھ کر ہو۔ تو اُسے نہ لینا منظور ہے

لیکن ست سے جُدا ہونا گوارا نہ کرُوں گا۔ خواہ زمین اپنی خاصیت (بُو) کو۔ پانی اپنی خاصیت (ذائقہ) کو۔ روشنی اپنی خاصیت (اظہار الوان) کو۔ ہوا اپنے گُن (لامسہ) کو۔ آفتاب اپنے جلال کو۔ آگ اپنی حرارت کو۔ چاند اپنی ٹھنڈک کو۔ آکاش اپنے دھرم (آواز) کو۔ اِندر اپنی حشمت کو۔ یم راج عدل کو چھوڑ دیں۔ لیکن مَیں سچائی کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔

۵ تینوں لوکوں کو کرُوں تیاگ اور بیکنٹھ کا راج
چھوڑ دُوں۔ پر نہیں مَیں چھوڑتا ست کا معراج
پنچ تت۔ چاند۔ سُورج۔ اِندر اور یم دیں چہے چھوڑ
خاصیت اپنی مگر ست ہے میرا سرتاج

ہنومان کا نام لینے اور دھیان کرنے سے لوگوں میں بہادری اور بیرتا آجاتی ہے۔ ہنومان کو مہابیر کس نے بنایا؟ اسی برہمچریہ نے۔ میگھناد کو مارنے کی کسی میں تاب نہ تھی۔ مریادا پرشوتم بھگوان رامچندر نے یہ مریادا دکھلا دی۔ کہ گو مَیں خود رام ہُوں۔ مگر مَیں بھی میگھناد کو نہیں مار سکتا۔ اُس کو وہی مار سکے گا۔ کہ بارہ برس تک جس کے دِل میں کِسی قِسم کا اپوتر بچار یعنی ناپاک خیال نہ گذرا ہو۔ اور وہ لکشمن جی تھے۔ جن جن لوگوں نے پوِترتا یعنی عفّت کو چھوڑا۔ اُن کی حالت بدتر ہونے لگی۔ جَے (فتح) اُس شخص کی کبھی نہیں ہوسکتی۔ جس کا دل پوِتر نہیں ہے۔ پرتھوی راج جب اُس میدانِ جنگ کو چلا۔ جس میں یہ صدیوں تک کے لئے ہندیوں کی غلامی شروع ہوگئی۔

لکھا ہے۔ کہ چلتے وقت اپنی کمر مہارانی سے کسوا کے آیا تھا۔
نپولین جیسا مردِ میدان جب اپنے معراج کے بالا ترین زینہ
سے گِرا۔ اڑا اڑا دھم! مذکور ہے۔ کہ معرکہ کو جانے سے پہلے ہی
وُہ اپنا خُون کرچکا تھا۔ خُون کیا لال ہی ہوتا ہے؟ نہیں! نہیں!!
سفید بھی ہوتا ہے۔ یعنی اُس میدانِ جنگ سے پہلی شام کو ایک
چاہ میں اپنے تئیں پہلے ہی گرا چُکا تھا۔ ابھمینو کُمار جیسا مہ جمال
اور مہر جلال بے مثل نوجوان جب اس کورکشیتر بھُومی میں قُربان
ہُوا۔ اور اُس لڑائی میں کام آیا۔ کہ جہاں سے بھارت کے
کھشتری شُورویروں کا بیج اُڑ گیا۔ تو لڑائی سے پہلے ابھمینو کھشتری
نسل کا بیج ڈال کر آرہا تھا۔ رام جب پروفیسر تھا۔ تب اُس
نے پاس اور غیر پاس شُدہ لڑکوں کی ایک فہرست بنائی تھی۔
اور اُن کے اندرونی حالات اور چال چلن سے یہ نتیجہ نکالا
تھا۔ کہ جو لڑکے امتحان کے دِنوں یا اس سے کچھ دنوں پہلے
بشیون میں پھنس جاتے تھے۔ وہ امتحان میں اکثر فیل یعنی ناکامیاب
ہوتے تھے۔ خواہ وُہ سال بھر درجہ (جماعت) میں اچھے کیوں نہ
رہے ہوں۔ اور وہ لڑکے جن کا دِل امتحان کے دنوں یکسو اور
پاک رہا کرتا تھا۔ وُہ ہی پاس اور کامیاب ہوتے تھے۔ بائبل میں
ہمّت اور بہادری میں ضرب المثل سمسن (Samson) ہُوا ہے

My strength is the strength of ten,

Because my heart is pure;

I never felt the kiss of love,

Nor maiden's hand in mine.

جب اُس نے عورت کی آنکھوں کی شرابِ زہر آلود کو چکھا۔ تو اُس کی کُل بہادری اور شہ زوری کو اُڑتے ذرا دیر نہ لگی۔ ایک جتی سُورما کہتا ہے۔

دس جوانوں کی مُجھ میں ہے ہمّت
کیونکہ دِل میں ہے عِفّت و عصمت

جیسے تیل بتّی کے اوپر چڑھتا ہُوا روشنی میں بدل جاتا ہے۔ ویسے ہی وہ طاقت جس کا نیچے کی طرف رُجحان ہے۔ اگر اُوپر کی طرف جانے لگ پڑے۔ یعنی اُوردھ رتیس بن جاوے تو جذبات والی طاقت نُورِ کُل اور سُرورِ مُطلق میں بدل جاتی ہے۔ پولیٹیکل اکانومی (علمِ سیاستِ مدن) میں اکثر اصحاب نے پڑھا ہوگا۔ نیچرل فلاسفی والوں کی تحقیقات سے جو بدیہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ توضیح کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں یہ دکھلایا ہے۔ کہ کسی مُلک میں آبادی کا بڑھ جانا اور بہبودی کا قائم رہنا ایک ہی وقت میں غیر ممکن ہے۔ ایک دُوسرے کے لئے متضاد ہے۔ اگر باغیچہ میں گوڈی (زرائی) نہ کی جاوے۔ اور درختوں کی کاٹ چھانٹ نہ کی جاوے۔ تو تھوڑے دِنوں میں بلغ بن ہو جاوے گا۔ سب راستہ بند۔ اسی طرح قومی امن اور رونق کو قائم رکھنے کے لئے طریقۂ اخلاقی (Ethical Process) جس کو ہکسلے نے طریقۂ گلستانی (Horticultural Process) سے نسبت دی ہے۔ استعمال میں لانا پڑتا ہے۔ یعنی آبادی کو ایک

اندازہ سے زیادہ نہ بڑھنے دینا لازم آتا ہے۔ خواہ تارک الوطنی حاصل ہو۔ خواہ اولاد کم پیدا کرنے سے۔ جب سیدھی طرح سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ تو ڈنڈے کے زور سے سکھلائی جاتی ہے۔ وحشیوں میں پہلے جانوروں کی طرح ماں بہن کا امتیاز نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اس قانون کو سمجھنے لگے۔ اور ماں بہن وغیرہ قریبی رشتہ داروں میں شادی بواہ کا رواج بند کر دیا۔ بعض حرکات وخیال کو حیوانی نام دے کر حقیر قرار دیا جاتا ہے۔ مگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو انسان کی بہ نسبت حیوان زیادہ پاک اور پوتر ہیں۔ لیکن وہ جذبات اور حرکات حیوانوں کو بدنام کرنے کے لائق بھی ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ گو انسانوں کی نسبت تو حیوان برہمچرج کو زیادہ برتاؤ میں رکھتے ہیں۔ لیکن نسل دھڑا دھڑ بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ جنگ و جدل اور جدو جہد برائے زندگی ہوتا ہے۔ حیوانوں کی اولاد صرف لڑنے مرنے اور کمزوروں کے نابود ہونے اور بعض طاقتوروں کے بچ نکلنے کی بدولت قائم رہتی ہے۔ حیف ہے اُن انسانوں پر کہ جو نہ صرف حیوانوں کی طرح اولاد پیدا کرتے جاتے ہیں بے تمیز ہیں۔ بلکہ حیوانوں سے بڑھ کر اپنا سفید خون لذّت کے واسطے بہانے کو کمر بستہ ہیں۔ جس وقت ہم لوگ یعنی آریَن لوگ اس دیش میں آئے۔ اُس وقت ہم کو ضرورت تھی کہ ہماری اولاد اور تعداد زیادہ ہو۔ اس واسطے بواہ کے سمے اس قسم کی پرارتھنا کی جاتی تھی۔ کہ اس پُتری کے دس پُتر ہوں۔ مگر اِن

دیوں دس پُتروں کی خواہش ٹھیک نہیں ہے۔ تُم کہتے ہو۔ کہ مرنے کے بعد تمہیں سُورگ میں پُتر پہنچائیں گے۔ مگر اب تو جیتے جی یہ لڑکے جو تُم کو پیٹ بھر روٹی نہیں دے سکتے۔ تمہارے عذاب یعنی نرک کا باعث ہو رہے ہیں۔ یارو! اُدھار کے پیچھے نقد کو کیوں چھوڑتے ہو۔ اس قسم کا پرشن ارجن نے بھگوان کرشن سے گیتا میں کیا تھا۔ کہ پنڈ کون دے گا۔ اور پتر کس طرح سورگ میں پہنچیں گے؟ کرشن نے جو جواب دیا۔ اُس کو بھگوت گیتا کے دوسرے ادھیائے میں ۴۲ سے لیکر ۴۶ شلوک تک اپنے اپنے گھروں میں جاکر دیکھ لو۔ بھگون! سورگ کوئی مُکتی تو نہیں ہے۔ سوئرگ کے بعد تو پھر یہاں آنا پڑتا ہے۔ سورگ یا جنّت کے بارے میں کیا خوب کہا ہے۔

ع جنّت پرست زاہد کب حق پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

پیارو! اگر تُم آبادی کے کم کرنے میں کوشش نہ کروگے۔ تو قُدرت اپنے جنگلی طریقہ (process ulmwa) کو کام میں لائے گی۔ یعنی تراش خراش کرنا شروع کردے گی۔ جیسا کہ مہارشی وشسٹ جی نے فرمایا ہے (۱) وَبا (۲) قحط (۳) زلزلہ اور (۴) جنگ کے ذریعہ کانٹ چھانٹ شروع ہو جائے گی۔ اگر خانہ جنگیاں۔ اکال اور پلیگ وغیرہ نا منظور ہیں۔ تو عفّت۔ عصمت۔ پاکیزہ دلی اور پاک کرداری کو عمل میں لاؤ۔ مُلک میں اتّفاق اور قومی اتحاد ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ آبادی کی پیدائش اور

زمین کی عملی پیداوار میں دُرست مُناسبت نہ رہے۔ دُنیا میں کوئی مُلک ایسا نہیں ہے۔ جو افلاس میں ہندوستان سے کم ہو۔ اور آبادی میں اس سے زیادہ۔ ایسی حالت میں عناد و فساد اور خود غرضی بھلا کیونکر دُور ہوسکتی ہے۔ اور اتّفاق اور اتحاد کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔ دو کُتوں کے بیچ میں ایک روٹی کا ٹُکڑا ڈال کر کہتے ہو۔ کہ مت لڑو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔ اس صورت میں اتّفاق اور اتحاد کا اُپدیش کرنا لیکچر بازی کا مُضحکہ اُڑانا اور اُپدیش کا مخول کرنا ہے۔ ایک گئوشالہ میں دس گائیں ہوں اور چارہ صرف ایک کے لئے ہو۔ تو گائیں ایسی حلیم۔ صُلح پسند اور بے زبان جانور بھی آپس میں لڑنے مرنے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ بھلا بھُوکے مرتے باشندگانِ ہند کیسے صُلح اور صفائی قائم رکھ سکتے ہیں؟ علمِ طبیعات میں یہ امر تحقیق شُدہ ہے۔ کہ کسی جسم کے انتظام و قیام (equilibrium) کے لئے ضروری ہے۔ کہ ایک ایک ذرّہ یا جُزو کی گردش و جُنبشِ اندرُونی کے لئے اس قدر جگہ ہو۔ کہ دُوسرے ذرّوں کی گردش و جُنبش میں فرق نہ پڑنے پاوے۔ اب بھلا بتاؤ۔ کہ جس مُلک میں ایک آدمی کے پیٹ بھر کھانے سے باقی دس آدمی نیم سیر یا بھُوکے رہ جاویں۔ اُس مُلک کے اجزاء ایک دُوسرے کے مزاحم کیوں نہ ہوں۔ اور ایسے مُلک کا سکُون انتظام و قیام کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ کیا تم ہندوستان کو کلکتہ کی کال کوٹھری بنائے بغیر باز نہ آؤگے؟ جو چیز تنگی ہو جاتی ہے۔ وہ مثل اُس لیمپ کے نیچے اُتار دی

جاتی ہے۔ جو ابھی اُتار دیا گیا ہے۔ (جو لیمپ میز پر رکھا ہُوا تھا۔ اُس کی چمنی سیاہ ہو گئی تھی۔ اِس وجہ سے وہ لیمپ میز سے نیچے اُسی وقت اُتارا گیا تھا)۔ آخر کب سمجھو گے۔ طاقت انسانی کو اس طرح زائل مت کرو۔ کہ جس سے تمہارا بھی نقصان ہو۔ اور مُلک کی بھی بربادی ہو۔ اِسی طاقت کو سُرورِ یزدانی اور طاقتِ رُوحانی میں بدل دو۔ دُنیا میں سب سے بڑا ریاضی داں سر آئزک نیوٹن ۸۰ سال سے زائد عُمر تک جیا۔ اور وہ برہمچرج کی زندگی بسر کرتا تھا۔ دُنیا کا سب سے بڑا فلاسفر کینٹ بہت بڑی عُمر تک جیا۔ اور وہ برہمچاری تھا۔ ہربرٹ سپنسر اور سویڈن برگ جیسے دُنیا کے خیالوں کو پلٹا دینے والے برہمچاری ہُوئے۔ بعض انگریزی اخباروں وغیرہ نے یہ خیال اُڑا رکھا ہے۔ کہ برہمچرج کی زندگی عُمر کو گھٹاتی ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ نتیجہ پیرس اور ایڈن برا میں چند سالوں کی خاص مردُم شُماری کی رپورٹوں سے اخذ کیا گیا تھا۔ اب جس میں ذرا بھی تمیز ہے۔ اگر غور کرے تو دیکھ سکتا ہے کہ پیرس اور ایڈنبرا میں اُنہیں لوگوں کی شادی نہیں ہوتی۔ جو بیمار ہوں اور نادار ہوں۔ بیکار ہوں یا دیگر طریقہ پر خوار و زار ہوں۔ پس اُن مُلکوں میں عدم ازدواج یا تنہائی کی زندگی جلدی موت کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ موت کی آمد آمد عدم ازدواج کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہ غیر شادی شدہ لوگ جو رُوحانی اور عقلی شغل سے عاری ہیں۔ برہمچاری نہیں کہلا سکتے۔ پس برہمچرج پر مردُم شُماری کے رُو سے اعتراض کرنا

بالکل بیجا ہے۔ اب ہم دو ایک امریکہ کے برہمچرج کی زندگی بسر کرنے والوں کا حال سُنا کر ختم کریں گے۔ہمارے بھارت کی وِدیا کو بدیشیوں نے حاصل کر کے اِس سے لابھ اُٹھایا اور ہم ویسے ہی کورے کے کورے رہے جاتے ہیں۔ یہ کیسے افسوس کی بات ہے "ہمارے باپ نے کُنواں کُھدوایا ہے" اس کے کہنے سے ہماری پیاس نہیں جاوے گی۔ پیاس تو پانی ہی کے پینے سے جاوے گی۔ اسی طرح شاستروں پر عمل کرنے سے آنند ہوگا۔ امریکہ کے سب سے بڑے مصنف امرسن کا گُرو برہمچرج کا پالن کرنے والا تھورو بھگوت گیتا کے بارے میں اسی طرح لکھتا ہے۔ کہ ہر روز مَیں گیتا کے پوِترِ جل سے سنان کرتا ہوں۔ گو اس پُستک کو لکھے ہُوئے دیوتاؤں کے سالہا سال گذر گئے۔ لیکن اس کے برابر کوئی کتاب ابھی تک نہیں نکلی ہے۔ اس کی عظمت و خوبی ہماری آج کل کی تصنیفات سے اس قدر بڑھ چڑھ کر ہے۔ کہ کئی دفعہ مَیں یہ خیال کرتا ہوں۔ کہ شاید اِس کے لِکھے جانے کا زمانہ بالکل نرالا زمانہ ہوگا۔ پاتال لوک یعنی امریکہ میں اُپنشد۔ بھگوت گیتا اور وشنو پُران کو سب سے پہلے اِسی شخص (تھورو) نے انٹروڈیوس (رائج) کیا۔ سر تامسن رو وغیرہ جو یُورپ سے ہندوستان میں آئے۔ وہ ان متبرک کتابوں کے لاطینی ترجموں کو یہاں سے یُورپ میں لے گئے۔ اور فرانس سے یہ شخص (تھورو) اُن ترجموں کو امریکہ میں لے گیا۔ اِن کتابوں کے ترجموں کو فرنگیوں نے فارسی زبان سے لاطینی زبان میں کیا تھا۔ کیونکہ اُس وقت یُورپ کی عِلمی زبان

لاطینی تھی۔ اور اکثر کتابیں اُسی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ اگر سچ پُوچھو تو ویدانت کا جھنڈا پہلے پہل اسی شخص (تھورو) نے امریکہ میں گاڑا۔ ایک دن جنگل میں سیر کرتے ہُوئے اس سے اِمرسن نے پُوچھا۔ کہ انڈین یعنی امریکہ کے اصلی باشندوں کے تیر کہاں ملتے ہیں؟ اُس نے حسب معمول اپنا ہر وقت وہی جواب دیا "جہاں چاہو" اتنے میں ذرا جُھکا۔ اور ایک تیر راستہ سے اُٹھاکر جھٹ دیدیا۔ اور کہا "یہ لو!" اِمرسن نے پُوچھا۔ کہ مُلک کون سا اچھا ہے؟ تو جواب دیا۔ کہ اگر پیروں تلے کی زمین تم کو بہشت اور رضوان سے کہیں بڑھکر نہیں معلوم دیتی۔ تو اس زمین پر رہنے کے لائق نہیں۔ اُس کے دروازے ہر وقت کُھلے رہتے تھے۔ اور روشنی اور ہوا کو کبھی روک ٹوک نہ تھی۔ اِمرسن کہتا ہے۔ کہ اُس کے مکان کی چھت میں بھڑوں کا ایک چھتہ لگا ہُوا تھا۔ اور بھڑوں اور شہد کی مکھیوں کو میں نے اس کے ساتھ چارپائی پر بے کھٹکے سوتے دیکھا۔ مگر وہ اس سم درشی کو کبھی ایذا نہیں پہنچاتی تھیں۔ سانپ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے تھے۔ مگر اُسے ذرا پرواہ نہیں۔ کاٹتے تو کیسے۔ کیونکہ اُس کے ہردے سے دیا اور پریم کی کرنیں پھُوٹ رہی تھیں۔ اور وہ وہاں بھُوشن بنا ہُوا تھا۔ اور اس طرح کاشتکار کی مانند علی گیان رکھتا تھا۔ اور جس شخص کو دُنیا کا نخرہ تخرہ اور ناز و عشوہ نہیں ہلاسکتا وہی دُنیا کو ضرور ہلادے گا۔ امریکہ کا ایک اور مہاپُرش والٹ وہٹ مین نامی ابھی حال میں گُزرا ہے۔ جو

خانہ جنگی (War of Independence) کے دنوں میں آزادانہ گیت گاتا پھرا کرتا تھا۔ اُس کے چہرے سے بشاشت ٹپکتی تھی۔ اور ہاتھوں سے محنت کا عادی تھا۔ اُس کا لڑائی میں یہی کام تھا کہ مجرُوحوں کی مرہم پٹی کرے۔ پیاسوں کو پانی اور بھُوکوں کو روٹی دے۔ اور لوگوں کے دِل میں ہمت اور ساہس کو پیدا کرے اور آنند سے گیت گاتا پھرے۔ اُس کی آنکھوں سے آنند برستا تھا۔ اُس کی آواز سے سُرور جھڑتا تھا۔ جس طرح کورو کشیتر کے میدانِ جنگ میں کرشن بھگوان اور بھُوت پشاچوں کے بیچ میں شِو بھگوان پھرتے تھے۔ اُسی طرح یہ مہاپُرش امریکہ کے اس میدانِ کارزار میں بے دھڑک گھُومتا پھرتا تھا۔ اُس نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام (Leaves of grass) اوراقِ گیاہ ہے۔ جس کے پڑھتے پڑھتے انسان آنند سے گد گد ہو جاتا ہے۔ اوم آنند آنند آنند

ے ڈٹ کر کھڑا ہُوں خوف سے خالی جہان میں
تسکینِ دِل بھری ہے مرے دِل میں جان میں
سُونگھیں زماں مکاں ہیں مرے پَیر مثلِ سگ
مَیں کیسے آسکُوں ہُوں قیدِ بیان میں

گاہ بگاہ خوش کھڑا دُنیا کی چھت پر ہُوں تماشہ دیکھتا
گاہ بگاہ دیتا لگا ہُوں وحشیوں کی سی صدا

بادشاہ دُنیا کے ہیں مُہرے مری شطرنج کے
دل لگی کی چال ہیں سب رنگ صُلح و جنگ کے
رقص شادی سے مرے جب کانپ اُٹھتی ہے زمین
دیکھ کر ہنس کھِل کھِلاتا قہ قہا تا ہُوں وہیں

اوم! اوم!! اوم!!!

اکبرِ دلی

(از قلم شری سوامی رام تیرتھ جی مہاراج)

مست حافظ کا کلام ہے

گلاہِ تاجِ سُلطانی کہ بیمِ جاں درو درج است
گُلاہِ دِلکش ست اما بدردِ سر نمی ارزد

(تاجِ شاہی کہ جس میں جان کا خوف ہے دِل کو لُبھانے والا
تو ہے لیکن سر کے درد کے برابر بھی اُس کی وقعت نہیں)

خواجہ حافظ نے ہمارے شاہنشاہ اکبر کو نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ اس قسم کا اشارہ ہرگز نہ کرتے۔ جو شیکسپیر (Shakespeare) نے بھی کیا ہے۔

"Heavy lies the head that wears a crown"

بھاری وہ غم سے سر ہے کہ جس سر پہ تاج ہے

کیا دوست کیا دشمن۔ کیا آئینِ اکبری کے شیخ صاحب (ابوالفضل)۔ کیا خُفیہ نویس حضرت مُلّا۔ کیا ہندو۔ کیا مُسلمان۔ کیا پُرتگال کے پادری۔ کیا سندھ گجرات کے جَینی۔ کیا امیر کیا غریب۔ کیا عالِم کیا جاہل۔ کیا رِند کیا پارسا۔ سب کے دِلوں

ہیں جس کی حکومت تھی۔ جہاں چاہے اور جس کی گود کو چاہے سرہانہ بنا کر بے کھٹکے نیند میں پاؤں پسارا کرتا تھا۔ ایسا کون تھا؟ ہندوستان کا شاہنشاہِ اکبر۔

فرانس کے ایامِ غدر والے بادشاہ کی بابت ٹامس پین (Thomas Paine) نے یہ رحم کا کلمہ استعمال کیا ہے "ہائے یہ اُس کی بدنصیبی تھی کہ بادشاہ ہُوا" بیشک جس بادشاہ کا راج رعایا کی زمین اور جسموں تک محدود ہو اُس سے بڑھکر قابلِ رحم مسافرِ وطن کون ہو سکتا ہے؟ کیا اکبر کے دُشمن نہ تھے؟ تھے کیوں نہیں۔ لیکن مہارانا پرتاپ ایسے عالی ہمت جانباز پکے سچے دھرماتما کھشتری کا حریف ہونا بھی اکبر کی شان کو دوبالا کرتا ہے۔ خیر! ہمیں تو اس وقت حکومتِ اکبر کے کسی اور ہی پہلو سے سروکار ہے

یادِ الٰہی

کرام ویل۔ بابر۔ محمود۔ رنجیت سنگھ نیز اور بھی ہزاروں بادشاہوں اور پیروں کا دستور تھا کہ جو مہم شروع کرتے صدقِ دل سے بارگاہِ الٰہی میں اپنا سب کچھ نذر کرکے خدا کے نام پر شروع کرتے اور اُن کے فتوحات۔ اُن کی صداقت اور یادِ خدا کے متناسب تھیں۔ بہت خُوب۔ لیکن آغازِ کار پر دُعا و مدد مانگنا کون سی بڑی بات ہے۔ ہم حقیقی بہادر اُس کو مانتے ہیں۔ جس کی عقیدت اور فقیرِ دلی فتح کے بعد جوش ملے

؎ جب عیش میں یادِ خُدا ہی رہی جب طیش میں خوفِ خُدا نہ گیا

سام وید کے کین اُپنشد میں روایت ہے کہ حواس و اعضا کے عقول و ملائک (دیوتا) ایک بار بڑے معرکہ کی مُہم جیت چکے۔ اور جیسا کہ ابھی تک دستور چلا آرہا ہے۔ عیش و عشرت اور رنگ رلیاں فتح کی منانے لگے۔ اُپنشد میں غضب کی خوبی کے ساتھ دکھلایا ہے۔ کہ کیونکر ان دیوتاؤں کو سبق ملا۔ ایسے سبق کو یاد رکھنے والا ہندوستان کا ایک شہنشاہ اکبر ہُوا ہے۔

جب فتح پر فتح پاتا گیا۔ اور ایک کے بعد دُوسرا صوبہ ہاتھ آتا گیا۔ یہاں تک کہ تقریبًا تمام قلمرِو ہند زیرِ قلم ہوگیا۔ جب وہ مملکت کی وُسعت کے لحاظ سے اور آبادی کے لحاظ سے خاقانِ چین کو چھوڑ کے دُنیا میں سب سے بڑا بادشاہ ہوگیا۔ جب اُس کے اقبال کا ستارہ عین سمت الراس پر پہنچا۔ جب وہ چڑھتے چڑھتے اُس پھسلنی گھاٹی تک عروج پا چکا جہاں اِدھر تو نیچے کھڑے ہُوئے لوگ مُنہ تکتے حیراں کھڑے ہُوئے کہتے ہیں۔

؏ یہ جائے گا بڑھ کر کہاں رفتہ رفتہ

اور اُدھر ہنوز لیکن ایسا مردِ میدان پاؤں پھسلتے ہی دھم سے تحت الثریٰ میں گرا اور گرتے ہی چکنا چُور! ایسی حالت میں اُس غفلت لانے والی ساعت میں دیکھیے

؏ سب کو جب بھُول گئے اُن کو خُدا یاد آیا

سوچنے لگا کہ یہ ہڈی چمڑے کا ذرا سا جسم! اس میں یہ طاقت کہاں سے آئی؟ کس کی برکت سے؟

ع دَولتِ غُلامِ من شُد و اقبال چاکرم
ہوتا جا رہا ہے۔ اس دِل و دماغ میں نُور کہاں سے آتا ہے؟
ے کون ہے من کو چلاتا کون ہے؟
ان پراڻوں کو ہلاتا کون ہے؟
کیا اسرار ہے! حیرت ہے!
روز مرّہ اس قسم کے سلسلۂ خیال سے اُس نُورٌ علیٰ نُور عین سرورِ ذاتِ باری کے مشکریہ میں بادشاہ سلامت کا یہ حال ہوگیا کہ

ع دِل ترا جان تری عاشقِ شیدا ترا
دن رات کا شغل ہوگیا
ع نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار

مذہبی تحقیقات

اکبر کے ہمعصروں میں انگلینڈ کے تخت پہ ملکہ الزبتھ (Elizabeth) رونق افروز تھی۔ یہ ملکہ انگلینڈ کے دیگر حکمرانوں میں ویسی ہی ممتاز ہے جیسے اکبر دیگر شاہان ہند میں۔ انگلینڈ میں عہد الزبتھ یا پرشیا جرمنی میں عہد فریڈرک اعظم (Fredrick the Great) علم و ہُنر کی ترقّی اور مُلکی انتظام کی خُوبی کے اعتبار سے تو ہند میں عہد اکبر کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ اور وہ دونوں تاجور اپنے اپنے مُلک میں ہر دلعزیزی کے لحاظ سے اکبر کی برابری کر سکتے ہیں، لیکن مذہبی تحقیقات۔ خُدا پرستی اور

سب مذہبوں کے لئے یکساں رعایت کی رُو سے اکبر کی کامرانی لاثانی ہے۔ مہاراجہ بِکرم اور بھوج کے زمانوں میں بھی اسی درجے کی فلاح و بہبودی رعایا کو نصیب تھی۔ لیکن وہ دُور کے ذکر ہیں۔ مہاراجہ اشوک کے زمانہ میں رعایا کو ہر طرح کا امن میسّر تھا۔ خیالات اور مذہب کی پُوری پُوری آزادی حاصل تھی۔ چین وغیرہ غیر ممالک کے لوگ ہندوستان میں آتے اور مستفیض ہوکر جاتے تھے۔ شکاگو سنہ ۱۸۹۳ء کی طرح ہند میں جلسۂ مذاہبِ دُنیا بڑی دھوم دھام سے منعقد ہُوا تھا۔ لیکن اکبر کا تو نہ صرف دربار بلکہ دِل بھی لگاتار جلسہ گاہِ مذاہبِ دُنیا بن رہا تھا۔ کسی مذہب یا مِلّت کے لئے دروازہ بند نہ تھا۔ عِلم۔ راستی اور حق کو خواہ کسی جانب سے آئیں ہمیشہ خوش آمدید کہتا تھا۔ اس جوانمرد کا دِل صُلحِ کُل کا گھر تھا۔ اور پیشانی کسی مخالفِ مذہب یا رائے کے لئے مُقفّل نہ تھی۔ عُلما۔ مُلّا۔ شیخ۔ قاضی۔ وِدوان۔ پنڈت۔ شاکت۔ وَیشنو۔ جَینی۔ پارسی۔ عیسائی۔ پادری اور کشمیر کے۔ دکن کے۔ پُورب کے۔ سندھ گجرات فارس۔ عرب۔ پُرتگال اور فرانس تک کے لوگ اپنے اپنے عقیدے اور خیالات دل کھولکر بادشاہ کو سُناتے ہیں۔ بادشاہ سلامت نہایت شوق سے سُنتے ہیں اور دِل سے داد دیتے ہیں۔ دن ہی کو نہیں رات کو بھی جب لوگوں کے آرام کا وقت ہے محلسرا کے چبوترے پر شہنشاہِ اکبر۔

ع پے علم چوں شمع باید گداخت

(شمع کی طرح علم کے لئے پگھلنا چاہیئے)

کی زندہ مثال بنے ہوئے ہیں۔ اُنسِ انسانی کی مشعل روشن کر رہے ہیں۔ بعض ناظرین کو کچھ دل لگی کی سی بات معلوم ہوگی کہ شاہی چبوترے سے رستے لٹکائے جاتے ہیں اور محلوں کی دیوار کے ساتھ ایک پلنگ کھینچا ہوا اوپر چڑھتا آتا ہے۔ حتیٰ کہ چبوترے کے قریب آپہنچا۔ رات کے وقت معلق پلنگ پر براجمان پنڈت جی مہاراج یا حضرت صوفیٔ کرام یا کوئی اور صاحبِ دل اپنا مسئلہ تقریر شروع کرتے ہیں۔ اور شاہ بیدار مغز غور سے سُنتے اور سوال کرتے ہیں۔ اکثر ساری رات ذِکر سُنتے سُنتے یا بحث و تفتیش میں گُزر جاتی ہے۔ واہ رے شوقِ تحصیلِ علم! بادشاہ کے حُکم سے سب مذاہب کی کتابوں کے فارسی ترجمے شروع ہو گئے۔ ترجمۂ انجیل کے شروع کا مصرع ہے

ع اَے نامِ تو جیزز و کرسٹو

بھاگوت۔ مہابھارت اور خصوصاً بھگوت گیتا۔ وِشنو پُران اور چند اُپنشدیں فارسی نظم و نثر میں پروئی گئیں۔ اِن ترجموں کو سُننے رہنا اور خود زبانِ حال سے اعمال میں سُناتے رہنا اکبر کا سب سے بڑا کام تھا۔

گیتا۔ وِشنو پُران۔ اور اُپنشدوں کے یہ ترجمے ادویت ویدانت کے طرفدار ہیں۔ ان ہی کتابوں کے فارسی ترجمے بعد میں بھی ہوئے۔ مگر یہ اکبر والے ترجمے تھے۔ جو فرانس کے آدمی لاطینی زبان میں (جو اُن دنوں یورپ کی علمی زبان تھی) ترجمہ کرکے فرنگستان کو لے گئے۔ اس طور پر یہ کتابیں پہلے پہل فرانس میں

اور وہاں سے جرمنی میں پہنچیں۔ یورپ میں اُن کی از حد قدر ہوئی۔ شلیگل (Schlegel) وکٹر کزن (Victor Cousin) شاپن ہاور (Schopen Hauer) وغیرہ یورپ کے فلسفیوں کی فرطِ جوش میں ہندو فلسفہ کی ثنا خوانی ان کتابوں کی قدردانی کی شاہد ہے۔ فرانس سے ہنری تھورو (Henry Thoreau) کے ذریعے یہ لاطینی ترجمے امریکہ میں پہنچے۔ اور تھورو کے دوست ایمرسن (Emerson) (امریکہ کے سب سے بڑے مصنّف) کے ہاتھ لگے۔ ایمرسن اور تھورو کی تحریر پر ویدانت کا بڑا اثر ہے۔ اور زیادہ تر ایمرسن کی تصنیفات کی بدولت امریکہ میں ویدانت نُما نیا مذہب خیالِ نو (New Thought) چل نکلا ہے۔ جو بہت جلد عالمگیر ہونے کا اُمیدوار ہے۔

دُنیا کے تقریبًا سب سے بڑے دارالعلوم (ہارورڈ یونیورسٹی) (Harward University) کا محقق پروفیسر جیمز (Professor James) رائے زن ہے کہ صُوفی مذہب عام مسلمانی پر ویدانت کے اثر کا نتیجہ ہے۔ راقم اس رائے سے اتّفاق نہیں کرتا۔ البتہ اس میں کچھ شک نہیں کہ صُوفی خیالات کے پھیلنے میں اکثر جگہ ویدانت سے بہت مدد ملی ہے۔ اور ہمیں اس امر کے تسلیم کرنے میں بھی تامّل نہیں کہ سنسکرت کتابوں کے اکبری ترجمے ہندوستان اور فارس وغیرہ میں تصوّف کے بڑھانے پھیلانے میں جُزوِ عظیم ہوئے ہیں۔

صُلحِ کُل

اکبر کا چہرہ گُلِ نوبہار کی طرح کھلا ہُوا تھا۔ سنجیدگی سے ہنسی گویا لبوں سے پیوند تھی۔ یہ بشاشت کیوں نہوتی؟ جہاں محبتِ خلق یا عشقِ الٰہی ہے۔ غم و غصّہ کی کیا مجال کہ پاس پھٹک سکے۔

ع ہر جا کہ سُلطاں خیمہ زد غوغا نماند عام را

(جہاں بادشاہ کا خیمہ گڑ گیا۔ وہاں عوام کا شور و غُل نہیں رہتا)

ے یادِ الطافِ خُدا در دِل نہاں داریم ما
در دِلِ دوزخ بہشتِ جاوداں داریم ما

(خُدا کی مہربانیوں کی یاد ہم دِل میں پوشیدہ رکھتے ہیں اس طرح دوزخ کے دِل میں ہم ہمیشہ کا بہشت رکھتے ہیں)

جن کے دِل ایسے وسیع اور جن کی باطنی محبّت عالمگیر نہ تھی۔ اُن میں سے ایک مُلّا صاحب درپردہ بادشاہ کو یُوں طعن کرتے ہیں ے

ے خندہ کردن رخنہ در قصرِ حیات افگندن است
میشوی از ہر نسیمے ہمچوں گُل خنداں چرا

(ہنسنا گویا زندگی کے محل میں سُوراخ کرنا ہے)

حضرت ناصح! آپ تو بادشاہ کی ہر ایک سے خنداں پیشانی کو موت کے سایہ کے آنچل کے تلے چھُپایا چاہتے ہیں۔ جائیے! موت کی گیدڑ بھبکیاں اُن کو دیجئے جو محبّت خلق سے بے بہرہ

ہیں۔ ہمارے بادشاہ کی تو زبانِ حال یوں پُکار رہی ہے

سہ مرنا بھلا ہے اُس کا جو اپنے لئے جئے
جیتا ہے وہ جو مر چکا اِنسان کے لئے

ع روے زود دِلے نکشاید ندیدنی ست

(وہ چہرہ کہ جس سے دِل نہیں کھلتا قابلِ دید نہیں)

"غیر مذہب والے سے بھی سلُوک کرو"۔ "مخالف سے بھی محبت کرو"۔ "شخصی عداوت کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالو"۔ "سب سے محبّت رکھو" وغیرہ۔ کہنا آسان ہے۔ لیکن کرنا بہت کٹھن۔ پر ہاں! کٹھن ہو خواہ کٹھن سے بھی کٹھن۔ عموماً ہمیشہ اور خصوصاً آجکل ہندوستان میں بغیر اس اصول کو عمل میں لائے اتّفاقِ قومی اور اتحادِ مُلکی ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جس مذہب میں پیدا ہُوئے اُسے چھوڑو۔ ڈھلمُل یقین یا رکابیُ مذہب بنجاؤ۔ البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ جس مذہب کی چار دیواری میں پیدا ہُوئے۔ اُس چار دیواری سے قدم باہر نکالنے کو گُناہ سمجھنا بذاتِ خود رُوحانی خود کُشی کا گُناہ ہے۔ جہاں پَیر ٹکاؤ محکم جماؤ۔ پھسل نہ جاؤ۔ مگر برائے خُدا قدم آگے بھی بڑھاؤ۔ کسی چار دیواری میں پیدا ہونا اور پرورش پانا تو امرِ لازمی ہے۔ البتہ اُسی چار دیواری میں بند رہ کر اُسی میں مرنا پاپ ہے۔ اور لوگوں کے ناپائدار دُنیوی خزانے تو لُوٹ کر لے لینے بھی منظور ہو جاتے ہیں۔ لیکن کیسے تعجب کی بات ہے کہ اور لوگ جب اپنے رُوحانی خزانے (فلسفہ اور اصول و عقائدِ مذہبی) منّت سے بھی پیش کریں

تو نفرت ہی رہتی ہے۔ اس نفرت کا باعث اصلی کیا ہے؟ خامی یعنی جس مذہب میں پیدا ہوئے۔ اُس میں تحصیلِ کامل اور کافی تجربہ نہونا

ع آزادیِ ما در گرو پختگیِ ماست
آویختہ است از رگِ خامی ثمرِ ما

(ہماری آزادی ہماری پختگی پر منحصر ہے۔ کیونکہ ہمارا کچّا پھل شاخ سے لٹکا ہُوا ہے)

لیکن کوئی کچھ ہی کہے اوروں کے عقائدِ مذہبی کی وُہی قدر و عزّت کرنا جو اپنی چاردیواری کے عقیدوں کی کرتے ہیں از حد مُشکل ہے۔ پیارے ناظرین! ذرا خیال تو کرو۔ جس مذہب میں آپ نے پرورش پائی۔ اُس مذہب کے مخالف لوگوں کی وعظ و تقریر سُننے کی تیاری کے لئے کس قدر دِل کی کمر کسنی پڑتی ہے۔ مگر بل بے اکبر! تیرا دِل ہے کہ سب کا ہو رہا ہے تُو گویا رعیّت کے سب گھروں میں پیدا ہُوا تھا۔ سب مذہبوں کی گود میں کھیلا تھا۔ سب فرقوں کے ہاں پلا تھا۔ نہ صرف مذہبِ اسلام بلکہ ہندو دھرم۔ جین مت۔ پارسی۔ عیسائی مذہب بھی اسی شدّومد سے تیرے پیدائشی مذہب ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کو انتخابِ جہاں نام دیتے ہیں اور تُو انتخابِ ہندوستان بن رہا ہے۔ انسان کو عالمِ صغیر (microcosm) کہتے ہیں۔ مگر تُو در حقیقت عالمِ اکبر (macrocosm) بن رہا ہے۔ محبّت کی انتہا یہ ہوتی ہے۔ کہ رفیق کا دِل ہمارا دِل ہو جائے۔ اور یکدلی کا پرلا سرا یہ ہے

کہ دوست کے عقائد اور اُس کا خُدا ہمارے عقیدے اور خُدا ہو جائیں۔ اور پاکیزگی کی حد یہ ہے کہ یکدلی کا پرلا سرا ایک محبوب تک محدود نہ رہے بلکہ ساری ہی خلقِ خُدا کے ساتھ عمل میں آجائے۔ وہ کون سی کرامات ہے۔ جو اِس پاکیزہ عشقِ عالمگیر کے لئے ناممکن ہے۔ وہ کون سا معجزہ ہے جو اِس عاشقِ حقیقی کے لئے بچّوں کا کھیل نہیں بن جاتا؟ آج اکبر کی اُس پاکیزہ اُلفت عالمگیر کا ہم نام رکھتے ہیں۔

اکبرِ دلی

اس اکبرِ دلی سے کیا نہیں ہو سکتا؟ آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ جب اکبر کا جذبِ اندرونی بہت بڑھ گیا ہے تو اکبر کی نگاہ سے بیمار راضی ہو جانے لگے۔ اکبر کا دھیان کرنے سے لوگوں کی مُرادیں بر آنے لگیں۔ دُور دراز کی باتیں اکبر کے دِل میں مُنکشف ہو جانے لگیں

؎ عِشق ہو راست کرامات نہ ہو کیا معنی
حسب ارشاد ہی سب بات نہ ہو کیا معنی

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حضرت محمدؐ۔ عیسیٰؑ۔ ہندؤں کے رشی مُنی مہاتما کن کن کی بابت ایسا نہیں سُنا گیا؟ اضلاع متحدہ امریکہ میں آج ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جن کے نئے امراض کا علاج سوائے خُدا میں یکسُو دِلی کے اور کسی طریق سے کرنا سخت ترین قسم اور بدترین کُفر سے

بھی بُرا ہے

؎ اَوشدھی کھاؤں نہ بُوٹی لاؤں نہ کوئی بَید بُلاوں
پُورن بَید ملے ابناشی واہی کو نبض دکھاؤں

مولانا جلال رُومی

؎ شاد باش اَے عشقِ سودائے ما
اَے دَوائے جملہ عِلتہائے ما
اَے دَوائے نخوت و ناموسِ ما
اَے تو افلاطون و جالینوسِ ما

(اَے میرے پاگل پن کی واہ وا! اَے میری تمام بیماریوں کی دَوا! اَے میرے غرور وشرم کی دَوا! اَے میرے افلاطون وجالینوس! تُو خوش ہو)

حال میں سائیکالوجی آف سجشن (Psychology of suggestion) کی عِلمی تحقیقات نے امریکہ کے سرکاری شفا خانوں میں علاج بلا دوا جائز کرا دیا۔ اکبرِ دلی - اسلام - بشواس اگر رائی کے دانے بھر بھی ہو تو پہاڑوں کو ہلا سکتا ہے - میرے پیارے نوجوانانِ ہند! گئی گذری اٹھارھویں صدی کے ڈیوڈ ہیوم (David Hume) وغیرہ کے بھڑے میں آکر جہل کا نام عِلم مت رکھو۔ بجائے اسلام اور بشواس کو کم کرنے کے راسخ الاعتقادی اور محبّتِ عالمگیر کو بڑھاتے کیوں نہیں؟ اگر برق اور دُخان کی طاقتیں بیان سے باہر ہیں۔ تو قلبِ انسان کیا نہیں کرسکتا؟ بلا لحاظ قوم و ملّت و مُلک کے ہر فردِ بشر

کے ساتھ وہ اُنسِ انسانی جو سچا انسان بناتا ہے۔ اتنا جوش سے بھرا پیدا کرو جو کُنبے کے دو ایک آدمیوں میں خرچ کر رہے ہو۔ مُلک کی مٹی تک کو عزیز بنا کر دیکھو۔ یہی دُنیا جنّتِ رضواں کو مات نہ کردے تو کہنا۔ کیا تُم نے دِل کو عداوت سے بالکل پاک اور کینہ سے شیشے کی طرح صاف کرنے کا تجربہ کبھی کیا تھا؟

ع جفا کُنیم و ملامت کشیم و خُوش باشیم
کہ در طریقتِ ما کافری ست رنجیدن

(ہم وفا کرتے ہیں۔ ملامت کو پی جاتے ہیں اور خوش رہتے ہیں
کیونکہ رنج کرنا ہماری مِلّت میں کُفر ہے)

اگر یہ امتحان ابھی تک نہیں کیا تو تُم اُس کے نتیجوں کو رد کرنے کے بھی مجاز نہیں۔ یوگ درشن میں لکھا ہے۔ جب ہم میں محبّتِ کُلّی (اہنسا) مضبوط طور پر قائم ہو جائے تو آس پاس کے جنگلی دِرند و گزند وغیرہ میں بھی عداوت نہیں رہ سکتی۔ اگر عمل و جوابِ عمل (ایکشن اور ری ایکشن = action and reaction) کی مساویت کا مسئلہ دُرست ہے تو کیوں ایسا نہ ہوگا؟

علم نُما جہل یا عقلِ ظاہر بیں کی رُوحانی بدہضمی کے دائمی ہو جانے سے شک کی مُہلک تپِ دِق پیدا ہوتی ہے۔ یہی کُفر ہے جو اسلام (شردّھا۔ بشواس) رُوحانی زندگی کو چُپکے چُپکے کھا جاتا ہے۔ دِل میں شک رکھتے ہو؟ اس کے بجائے بندُوق کی گولی کیوں نہیں مار لیتے۔

جیسے عوام کشف و کرامات (خرقِ عادت) کہتے ہیں کیا اِکی

خاطر اسلام اور اکبر دلی درکار ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسلام اور اکبر دلی تو فی نفسہٖ مُسرت ہیں۔ جب کبھی آپ اپنے بڑے افسر سے ملنے اُس کی کوٹھی پر جاتے ہیں تو کیا افسر کے اُس کُتےّ کی خاطر جاتے ہیں جو کوٹھی کے دروازے پر دُم ہلاتا ہُوا تُمہارے پَیر سُونگھتا ہے؟

؎ خرقِ عادت کے بکار آید دلِ افسردہ را
گو رود بر آب نتواں معتقد شُد مُردہ را

(اگر مُردہ پانی پر چلنے لگے تو اس میں کوئی اعتقاد نہیں آتا۔ تو کرامات مردہ دِل کے کام میں کب آسکتی ہے؟)

ایک دفعہ درباریوں کے امتحان کے لئے اکبر نے ایک خط کھینچا اور کہا۔ "اُسے چھوٹا کردو"۔ کوئی نیچے سے کوئی اوپر سے کوئی وسط سے خط کو کاٹنے لگا۔ اکبر بولا "یُوں نہیں! یُوں نہیں! بغیر کاٹے یا مٹائے کم کرو۔" بیربل نے اُس سے بڑی لکیر پاس میں کھینچ کر کہا "یہ لو تُمہارا خط چھوٹا ہوگیا" واہ وا! اسی طرح اگر تُمہیں کسی مشرب و ملت کا رشک ہے تو اس خط کو مٹاتے یا کاٹتے مت پھرو۔ مذہبی دنگے ٹھیک نہیں۔ یہ حِکمت دُرست نہیں۔ تُم اپنے دِل کو اُن کے دِل سے وسیع تر بنا دو۔ اپنے پریم بھگتی کو اُن کے پریم سے بڑھا دو۔ اپنی اُلفتِ انسانی کو اُن کی اُلفت سے دراز تر کردو۔ اپنی ہمت کو بلند تر کردو۔ اپنے خیال کو فراخ تر کردو۔ حقیقت (پرمیشور) اپنے یقین (بشواس) کو بڑے سے بڑا یعنی اکبر بنا دو۔ دُنیا کی ظاہری جھلک اسماء و اشکال کی چمک دمک۔

اس نمود و پدید کی گوناگونی۔ صورتہائے ناپائدار کی بُو قلمونی خواہ کسی کی آنکھوں کو اندھا کردے۔ فلاسفر اور پروفیسر اس سُراب میں پڑے ڈوبیں۔ حاکم اور اسیر اس دامِ عنکبوت میں پھنسے پڑے رہیں۔ پنڈت اور عالم لہروں میں اُلجھے رہیں۔ جوان اور بوڑھے اس خواب میں پڑے مریں۔ لیکن تمہیں ذاتِ حقیقی کو کبھی نہ بھولنا ہوگا۔ تمہیں اپنی آنکھ حقِ مطلق سے نہ اُٹھانی ہوگی۔ اَے اہلِ یقیں! اَے حقیقت بیں! پھر دیکھ مزا۔ کس کا رشک اور کیسے حریف؟

قمریاں عاشق ہیں تیری سروِ بندہ ہے ترا
بُلبُلیں تجھ پر فدا ہیں گُل ترا دیوانہ ہے

ظاہری ہندوپن۔ مسلمان پن۔ عیسائی پن وغیرہ مختلف پیالوں کی طرح ہیں۔ جن میں پاکیزہ عشق۔ عالمگیر کا دودھ پلانے کی کوشش وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔ لیکن ان سب پیالوں کا دودھ ان سب مشربوں کی جان نفیٔ انانیت یا عشقِ حق ہے۔ ؎

مذہبِ عشق از ہمہ ملّت جُدا ست
عاشقاں را مذہب و ملّت خُدا ست

(عشق کا مذہب تمام ملّتوں سے جُدا ہے۔ عاشقوں کا مذہب و ملت خُدا ہے)

اُن پُرانے پیالوں کی طرح حضرت اکبر نے بھی ایک نیا جام گڑھا یعنی نئی رسوم و قواعد میں وُہی پُرانا آبِ حیات ڈالا۔ اس نئے جام کا نام رکھا گیا۔

(دینِ الٰہی

جو آزاد روی کا مشرب تھا۔ ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کر دینا اس کا مقصد تھا۔ پیالہ خوب ستھرا تھا۔ مگر پیالوں سے ہماری بھوک یا پیاس نہیں بجھ سکتی۔ پیالے تو پیشتر سے بھی بہت موجود ہیں۔ ہم کو تو دودھ چاہئے یا شراب سہی۔ جگر کی آگ تو وحدت کی آبحیات سے بجھتی ہے۔ اکبر دلی درکار ہے۔ خواہ کسی پیالہ میں دیدو۔ پرانا ہو کہ نیا۔ زرین ہو کہ سفالی

ع جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شئے لا

پیالہ پرستی سے نفاق بڑھتا ہے۔ یہ سب پیالے بذاتِ خود تو بت ہیں۔ آخر یہ بت پرستی کہاں تک۔ مبارک ہے۔ وہ مستِ حقیقی جو بتوں سے اصل کو آیا اور مجاز سے حقیقت کو پہنچا۔ مارے سرورِ ذات کے جس کے ہاتھ سے پیالہ چھوٹ گیا۔ پھوٹ گیا۔ اور ٹوٹ گیا۔ لا مذہب۔

ع قدحے بلبم بود شکستی ربی

(اے رب! پیالہ میرے لب پر تھا اور تو نے اُسے توڑ دیا)

مبارک ہے وہ دلہن جس کے بستر و پردہ کو۔ جس کے کپڑوں گہنوں کو۔ جس کے حجابِ عروسی کو عینِ محبت میں خاوند آکر اتارتا ہے۔ یہ بناؤ سنگار۔ یہ پوشاک لباس۔ پہنے ہی کس کے لئے تھے؟

ع ایں خرقہ کہ می پوشم در رہنِ شراب اولیٰ

(یہ گدڑی جو میں پہنے ہوں اعلےٰ درجہ کی شراب کے لئے رہن ہے)

یہ مبارک موتیوں والا جب تو لیشنوں کے مندر میں جاتا ہے۔

تو کرشن کی مورتی اُس سے موتی مانگ ہی لیتی ہے۔ آنسو نکلوا کر چھوڑتی ہے

؎ ہاتھ خالی۔ مردمِ دیدہ بُتوں سے کیا ملیں
موتیوں کی پنجۂ مژگاں میں اِک مالا تو ہو

مُسلمانوں کی مسجد میں گزر ہو تو

؎ سجدۂ مستانہ ام باشد نماز
مُصحفِ رُوئش بوَد ایمانِ من

(مستانہ جھکنا میری نماز ہے۔ اور پیارے کے چہرے کا چومنا میرا ایمان ہے)

کا حال ہوتا ہے۔ بیشک کچھ نہیں ہے ما سوا اللہ کے۔ عیسائیوں کے گرجاؤں میں وہ خودی و جسمانیت کا صلیب پر معلّق نظّارہ اپنے ساتھ صلیب پر کھینچے بغیر کب چھوڑتا ہے۔

نہ دارِ آخرت نَے دارِ دُنیا در نظر دارم
زعشقت کار چوں منصُور ما دارِ دگر دارم

(میری نظر میں نہ دارِ دُنیا ہے نہ دارِ عاقبت۔ بلکہ بہ سبب تیرے عشق کے میری دار (سُولی یا دُنیا) مانند منصُور دوسری ہی ہے)

کیا یہ اکبرِ دلی اکبر ہی کے لئے مخصوص تھی اور ہم سے تُم سے بالکل بعید ہے؟ کیا یہ سُلطانِ دلی ظاہری سلطنت ہونے پر موقوف ہے؟ ہرگز نہیں۔ عیسےٰ کے ہمرکاب کوئی نَو سو گھوڑے تو نہیں چلتے تھے۔ لیکن اُس کی برکتِ دِل کی بدولت لاکھوں نہیں کروڑوں یورپ

کے مہذب باشندے غریب عیسے کے نقشِ پا پر چلنے میں نجات مانتے ہیں۔ کیا بنجر عرب اور کیا عرب کا ایک ان پڑھ یتیم جنگلوں میں رہنے والا جس کے دِل میں شعلۂ اسلام (یقین کی آگ) بھڑک اُٹھی "نہیں ہے کچھ بھی سوا اللہ کے" ریگستان عرب کے بیجان ذرے اس آگ نے بارُود کے دانے بنا دیئے اور اس ریت کی بارُود آسمان تک اُچھلتے اُچھلتے تھوڑے ہی عرصہ میں ایشیاء کے اس سرے سے لیکر یُورپ اور افریقہ کے اُس سرے تک پھیل گئی۔ مشرق و مغرب کو احاطہ کرلیا۔ دہلی سے گرینیاڈا تک گھیر لیا۔ ہائے غضب! ایک دِل۔ غریب دِل۔ بادشاہ کا نہیں عالم کا نہیں۔ ایک اُمّی یتیم کا اور یہ خُدا دِلی! اب کون کہے گا کہ بادشاہ دِلی (اکبر دلی) بیرونی بادشاہت کی محتاج ہے؟

بیرُونی بادشاہت تو بادشاہ دلی کی سدِّ راہ اور مزاحم ہے۔ بُدھ بھگوان کو بادشاہ دِلی کی خاطر ظاہری بادشاہت کو ترک کرنا پڑا۔ اُونٹ پر چڑھ کر اُونٹے نہ لینا تو ٹیڑھی کھیر ہے۔ اسبابِ ظاہرداری اور سامانِ دُنیوی کے بیچ میں رہ کر پانی میں کنول کی طرح بے لوث رہنے کا سبق ہمیں آج کل درکار ہے۔ اور یہ سبق پچھلے زمانہ میں مہاراجہ جنک۔ اجات شترو۔ بھگوان رامچندر اور وہ میدانِ جنگ میں نغمۂ یزدانی گانے والا دے گئے تھے۔ وُہی عملی سبق آج تین سو سال ہُوئے شہنشاہ اکبر نے روشن طریق پہ ہمیں پھر دیا۔ مصلحتِ وقت یہی ہے کہ خواہ کسی حالت میں ہو اکبر دلی حاصل کرو۔

پیارے اہل ہند! مایوس نہ ہو جیئے۔ یہ بیج اُگے بغیر نہیں رہ سکتے۔ قدرتِ کاملہ اس کھیتی کی دہقان ہے۔ پشواس (ایمان) سے عاری ہوں تمہارے دُشمن۔ یقین سے بے نصیب تمہاری بلا ہو۔ میری جان! مٹی کے ڈھیلوں پر اناج کا بیج تو اُس قدرت سے اُگ آتا ہے۔ تو کیا انسانوں کے ساتھ ہی خُدا نے مخول کرنا تھا کہ سرزمینِ دل میں تخمِ اکبر دلی نہ اُگے گا؟

میدان مار لینا تو غیر اختیاری امر ہے۔ لیکن دل کا مارنا تو تُمہارے بس کا کام ہے۔ اور سچ تو یُوں ہے کہ جو صاحب دل ہوگیا۔ وہ صاحبِ دُنیا بھی ہوگیا

؎ مارنا دل کا سمجھتا ہُوں جہادِ اکبر
وُہی غازی ہے بڑا جس نے یہ کافر مارا

اور جو یہ کہا کرتے ہیں

؎ دل بدست آور کہ حجِ اکبر ست
از ہزاراں کعبہ یکدل بہتر ست
کعبہ بنگاہِ خلیلِ آذر ست
دل گُذرگاہِ جلیلِ اکبر ست

(کسی کے دل کو قابو میں لانا ہی بڑا حج ہے کیونکہ ہزاروں کعبوں سے ایک دل بہتر ہے۔ کعبہ کی بنیاد حضرت خلیل آذر کی ڈالی ہُوئی ہے اور دل خداوند کریم کی گُذرگاہ ہے)

فنہاں اپنے ہی دل کی تسخیر معنی خیز ہے۔ اگر وہ ظاہری سلطنت تمہیں نصیب نہیں۔ تو کم از کم ایک ولایت میں تو حکمراں

ہو سکتے ہو۔ وہ کون ؟ ولایتِ دِل۔ سلطنتِ قلبی

؎ دِل پر بھی نہ قابو ہو تو مردانگی کیا ہے ؟
گھر میں بھی نہ ہو صُلح تو فرزانگی کیا ہے ؟

؎ اگر تن را نباشد دِل منوّر زیرِ خاکش کُن
نباشد در شبستاں عزّتے فانوسِ خالی را

(اگر تن میں دِل روشن نہیں تو اُسے مٹّی میں دبا دے کیونکہ رات کے وقت خالی فانُوس کی عزّت نہیں ہوتی)

حقیقی بادشاہ وُہی ہے جو

؎ غم و غُصّہ و یاس و اندوہ و حِرماں
عناد و فساد۔ عملہائے شیطاں

کو اپنی ولایت میں بھٹکنے نہ دے

منبعِ قوّت

کامیابی بخش اتّفاق صرف نیکی میں ہو سکتا ہے۔ جو لوگ غُلامِ نفس رہ کر ترقی کی اُمید کرتے ہیں۔ جو لوگ بُرائی کی نیّت سے مِلتے ہیں۔ جہالت کے قائم رکھنے کو اتّفاق کرتے ہیں۔ وہ ریت کے رستے بٹتے ہیں۔ اُنہیں صعودِ عالم رایوو لیوشن Revolution کا بہاؤ۔ مشیّتِ ایزدی کا دباؤ۔ دریائے پستی میں جا غرقاب کرتا ہے۔ زور صرف پاکیزگی میں ہے۔ یہ وہ قانونِ قُدرت ہے کہ اُس کی آنکھوں میں نُون کوئی نہیں ڈال سکتا۔ اگر تھوڑا بہت تجربہ حاصل کر چکے ہو تو اپنے دِل سے پُوچھو۔ ہے کہ نہیں ؟ لارڈ ٹینی سن

کا سر گلاہڈ (Sir Galahad) کہتا ہے۔

My strength is as the strength of ten
Because my heart is pure.

دس جوانوں کی مجھ میں ہے طاقت
کیونکہ دل میں ہے عفّت و عصمت

پاکیزگی و راستی (شُدّھی و سچّائی) یقین اور نیکی۔ اسلام اور اکبرِ دلی سے بھرا ہُوا آدمی عِلم ترقی ہاتھ میں لئے جب قدم بڑھاتا ہے تو کس کی مجال ہے کہ آگے سے ہِل نہ جائے؟ اگر تمہارے دِل میں یقین اور راستی بھری ہے تو تُمہاری نگاہیں لوہے کے ستُون چیر سکتی ہیں۔ تمُہارے خیال کی ٹھوکر سے پہاڑوں کے پہاڑ چکنا چُور ہو سکتے ہیں۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔ دُنیا کے بادشاہو! یہ شاہِ دِل تشریف لا رہا ہے۔ سخت پتھر کی طرح مُلک میں صدیوں کے جمے ہُوئے تعصّبات اس کے پاؤں کی آہٹ پا کر اُڑ جائیں گے۔ اہلیا کی شِلا اس رامؔ کے چرن چھُوتے ہی دیوی ہو کر آسمان کو سِدھارے گی۔ عصائے اکبرِ دِلی قُلزم کو مارو۔ اور وہ رستہ دیدے گا۔ سب سے پہلے مُسلمان (خود حضرت محمدؐ) کا قول ہے "اگر میرے دائیں طرف سُورج کھڑا ہو جائے۔ اور بائیں طرف چاند۔ اور دونوں مجھے دھمکا کر کہیں کہ چل ہٹ پیچھے" تو بھی مَیں کبھی نہیں ہٹ سکتا۔

؎ اگرچہ قطب جگہ سے ٹلے تو ٹلجائے
اور آفتاب بھی قبلِ عروج ڈھلجائے

کبھی نہ صاحبِ ہمت کا حوصلہ ٹوٹے
کبھی نہ بھوے سے اپنی جبیں پہ بل آئے

صفا قلبی۔ راست باطنی یا اکبر دِلی میں یہ زور ہے۔ خوفِ دِل اس کے بغیر دُور نہیں ہوتا۔ بیم ورجا اس کے بغیر جان کھا جاتے ہیں۔ اور خوف وُہ بلا ہے کہ مرد کو نامرد کرتا ہے۔ ساری طاقت کے ہوتے کچھ ہونے نہیں دیتا۔ جیسے اندھیرے میں عموماً بِنیرہ فعل کے سوا اور کوئی کام بن نہیں پڑتا

Deeds of darkness are committed in the dark

اسی طرح جب دِل میں یقین اور اکبر دِلی کی روشنی نہ ہو تو انسان سے کوئی کارِ نمایاں بن نہیں پڑتا۔ جس قدر پاکیزگی اور یقین دل میں زیادہ گہرے ہوں گے۔ اُسی قدر ہمارے کام زیادہ روشن ہوں گے

ع نفس بہ نَے چو فرو شُد بلند میگردد
(دم جب بانسری میں نیچے اُترتا ہے تو آواز اُونچی ہوتی ہے)

دُنیا کے خوف و خطرے

ع غم و غصّہ و یاس و اندوہ و حرماں

تب تک تمہیں ضرور ہلاتے رہیں گے۔ جب تک دُنیا کے۔

ع نقش و نگار و رنگ و بُو تازہ بتازہ نَو بنَو

تمہیں ہلا سکتے ہیں۔ اور جب تم دُنیا کے لالچوں اور دھکیوں سے ہلتے نہیں تو تم دُنیا کو ضرور ہلا دوگے۔ اس میں جو شک کرتا ہے وہ کافر ہے۔

اتفاق و اتحاد

اکبر دِلی کا ہندی یا سنسکرت ترجمہ ہوگا مہا آتما (مہان + آتما) یعنے بُزرگ رُوح۔ وہ آدمی اکبر دِل یا مہاتما ہرگز نہیں ہو سکتا جس کا دِل تنگ ایک محدود چھوٹے سے دائرے میں بند ہے۔ جس کی ہمدردی صرف ہندُو مسلمان یا عیسائی نام سے وابستہ ہے اور اُس سے پرے نہیں جا سکتی۔ وہ تو اصغرِ دِل ہے۔ اکبرِ دِل نہیں۔ گھُو آتما ہے۔ مہاتما نہیں۔ اکبرِ دِلی کا تو حال یہ ہے۔

ہر جان میری جان ہے ہر ایک دِل ہے دِل مِرا
ہاں! بُلبُل و گُل۔ مہر و مہ کی آنکھ میں ہے تِل مِرا
ہندو مُسلماں۔ پارسی۔ سکھ۔ جَین عیسائی۔ جھود
ان سب کے سینوں میں دھڑکتا ایکساں ہے دِل مِرا

جاپانی بچہ جب اسکُول میں جانے لگتا ہے تو ایک نہ ایک دن اُستاد شاگرد میں ذیل کا سلسلۂ گفتگُو ضرور چھِڑتا ہے۔

اُستاد۔ تُم کتنے بڑے ہو؟ جب بچّہ اپنی عُمر بتاتا ہے تو پھر
اُستاد۔ تُم اتنے بڑے کیونکر ہُوئے؟
بچّہ۔ خوراک کی بدولت۔
اُستاد۔ یہ خوراک کہاں سے آئی؟
بچّہ۔ ہمارے مُلک جاپان کی زمین سے پیدا ہُوئی (بیشک اگر نباتی غذا ہے تو براہ راست اور اگر حیوانی غذا ہے تو بذریعہ جسم حیوان زمینِ مُلک ہی سے تو آتی ہے)

اُستاد۔ پس تمہارا جسم انجام کار جاپان کی مٹّی سے پھلتا پھیلتا ہے۔ اور جاپان ہی نے بنایا ہے۔ اگر والدین سے پیدا ہوئے ہو تو آخر ماں باپ کی طاقت بھی تو خوراک ہی سے آتی ہے۔

بچّہ۔ جی ہاں!

اُستاد۔ پس جاپان کو اختیار ہے جب مناسب سمجھے یہ جسم لیلے۔

بچّہ۔ جی ہاں! میرا کوئی عُذر جائز نہ ہوگا۔

چلو! اتنی بات سے ننھّے بچّے کے ہر رگ و ریشہ میں مُلک پر جان نثاری کا خیال ہمیشہ کے لئے کُھب گیا۔ قابلِ تحسین ہیں وہ چھوٹے چھوٹے بچے جن کو یہ موٹی سی بات ذہن میں سما جاتی ہے اور عمل میں آجاتی ہے۔ ہمارے مُلک میں اِدھر تو وِدوان پنڈت اور اُدھر عالِم و فاضل مولوی صدیوں میں علاً اتنا نہ سمجھے کہ چونکہ ہم ہندو اور مسلمان ایک ہی ماں (ہندوستان) سے پیدا ہوئے ہیں اور اُسی کے دُودھ سے پلتے ہیں۔ چونکہ ہم ہندو اور مسلمان دونوں کی رگوں میں خُون ایک ہی نباتات آب و ہوا وغیرہ سے پیدا ہو رہا ہے۔

تو ہم حقیقی بھائی ہیں

یورپ کے کسی مُلک کا شخص جب امریکہ میں جا بستا ہے۔ تو دو تین سال کے قیام میں اُس کی کُل ہمدردی اور محبت امریکہ کے پڑوسیوں سے ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ اُس کے ہم مذہب ہوں یا نہوں۔ یہ نہیں کہ جسم تو امریکہ میں اور دل اُس پُرانے مُلک میں رہے۔

یورپ کے اکثر لوگ عیسائی مذہب کے ہیں۔ اور بعض اُن میں حضرت عیسیٰ کے نام پر جان فدا کرنا عین راحت سمجھتے ہیں۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی عیسیٰ کی قوم عیسیٰ کے مُلک کو اپنی قوم یا مُلک سے زیادہ عزیز نہیں رکھتا۔

راقم محبت سے کہتا ہے اور محبّت (پریم) وہ چیز ہے کہ اُس کی سختی بھی گوارا ہوتی ہے۔ پیارے اہلِ اسلام! یہ تفرقہ کیوں کہ بقول شاعر۔

ع سر ہے کہیں۔ دِل کہیں۔ جان کہیں ہے

صدیوں سے ہندوستان میں رہتے ہیں تو دِل ہندو لوگوں سے الگ کیوں رکھے جائیں!

اِدھر ہندو پنڈتوں سے ہمارا یہ کہنا ہے" مریادا پرشوتم بھگوان کے شبری (بھیلنی) کے جھُوٹے بیر۔ غریب ملاح سے پریم۔ بندروں سے گرویدہ کر لینے والی مُحبت۔ دُشمن کے بھائی پر وہ شفقت ذرا یاد تو کرو اور ذرا یہ بھی یاد تو کرو کہ لفظ "پنڈت" کی مندرجہ ذیل تعریف کون کر گیا ہے۔ دونوں جانب سے لڑنے مرنے کو فوجیں ڈٹ رہی ہیں۔ سارے ہندوستان کے شہ زوروں کے دِل مارے غصّے اور فساد کے گویا آسمان تک اُچھل رہے ہیں۔ ایسے موقع پر زبان حال سے اور قال سے جگت گورو (نور بخشِ عالم) کیسے صاف اور سُریلے گیت میں تمہارے لئے پیغام (حُکم) چھوڑ گیا ہے۔ ہزار سال ہوگئے آکاش نے اپنے ڈاکخانہ میں اس چِٹھّی پر گرد کا نام نہ پڑنے دیا۔ قاصدِ ہوا اسے اپنے پروں سے باندھ۔ شمال جنوب

مشرق و مغرب پرانی دنیا۔ نئی دنیا۔ نصف کرۂ شمالی۔ نصف کرۂ جنوبی۔ جاپان۔ یورپ۔ امریکہ۔ اسٹریلیا۔ سب جگہ پہنچا آیا۔ آفریں ہے۔ اُس کبوتر کی وفاداری کو! غیر ملک کے لوگ اس مراسلے پر عمل کرکے دن دونی رات چوگنی ترقی پا رہے ہیں۔ پر ہائے تم نے جن کے لئے یہ شُرتی (وحی) پہلے پہل نازل ہوئی تھی۔ اُسے عملی برتاؤ کے وقت بہانوں ہی میں ٹال دیا۔

پنڈت کی تعریف

ماہرِ علم و فن برہمن میں
گائے میں۔ فیل میں کہ دشمن میں
سگ میں۔ سگ کش میں یک نگاہی ہو
دل میں اُلفت ہو اور صفائی ہو
جس میں اس ایکتا کی رنگت ہے
وُہی پنڈت ہے وُہ ہی پنڈت ہے

(بھگوت گیتا۔ ادھیائے ۵ اشلوک ۱۸)

"ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے"

پنڈت تو وہ ہے جس کی چشمِ محبت وا ہے۔ جو گیان اور پریم کے جوش میں حیوانات۔ نباتات بلکہ پاشان پتھر تک میں بھی اپنے ٹھاکر بھگوان کو دیکھتا اور پوجتا ہے۔ چہ جائیکہ پنڈت وہ کہلائے جسے حضرت انسان کے سائے سے نفرت ہو۔ مسلمان کو چھونا پاپ جانے۔ اور عملاً پتھر (پرتما) ہی میں بھگوان مانے۔

اکبر کے پاس اُس کے کوکے کی کئی دفعہ شکایت آئی۔ بار بار کی

بغاوت اور کئی مرتبہ کی سازش کی خبریں اکبر نے اس کان سے سُنکر اُس کان سے نکالدیں۔جب ہوا خواہانِ دولت نے سخت گلہ کیا کہ جہاں پناہ! اس قدر نرمی و رعایت کیوں روا رکھی جا رہی ہے۔ تو جواب دیا کہ "تم لوگ نہیں سمجھتے کہ میرے اور اُس کوکا بھائی کے درمیان دُودھ کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔جس کو چیرنا میرے لئے ناممکن ہے۔ مَیں بھلا کیونکر اس پر عتاب کرسکتا ہُوں؟"

کیا اکبرِ دِلی ہے! آفریں!

اکبر اور اس کے کوکا نے ایک ہی راجپوت ماں کا دُودھ پیا تھا۔ کیا ہندو اور مسلمان ایک ہی ماں (ہندوستان) کا دُودھ نہیں پی رہے ہیں؟

پچھلی شکایتیں بھُول جاؤ۔ گِلے غُصّے سب معاف۔رُوٹھے منائے گئے۔

ے گر ز دستِ زُلفِ مُشکِینت خطائے رفت رفت
ور ز ہندوے شُما بر ما جفائے رفت رفت
گر دِلے از غمزۂ دلدارِ یارے بُرد بُرد
درمیانِ جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

(اگر تیری مُشکیں زُلف کے ہاتھ سے کوئی خطا ہوگئی ہے تو جانے دے۔ اگر تمہارے غلام (سیاہ تل) سے کوئی ظُلم ہم پر ہوگیا ہے تو اُسے بھُول جاؤ۔ اگر دلدار کے اشارہ سے کوئی دِل چھین لیا گیا تو چھین جانے دو۔ اور عاشق و معشوق کے بیچ میں اگر جھگڑا ہے تو اس کا خیال مت کرو)

۵ تارے کب روشنی سے نیارے ہیں
تُم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں
اَے عدُو! اینٹھ لے۔ بگڑ تن لے
سخت کہدے کہ سُست ہی کہدے
جوشِ غُصّہ نکال لے دِل سے
طاقتِ طیش آزما تُو لے
مجھے بھی اِن تری باتوں سے روک تھام نہیں
جگر میں دھام نہ کرلُوں تو رام نام نہیں
اوم ! اوم!! اوم !!!

عملی ویدانت اور آتم ساکھشات کار

(یہ لیکچر فیض آباد میں ستمبر ۱۹۰۵ء میں ہُوا تھا)

اوّل سوامی جی نے امریکہ کے کچھ حالات بیان کرکے فرمایا کہ وہاں عملی ویدانت کا برتاؤ ہوتا ہے اور اسی سے وہ مُلک خوشحال ہے۔ اور عملی ویدانت وہ ہی ہے جو اپنے آپ کو سارا مُلک ہی نہیں بلکہ تمام عالم محسوس کرے اور اپنے آپ کو ایک جسم میں محدود کرنا ہی قید تنہائی جانے۔

اتنا چھوٹا نہیں حدود اربعہ
پگڑی جوڑا نہیں حدود اربعہ
ٹوپی جُوتا نہیں حدود اربعہ

مَیں ساڑھے تین ہاتھ کے ٹاپُو (جسم) میں مقید نہیں ہُوں۔ بلکہ سب کی آتما سب کا اپنا آپ مَیں ہی ہُوں۔ پاتال دیش کے لوگوں نے بھی اس بات کو تسلیم کرلیا ہے۔ ہر ایک کو نیزہ کی چوٹ کے تلے یا قُدرت کے ڈنڈے کے زور سے منظور کرنا پڑے گا۔ کہ سوائے آتما کے اور کوئی جگہ آنند کی نہیں ہے۔ آنند کا مخزن اگر ہے تو وہ صرف اپنا آپ ہے۔ اُسی میں آزادی ہے۔ اُسی میں

شانتی و سرور ہے۔ شراب پینا لوگ کیوں نہیں چھوڑتے؟ آپ لوگ ہزاروں جتن کرتے ہیں۔ ٹمپرنس سوسائٹیاں ہر وقت اُس کے ترک کرنے کا اُپدیش کرتی رہتی ہیں۔ مگر کیا وجہ ہے کہ تسپر بھی لاکھوں اشخاص اس رد کردہ شراب کو نہیں چھوڑتے؟ وجہ یہی ہے کہ یہ اپنے آتم دیو کی کچھ تھوڑی سی جھلک (آزادی) دکھلا دیتی ہے۔ قیدِ تن سے تھوڑی مُدت کے واسطے رہائی بخشتی ہے۔ ہائے آزادی! ہرایک شخص اسی کا خواہاں ہے۔ تمام اقوام و ملت میں آزادی آزادی ہی کا ہر وقت شور سُنتے ہیں۔ بچے بھی اسی کے مشتاق ہیں۔ اتوار سب دنوں کی نسبت زیادہ پیارا بچوں کو کیوں لگتا ہے؟ صرف اس واسطے کہ وہ اُن کو ذرا آزادی دلاتا ہے۔ یعنی اُس روز بچوں کو چھٹی ملتی ہے۔ یہ چھٹی کا دن بچوں کو ہی خوش اور محظوظ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے نام سے اسکول ماسٹروں اور دفتر کے کلرکوں کے زرد چہرہ پر بھی سُرخی آجاتی ہے۔ غرضیکہ ہرایک کو آزادی کی لذت پیاری ہے۔ کیوں نہ ہو۔ آزادِ مُطلق تو اُس کی اپنی ذات ہے۔ اپنی ذات ہرایک کو بیشک پیاری سے بھی پیاری ہوتی ہے۔ البتہ جب کوئی پیارا اپنی ذات سے بیک طرف ہوکر دُنیاوی قیود و موجودات میں اس آزادی کے پانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خالی ہاتھ ہی آخرکار پاتا ہے۔ اس واسطے ہرایک تجربہ کار بول اُٹھتا ہے کہ دُنیا میں یا دُنیاوی پدارتھوں میں حقیقی آزادی ہرگز نہیں ملتی۔ کیونکہ حقیقی آزادی تو دیش۔ کال۔ وستو کے احاطہ سے پرے ہٹ کر یعنی قیودِ زمانی مکانی و نفسانی سے

رہائی پاکر ملتی ہے۔ نہ کہ اِس کے کیچڑ میں پھنسے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قیودِ نفسانی مکانی و زمانی میں پڑ کر تو سینکڑوں مُلک و اقوام اس آزادی کی خاطر لڑے اور مرے۔ رُوس اور جاپان کی لڑائی صرف اسی آزادی کے واسطے ہُوئی۔ مگر آزادی پھر بھی دُنیا میں عُنقا ہی رہی۔

پیارو! جو شخص اپنے سرُوپ یعنی آتما میں نشست رکھتا ہے۔ وہ آزاد ہی ہے کیونکہ آتما ہی منبعِ آزادی ہے۔اور جو شخص اپنے سُروپ یعنی آتما کا ساکھشات کار (انُوبھو۔ Self-realisation) نہیں کرتا۔ وہ نہ اس لوک (دُنیا) میں آزاد ہوسکتا ہے۔ اور نہ دُوسرے لوک (پرلوک) میں لازوال سُرورِ ذات کو حاصل کرتا ہے۔(धीरा: प्रेत्यास्माल्लोकादमृता भवंति (केनउप०२)

عارف لوگ اس دُنیاوی موجودات و قیود سے مُنہ موڑ کر (ایک طرف ہوکر) مُکتی کے امرت کو پراپت ہوتے ہیں۔ Deserted Village (اُجڑے گانوں) کے مصنّف گولڈ سمتھ (Goldsmith) اور ڈاکٹر جانسن (Dr Johnson) سے اس بات پر بحث ہورہی تھی۔کہ بات چیت کرنے میں اوُپر کا جبڑا ہلتا ہے یا نیچے کا۔ یہ سیدھی سادھی بات تھی۔مگر اُس بڑے مصنف کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔گو اُس بات پر اُس کا عمل تھا۔کیونکہ اگر اُس کا جبڑا ہلتا نہ ہوتا تو وہ بات چیت نہ کرسکتا۔ جیسے انگریزوں کے ہاں کراموبل۔ اور مسلمانوں کے ہاں بابر ہُوا ہے۔ اُسی طرح ہندؤں کے ہاں زمانہ حال میں رنجیت سنگھ ہُوا ہے۔ اس فخرِ ہندوستان

اور شیرِ نیستاں پنجاب کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ فوج دُشمن کی دریائے اٹک کے پار تھی۔ اور اُس کے آدمی اُس دریا کے پار جانے سے ہِجِکتے تھے۔ اُس نے اپنا گھوڑا اُس دریا میں یہ کہکر ڈال دیا۔

سبھی بھُوم گوپال کی یا میں اٹک کہاں
جا کے من میں اٹک ہے سو ہی اٹک رہا

اُس کے پیچھے ساری فوج دریا کو پار کر گئی۔ گو غنیم کی فوج کے سامنے یہ تھوڑے سے آدمی تھے۔ مگر اُن کی یہ جوانمردی دیکھکر دُشمن کی فوج کے دِل دھڑک اُٹھے۔ اور تمام کے تمام آدمی اُن کے حوصلہ کی تاب نہ لاکر بھاگ گئے۔ اور میدانِ جنگ بھارت کے اُس سُورما کے ہاتھ آیا۔ بات کیا تھی۔ اُس کے دِل میں بِشواس (یقین) یعنی اسلام کا جوش مَوجیں مار رہا تھا۔ رات بھر ایشور کے دھیان میں مگن رہتا تھا۔ اُس کی پرارتھناؤں میں خُون آنسُو ہوکر آنکھوں کی راہ بہہ نکلتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے اندر وہ بَل آگیا۔ آتم بَل۔ بِشواس بَل۔ یا اسلام کی طاقت سے وہ بھر گیا۔ یا دوسرے لفظوں میں یُوں کہو۔ کہ اُس نے آتما کا ساکھشات کار کیا۔ یہاں زبانی جمع خرچ کا کام نہیں۔ ساکھشات کار وہ چیز ہے۔ جہاں روم روم سے آنند نکلتا ہو۔ کہتے ہیں کہ ہنومان کے روم روم میں رَام لکھا ہُوا تھا۔ اسی طرح اس رنجیت سنگھ کے اندر بِشواس کا بَل بھرا ہُوا تھا۔ ایسے ہی ساکھشات کار والوں کو دریا بھی راستہ دیدیتا ہے۔ پہاڑ بھی اپنے سر آنکھوں پر اُٹھا لیتا ہے۔ دُنیا کی کامیابی کا یہ ہی گرُ اندر کی طاقت یا آتم بَل ہے

میرے اندر والا پرمیشور سرب شکتیمان ہے۔

ع وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

فریڈرک اعظم (Frederick the great) جرمنی کا بادشاہ فرانس کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اُس کی فوج ہار گئی اور اُس کو شکست فاش ہُوئی۔ کچھ لوگ مارے گئے۔ کچھ فرانسیسیوں کے ہاتھ آگئے۔ یہ بادشاہ علم دوست اور خُدا دوست تھا۔ اِس کو آتما کے ساکھشات کار کی کچھ ذرا سی بھنک (جھلک) آگئی تھی۔ اس نے اُن تھوڑے سے بچے کھچے آدمیوں سے کہا کہ دس پانچ آدمی ایک قسم کا باجا لیکر پُورب سے بجاتے ہُوئے آؤ۔ اور کچھ لوگ پچھم سے۔ اور کچھ اُتر سے۔ اور کچھ دکن سے۔ غرضیکہ وہ تھوڑے سے آدمی چاروں طرف سے باجا بجاتے ہُوئے اُس قلعہ کے اندر آنے لگے جس کو فرانسیسیوں نے چھین لیا تھا۔ اور یہ شیر مرد تن تنہا بغیر ہتھیار لئے ہُوئے اُس قلعہ میں گھُس گیا۔ اور بہ آواز بلند کہنے لگا کہ اگر اپنی جان سلامت لیجانا چاہتے ہو تو اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو۔ اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ ورنہ میری فوج جو چاروں طرف سے آرہی ہے تُم کو مار ڈالے گی۔ باجوں کی آواز چاروں طرف سے سُن کر اور اُس جوانمرد کی دلیری کو دیکھ کر وہ لوگ گھبرا گئے اور فوراً قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس جوانمرد نے اکیلے ہی اور بغیر ہتھیار کے اُس قلعہ پر فتح پائی۔ اور دشمنوں کو شکست فاش ہُوئی۔ بس دُنیا میں بھی اس آتم بل کی ضرورت ہے۔ اس ساکھشات کار کی ضرورت ہے۔ رام جان جان کر

بدیشیوں کے قصّے تُم کو سُناتا ہے۔ کہ تُم کو ذرا تو خیال آوے۔ یہ امرت یعنی آتما کا ساکھشات کار کرنا نکلا تو بھارت سے ہی۔ مگر فائدہ اُس سے اُٹھا رہے ہیں غیر مُلک والے۔ ہر ایک کو ضرورت ہے اس برہم ودیا کی۔ کیا دینی ترقّی اور کیا دُنیوی ترقّی دونوں کے واسطے بشواس یا ویدانت یا برہم ودیا۔ آتم ساکھشات کی ضرورت ہے۔ کیا تُم کو ضرورت نہیں ہے اس آتم ساکھشات کار کی؟ یہ ہی اندر کا آتم بل تمہارا کیرکٹر (character) ہے۔ اور بیرونی جھگڑے رگڑے تُمہارے آتم بل کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔ جب آدمی سیدھے طور سے اس کیرکٹر کو حاصل نہیں کرتا تو مصیبتیں اُس کے اندر سے آتم بَل کو اُبھار کر یہ کیرکٹر پیدا کر دیتی ہیں۔ قانونِ ایوولیوشن یعنی صعودِ عالم پُکار پُکار کر اسی اعلیٰ سبق کا اُپدیش کر رہا ہے اور یہ قُدرت کا قانُون ہے کہ جن میں بَل ہوگا۔ وہ ہی قائم رہیں گے۔ جس کے اندر ہمّت ہے اُسی میں طاقت ہے۔ اُسی میں زندگی ہے۔ ہمّت تو اندر کی چیز ہے۔ جہاں پر میشور ہے۔ وہاں ہی ہمّت ہے۔ ڈنڈے کے زور سے چلنا تو حیوانوں کا کام ہے۔ انسان سمجھ لیتا ہے اور کام میں لے آتا ہے۔

ع خود تو منصف باش اَے جاں ایں نکو یا آں نکو

(اے پیارے تُو خود انصاف کر کہ یہ اچھّا ہے یا وُہ)

کیا ضرورت ہے کہ نیچر (قُدرت) تم کو کوڑا مار مار کر سکھلائے؟ خوشی سے کیوں نہ سیکھو۔ اس جگت سے مُنہ موڑنا کیا ہے؟ ایک تو یہ کہ باہر کی چیزیں آپ کی نگاہ میں نہ رہیں۔ اور دوسرے

یہ کہ مُوتُو قبلؔ المُوتُو یعنی مرنے سے پہلے مرجانا ہے۔ یا سب کُچھ اُس ایشور (اپنے آتما) کے ارپن کر دینا ہے۔ جب سب باہر کی چیزیں اس طرح آہُوتی میں ڈال دی جاتی ہیں۔ تب تو تِرلوکی ناتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ کوئی بھی آدمی ترقی نہیں کرسکتا جب تک کہ اُسمیں آتم بل کا وشواس نہ ہو۔ جس میں زیادہ (آتم بل) ہے وہ آپ بھی بڑا ہے اور اوروں کو بھی بڑھاتا ہے۔

ے دھن بھُومی دھن دیش کال ہو
دھن دھن لوچن درس کریں جو

جس جنگل میں آتم ساکھشات کار والا جاتا ہے اُس میں ترو تازگی آجاتی ہے۔ جس مُلک میں ساکھشات کار والا پاؤں رکھتا ہے۔ وہ مُلک کا مُلک خوشحال ہو جاتا ہے۔ وِگیان سُروپ مہاتما وہ ہی ہے۔ جس سے پریم کا چشمہ بہ نکلتا ہے۔

رواں کُن چشمہائے کوثری را

یہ ہی سورگ کی ندیاں یا آتمانند کی ندیاں ہیں۔ کس کو اس پانی کی ضرورت نہیں ہے۔ گُل ہو یا گیاہ۔ گندم ہو یا کپاس۔ انسان ہو یا حیوان۔ سب ہی کو اس پانی کی ضرورت ہے

ع سُلیمانا بیار انگشتری را

جب انگشتری مل گئی۔ پھر بھٹکنا کس واسطے؟ کہاں تو تُمہارا سوراج اور کہاں تُم بھیکاری۔ کہاں تو تمہارا آنانند میں دھام اور کہاں یہ ہاڑ چام؟

ے سورج کو سونا چاند کو چاندی تو دے چُکے
پھر بھی طواف کرتے ہیں دیکھوں جدھر کو مَیں

یہ کوئی استعارہ نہیں ہے۔ سچّے واقعات ہیں۔ سیدھے سادھے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ سوائے پرمیشور کے تمہارا آتما کچھ اور نہیں ہے۔

جب پرمیشور میرا آتما ہے تو میں دُکھ میں کیسے رہوں۔ دُنیا میں لوگ ایسے ہوگئے ہیں جن کے اندر سے یقین کے چشمے بہ نکلے ہیں۔ اور اس آبِ حیات سے مُلک کے مُلک سیراب ہوتے چلے گئے ہیں۔ عرب میں کوئی ہوگیا ہے جس کے اندر سے اس یقین کی آگ بھڑک اُٹھی۔ یہ وِشواس یا یقین کبھی داسوہم کے بھاؤ میں اور کبھی شِوو ہم کے بھاؤ میں پرگٹ ہُوا کرتا ہے۔ وہ شیرِ عرب یوں سب کو دھاڑتا ہے۔

ع اگر سورج ہو میری دائیں طرف۔ اور ہو چاند بھی بائیں جانب کھڑا
کہیں مجھ سے گر دو نو "بس اب رُکو" نہ مانوں کبھی کہنا اُن کا ذرا

وہ جو اندر کا آتم بَل ہے اُس کے سامنے سُورج اور چاند کی کیا حقیقت ہے एकमेव द्वितीयो नास्ति دوِتیو ناستی یعنی "نہیں ہے کچُھ بھی سوائے اللہ کے" سیدھی سادھی بات ہے۔ مگر یقین کیوں نہیں آتا؟ یقین۔ بشواس۔ شرّدھا اور ایمان سب مترادف ہیں۔ اُس کا ایمان چلاگیا۔ یا وہ بے ایمان ہے۔ یہ بڑی بھاری گالی ہے۔ پھر کیوں نہیں۔ ایمان۔ یقین۔ شرّدھا یا وشواس لاتے؟ کس میں؟ اُسی ایک آتم دیو میں۔ جو پرانوں کا پران اور جانوں کی جان ہے۔ اگر یہ وِشواش ہو۔ تو سارے پاپ دُھل جاویں۔ اگر مُلک میں ایک شخص ایسا پَیدا ہو جاوے۔ تو مُلک کا مُلک سرسبز ہو جاوے۔

بس اپنی انانیت دُور کرو۔ خودی کو مٹا دو۔ اور اس پیالہ کے اندر جو آتم دیو کا آبِ حیات ہے۔ اُسی کو پان کرو۔ کس کو ضرورت نہیں ہے اس آبِ حیات کی؟ مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی۔ اور ہندو سب ہی تو اس آبِ حیات کی چاہ میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ع ایکو الف تیرے درکار

الف کو جاننا تھا۔ کہ آتم بل آگیا۔ برہم ست جگت متھیا یعنی "خدا حق ہے۔ اور سب کچھ ہیچ ہے"۔ اُس وِشواش کو لاؤ۔ جو دُھرُو میں آیا۔ پرہلاد میں آیا۔ نام دیو میں آیا۔ اِسی وشواش کی بدولت تمام شکوک و شبہات اور جھگڑے دُور ہو جاتے ہیں۔ دتاترے مست مہاتما ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے۔ آندھی آرہی تھی۔ چراغ کی روشنی یا چاند کی چاندنی سے اُن کا رُخِ انور ایک خراب عورت کو کوٹھے پر سے دکھائی دیا۔ اس مہر طلعت مہاتما کے تین دفعہ درشن پاتے ہی اُس عورت کے دِل کی تاریکی دُور ہوگئی۔ اور اُس کی حالت بدل گئی۔ مہاتاؤں کے درشن ہی سے وِشے باسنا (خواہشاتِ نفسانی) دُور ہو جاتے ہیں۔ کسی کا مہاتما ہونا ہی ساری دُنیا کو ہل چل میں ڈال دیتا ہے۔ چاہے وہ مُلک میں اُپدیش دے یا نہ دے۔ صرف مُلک کی حالت ہی نہیں بلکہ ساری دُنیا کی حالت اُس کے پیدا ہونے ہی سے بہتر ہو جاتی ہے۔ جس طرح کسی جگہ کی ہوا ہلکی ہو کر اُوپر کو اُڑتی ہے۔ تو اُس کی جگہ بھرنے کو چاروں طرف کی ہوا آجاتی ہے۔ اور سارے ایٹما سفیر (atmosphere) کُرۂ ہوا میں ہل چل پڑ جاتی ہے۔

اُسی طرح ایک مہاتما بھی ساری دُنیا کو ہلا دیتا ہے۔ اور اگر تُم مہاتما کے وجود ہی کو نہیں مانتے تو پھر کیسے اُس سے لابھ اُٹھا سکتے ہو۔ اگر تُم کو کسی نے سونے کی جگہ کوئی اور چیز دے دی۔ تو کیا اُس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ سونا ہے ہی نہیں۔ یا ساری دُنیا میں تانبا ہی ہے۔ جو سونے کو مانے ہی گا نہیں۔ وہ بھلا اُسے کہاں پائے گا۔ جہاں سچ ہے وہاں جھُوٹ بھی آجاتا ہے۔ مُلمّع کی موجودگی اصلی سونے کی بڑائی ظاہر کرتی ہے۔ نہ کہ وجود ہی کو اُڑا دیتی ہے۔ دُنیا کی تاریخ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص جس کی نگاہ میں برہم ہی برہم ہو۔ آنکھیں کھول کر دُنیا کے بازار میں گذرے۔ تو وہ ساری دُنیا کو پریم رُوپ دیکھکر خوش ہوتا ہے۔ اور جس کے اندر دُشمنی کی آگ شعلہ زن ہے۔ وہ اپنے ارد گرد دُشمنوں کو ہی پاتا ہے۔ اور تمام دُنیا دُشمنی سے ہی بھری ہُوئی اُس کو نظر آتی ہے۔

اس واسطے او پیارے متلاشئ آنند! ذرا نگاہ کو پھیر۔

؎ بیگانہ گر نظر پڑے تُو آشنا کو دیکھ
دُشمن گر آئے سامنے تو بھی خُدا کو دیکھ

؎ جو کچھ دیکھے جگت میں سب ایشور میں ڈھانپ
کرو چیَن اس تیاگ سے دھن لالچ سے کانپ

جس کی ایسی نظر ہو جاتی ہے۔ اُس کے لئے دُکھ اور شوک (رنج وغم) کہاں آسکتے ہیں۔ اور اُس کی موجودگی سے سارے دیش میں ہمّت اور طاقت آجاتی ہے۔ پس اے ریفارمرو! بتلاؤ آتم ساکھشات کرنا کتنا بڑا ریفارم ہے۔ پہلے اپنے آپ کا ریفارم کرو۔

یعنی اپنی نگاہ بلند کرو۔ پھر سارے مُلک میں ریفارم (اصلاح) آپ ہی ہو جائے گا۔ آج کل دُنیا میں جو سب سے بڑی یونیورسٹی ہے اُس کے پروفیسر ڈاکٹر ستاربک (Starbuck) دربارۂ کنورشن (تبدیلیٔ اعتقاد conversion) یوں رائے دیتے ہیں۔ کہ دماغ میں وشواس یعنی یقین سے ایک قسم کی لکیریں پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔ جب کوئی دُوسرا پختہ اعتقاد (strong faith) اُسی دماغ میں جگہ لینی شروع کرتا ہے تو سابقہ لکیریں مِٹ جاتی ہیں اور نئی پیدا ہو پڑتی ہیں۔ اس لئے ایک قسم کی سابقہ لکیروں کا مٹانا اور اُن کی جگہ وہاں دُوسری لکیروں کا پیدا ہو جانا۔ چال چلن کی تبدیلی یا تبدیلیٔ باطن (اندرونی تبدیلی) کہلاتا ہے۔ یہی اسلام۔ وشواس و یقین ہے۔ جس کے بغیر من کے سابقہ اثرات و داغ رفع نہیں ہوتے۔ اور من شُدھ نہیں ہونے پاتا۔

آج کل انگلینڈ اور امریکہ اسی یقین کی بدولت ترقّی کر رہے ہیں۔ یونان کہاں گیا۔ اُس کا مذہب کیا ہُوا۔ رُوم اور مصر کے مذہب کیا ہُوئے۔ مگر تعجّب کی بات ہے کہ ہندوستان میں مصیبتوں پر مصیبتیں آویں لیکن مذہب کی بُو قائم رہی۔ کیوں جی! مہاراج رامچندر اسی مُلک میں پیدا ہُوئے تھے؟ پیارے کرشن نے اسی بھارت کی گود میں پرورش پائی تھی؟ یہ اتّفاق اور اتحاد ایسے شُور بِیر (دلاور ہیرو) ہی قائم رکھ سکتے ہیں۔ جس مُلک میں بہادُر نہیں وہ مُلک قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح رام اور کرشن کے نام اور ویدوں کی بدولت یہ مُلک قائم ہے۔ ان سُورما مہاتماؤں

سے اسی طرح فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ جیسے کہ ہم سُورج سے اُٹھاتے ہیں۔ حبش کے لوگ سُورج کے ہر وقت سامنے رہنے کی وجہ سے کیسے کالے ہو جاتے ہیں۔ ہم کو بھی رامؔ اور کرشنؔ کی پرستش کرتے ہُوئے اپنے دِلوں کو سیاہ نہ ہونے دینا چاہئے۔ جب آنکھوں کو آپ نے بھگوان کے ارپن کر دیا۔ پھر تو وہ آنکھیں ایشور کی ہوگئیں نہ کہ آپ کی۔ اسی طرح جب بازُوؤں کو اِیشور ارپن کر دیا تو وُہ ایشور کے ہوگئے۔ اسی طرح جب آپ نے اپنے آپ کو ایشور ارپن کر دیا تب آپ پرماتما کی ذاتِ پاک ہوگئے۔ ساکھشات بھگوان رامؔ یا کرشنؔ ہوگئے۔ اب پریم کی زردی گیان کی سُرخی میں بدل گئی۔ اور نتیجہ میں آنند کی مستی ٹپکنے لگی۔

آج تین دن رامؔ کو جس کے یہاں آنند کی بادشاہت کے سوا کچھ اَور ہے ہی نہیں۔ تُمہارے یہاں جھاڑُو دیتے ہوگئے۔ آج تو گدّی پر بیٹھتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ قسم ہے ایشور کی۔ ست کی۔ رامؔ کی۔ کہ تُم میں سے ہر ایک وُہی ذاتِ پاک آتما یا خُدا خاص ہے۔ جانو اپنے آپ کو۔ چھوڑو اس داس پن کو۔ تُمہاری تو سلطنت حقیقی ہے۔

ﮯ واہ کیا ہی پیارا نقشہ ہے۔ آنکھوں کا پھل مِلا!
اُس سوہنے نوجوان کا جِینا سپھل ہُوا
محل اُسکا جس کی چھت پہ ہیں ہیرے جڑے ہُوئے
قوسِ قزح و ابر کے پردے تنے ہُوئے

مسند بلند تخت ہے پربت ہرا بھرا
اور شجر دیودار کا ہے چنور جھولتا
نغمے سُریلے اوم کے ہیں اُس سے آرہے
ندّیاں پرندے یاد میں ہیں سُر ملا رہے
بیہوش وحس ہے گرچہ پڑا کھال کی طرح
دُنیا ہے اُس کے پیر کے فٹ بال کی طرح
کیسی یہ سلطنت ہے عدوُ کا نشاں نہیں
جس جا نہ راج میرا ہو ایسا مکاں نہیں
کیوں دائیں سے اور بائیں سے مُڑ جائیں نہ آنکھیں
جب رنگ ہو دِلخواہ تو جُڑ جائیں نہ آنکھیں
اوم آنند! اوم آنند!!
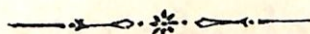
مذہب کی ماہیّت

سوالات دربارہ مذہب

(از جانب مہاتما متھرا داس پوری۔ لاہور)

---

(۱) مذہب سے کیا مُراد اور اُس سے کیا مُدّعا۔ ضرورت اور فائدہ مقصود ہے؟

(۲) مذہب کی اعلیٰ ترین صُورت ۔ اور اُس کا اعلیٰ ترین طریقِ عمل کیا ہے؟

(۳) انسانی ہستی میں وہ جُزوِ خاص کیا ہے۔ جس سے عملِ مذہب اور اُس کا مُدّعا خاص تعلّق رکھتے ہیں اور وہ تعلّق کس حالت میں کیسا ہے؟

(۴) مُدّعائے مذہب کو کامیابی سے پُورا کرنے کے عمل کے لئے کس کس سامان اور مدد کی ضرورت ہے؟

(۵) (ا) کیا ذات ۔ زمانے ۔ مقام ۔ خوراک ۔ اور صحبت کا عملِ مذہب پر کوئی اثر ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کیا؟

(ب) کیا صرف اندھا دُھند اعتقاد (اس زندگی کے بعد کامیابی حاصل ہونے کا فرضی قیاس) اور محض کتابی واقفیّت اور

اُن کا بار بار پڑھنا اور سُننا ہی حصولِ مُدعائے مذہب کے لئے
کافی ہوگا۔ یا کسی ایسے عمل کی (بھی) ضرورت ہے جس سے
ایسے تسلّی بخش آثار پیدا ہوں کہ اُن سے نتیجۂ اعمالِ مذہب کی
مُدعائے مذہب سے مطابقت جیتے جی (موجودہ زندگی میں) پایۂ
ثبوت کو پہنچ سکے۔ اگر کسی ایسے عمل کی ضرورت ہے تو وہ کیا
ہے اور کیا تسلی بخش آثار پیدا کرتا ہے؟

(ج) کیا مذہب کے مُدعا کو پُورا کرنے کا عمل کسی تجربہ کار
عامل کی مدد کے بغیر کسی معمولی انسان کے لئے پُورا پُورا
فائدہ مند ہوسکتا ہے؟

(د) کیا انسانی ہستی کے تعلّق میں کوئی قُدرتی اسباب ایسے
ہیں۔ جو مذہبی عمل کے نتیجے کی ترقّی پر کوئی اثر رکھتے ہوں؟
اگر ہیں تو کیا۔ اور کیا اثر رکھتے ہیں؟

(۶) کسی مذہب کی فضیلت۔ اُس کا اعتقاد۔ اُس کا اختیار کرنا۔
ترک کرنا کس نتیجۂ تحقیقات پر منحصر ہونا چاہئے۔ اور اُس کا
اثر عام طور پر کب محسوس ہونے لگتا ہے؟

(۷) رچنا (اظہارِ عالم) کا اصلی باعث اور مُدعا کیا ہے؟

(۸) مذہب اور سائینس۔ اُن کے اعمال اور مُدعاؤں میں کیا فرق
اور مطابقت ہے؟

جوابات

کیش میمو

پنجاب چرخہ سنگھ گاندھی کھدر بھنڈار

पंजाब चर्खा संघ गांधी खद्दर भंडार

نام خریدار ....

تاریخ .... نمبر 1864

پائی	آنے	روپے	نرخ	تعداد یا گز آنہ	تفصیل	نمبر
				میزان	روپے آنے پائی	

سیلزمین

ہے اور اپنا آپ مُدّعا۔ تمام عالم کا مقصد اور نتیجہ ہے۔ وید کا انت (انتہا) ہے۔ ویدانت ہے۔ اس سے کچھ پرے یا اوپر نہیں جو اس کا مُدّعا ہو سکے۔

"ضرورت" مذہب کی اُسی قسم کی ہے۔ جیسے دریاؤں کو ضرورت ہے سمندر کی طرف بہتے رہنے کی۔ آگ کے شُعلہ کو اوپر کی طرف بھڑکنے کی۔ پودوں اور حیوانوں کو غذا کی۔ زندہ جانوروں کو ہوا کی۔ آنکھ کو ضیا کی۔ بیماروں کو دوا کی۔

"فائدہ؟" دانستہ خواہ نادانستہ مذہب کے عمل میں آئے بغیر کسی قسم کی کامیابی عُروج و ترقی۔ آرام و راحت۔ صحت و طاقت۔ عِلم و ہُنر۔ فضل و برکت مُیتسر نہیں ہو سکتے۔

(۲) کوئی بھی انسان ہو دانستہ خواہ نادانستہ جس درجے تک اعمال اور خیال سے مذہب کی ایکاگرتا (یکسوُ دِلی) اور سمادھی (مراقبہ) سے گزرتا ہے۔ اُسی درجہ تک عروُج و اقبال پاتا ہے۔ اور مذہب کی "اعلیٰ ترین صورت" یہ ہے کہ انسان میں عملاً اور عِلماً خودی مِٹ کر خدائی میں اس حد تک سمادھی (مراقبہ اور یکسو دِلی) آجائے کہ بجائے شخصی فلاح و بہبودی کے مُلک کا مُلک۔ بلکہ مُلکوں کے مُلک اُس کی محویت کے فیضان سے بہرہ ور ہوئے ہوں۔ تمام عالم میں شکتی اور آنند کے چشمے بہ نکلیں۔ صُلح اور سُرور کی نہریں جاری ہو جائیں۔ بشاشت اور طاقت کی صُبح صادق پھیل جائے۔

"بہترین طریقِ عمل"

(ا) اُپنشد اور گیتا کا بار بار بچار (مطالعہ) اور اُس پر عمل۔

(ب) جس گیانی (عارف) کے پاس بیٹھنے سے حیرتِ محمُود (آشچریہ دشا) طاری ہو اُن کے درشن اور صحبت۔

(ج) دن میں کم از کم پانچ مرتبہ وقت نکال کر اپنی ذات سے اگیان اور پاپ (ظلمت و جہل) کو نفی کرنا۔ یعنی اپنے تئیں جسم و جسمانیت سے الگ دیکھنا۔ اپنا آشیانہ ویرانۂ تعلقات و خواہشات سے اُٹھا کر چمنِ حقیقت اور گلستانِ ذاتِ باری میں لگانا اور اس قسم کے مہاواکیہ (کلامِ عظیم) میں محو ہو جانا۔

ع آفتابم آفتابم آفتاب
ذرہ ہا دارند از من رنگ تاب
ہیچ گفتارِ حق گفتارِ ما
چشمۂ انوارِ حق دیدارِ ما

(۴) انسانی ہستی میں وہ بات (حقیقت) ضرور ہے "جس سے عملِ مذہب اور اُس کا مدّعا خاص تعلق رکھتے ہیں"۔ لیکن وہ خاص حقیقت انسانی ہستی میں کوئی "جزو" نہیں بلکہ انسانی ہستی اُس کا جُزو کہلا سکتی ہے۔ اور اتنا بھی صرف نمودی۔

یہ حقیقت خاص ایک دریا ہے ناپیدا کنار۔ جس میں شریر۔ من (جسم و عقل) وغیرہ ترنگوں یا لہروں کی مانند غلطاں و پیچاں ہیں۔ اس حقیقتِ خاص کو ہندو شاستر میں آتما نام دیا ہے۔

"تعلق کس حالت میں کیسا؟"

چِت۔ من (خیال و گمان) کا اپنی پرچھنّتا (محدود پن) کو ترک کر، شکل و اسم سے درگزر اپنی حقیقت (آتما) میں مٹ جانا۔ عینِ علم۔ عینِ سُرور اور عینِ قوّت بن جاتا ہے۔

مثال

جیسے ایک لہر یا حباب اپنے محدود شکل و اسم سے درگزر اپنی حقیقت یعنی آب کی حیثیت سے سب لہروں اور بلبلوں میں موجزن ہے۔ خوش ذائقہ ہے۔ شفّاف ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یا جیسے کھانڈ کا بنا ہُوا گنّا یا چوہا اپنی حدود شکل و اسم سے درگزر اپنی حقیقت یعنی شکر کی حیثیت سے کھانڈ کے شیر۔ بادشاہ۔ دیوتا میں موجود ہے اور لذیذ ذائقہ ہے۔ سفید رنگ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

تفصیل

من۔ بُدھ۔ چت۔ اہنکار کسی دقیق مسئلے پر غور کرتے کرتے اگر یکسوئی (ایکا گرتا) کے اُس درجے تک پہنچ جائیں کہ لمحہ بھر کے لئے اُن کا نرودہ (مٹ جانا) وقوع میں آجائے۔ تو علم و فضل کی ذات بن نکلتے ہیں۔

اگر میدانِ جنگ میں تعلّقات کو تلانجلی دے کر (الوداع کہکر) سر سے گزر کر کسی کے بُدھ۔ من۔ چت۔ (عقل و فکر و خیال) اپنے محدود پن سے چھُٹ جائیں۔ نربھے تا (بے خوفی) بہادری۔ زور و طاقت کا دریا بہ نکلتا ہے۔

اور من۔ بُدھ۔ چت۔ اہنکار جب کسی طرح کے معشوق و مطلوب کو پاکر بیخودی۔ محویت اور ایک گونہ فناء کو پاتے ہیں (جیسے ایک لہر دوسری لہر سے مل کر مٹ سکتی ہے) تو سُرور ہی

سُرور بن جاتے ہیں۔

پس من۔ بُدھ۔ چت۔ اہنکار (عقل و خیال و ضمیر و خودی) کا آتما (ذاتِ حقیقی) میں محو ہونا ہی دریچۂ درُونی کا کُھلنا ہے۔ اور من کا آتما کار ہونا ہی کیا علم کیا طاقت کیا سُرور ان سب کا لشکرِ نُور کی طرح باہر پھیلتا ہے۔

جب تک من۔ بُدھی وغیرہ آتما کار نہیں۔ یعنی محدودیت (جسم و اسم۔ شکل و نام) سے وابستہ ہیں۔ چادرِ موج گویا چہرۂ آپ کو چھُپا رہی ہے۔ بُرقعِ حباب سے دریا محجوب ہو رہا ہے۔ دریچۂ درُونی بند ہے۔ اور آدمی تاریکیٔ جہل۔ خوف و کمزوری۔ عذاب و رنج میں مُبتلا ہے۔

حواسِ ظاہری و باطنی میں بھی جو طاقت یا قُوّت ہے وہ سب آتما ہی کی ہے۔ اِن کا آتما میں فنا ہونا بقا ہے۔ جیسے مَوج کا پانی میں مِٹنا دریا ہونا ہے۔ آتما سے الگ ان کا بقا چاہنا فنا ہونا ہے۔ بُلبلہ کو پانی سے جُدا کرو۔ پھُوٹ جائے گا۔ ہر ایک شخص کے لئے سونا (آرام کرنا) اسی واسطے مُوجبِ زندگی ہے کہ خوابِ گراں حواسِ باطنی اور ظاہری بباعثِ بیخودی اپنی ذاتِ حقیقی (آتما) میں محو و مستغرق ہو جاتے ہیں۔

(۴) سامان اور مدد

(۱) صرف وہ غذا کھائی اور اُتنی کھائی کہ جو جلد پچ سکے اور آسانی سے ہضم ہو سکے۔

(۲) نیند بھر سونا۔

(۳) صبح و شام باقاعدہ جسمانی کسرت (ورزش) کرنا۔

(۴) حتی المقدور ایسی صحبت سے پرہیز جو دل میں عداوت یا جذبات (راگ دویش) بھر دے۔ اگر صحبتِ عارفین ملسکے تو واہ وا۔ ورنہ تنہائی سب سے اچھی ہے۔

(۵) راستبازی۔ راست گفتاری۔ راست کرداری۔ اُدارتا۔ (دریا دلی۔ فیاضی) چھما (عفو) خلق (پبلک) کے بھلے کا کوئی نہ کوئی کام کرتے رہنا۔ بہت بڑے معاون ہیں۔

(۵) (۱) "ذات۔ زمانہ۔ مقام۔ خوراک اور صحبت کا اثر" ضرور ہوتا ہے۔ اُن کے موافق آدمی کی چت (قلب) کی حالت ہوتی ہے۔ اسی واسطے زمانہ۔ مقام۔ خوراک اور صحبت کے بدلنے سے چت کی حالت بھی بدل سکتی ہے۔ اسی واسطے تعلیم کا اثر ہونا بھی ممکن ہے۔ اور اسی واسطے ہر ایک کے لئے عمل مذہب میں پوری کامیابی ہونا بھی ممکنات سے ہے۔

ذات تو ہر ایک کی آتما (خدا) ہے۔ البتہ جات (حسب ونسب) (heredity) علٰحدہ علٰحدہ ہیں۔ اور اُن کے اثر اور نتیجے بھی جُدا جُدا۔ اور جات (حسب و نسب) کے اثر کی طاقت درختوں اور ادنیٰ حیوان میں "مقام۔ زمانہ۔ خوراک اور صحبت" کی طاقت پر ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ لیکن انسان کے لئے صحبت اور تعلیم و تربیت کی طاقت ہر حالت میں جات (حسب و نسب) کی طاقت پر غالب آسکتی ہے۔

(ب) ایسا تشفّی بخش عمل بھی ہے جو موجودہ زندگی میں جیون مُکتی دے سکے۔ یعنی غم و غُصّہ اور گُناہ سے پوری نجات بخش سکے۔ اور وہ عمل خیال و افعال و حال سے جسم و جسمانیت کی حیثیت کو بُھول کر بہ حیثیتِ خُدائی (سب کا اپنا آپ ہوکر) رہنا سہنا ہے۔

اس سے "تسلّی بخش آثار" کی پُوچھو۔ تو خواہ مخواہ

ع دولت غلام من شُد و اقبال چاکرم

ہو جاتا ہے۔ گُناہ و غم کی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔

(ج) "معمولی انسان" سے اگر مُراد اُس شخص کی ہے۔ جس کے اندر شوقِ رُوحانی عشق کے درجے تک نہیں بھڑکا۔ تو اُس کو خواہ کیسا ہی "پُہنچا ہُوا تجربہ کار عالم" کیوں نہ ملے۔ پُوری طرح مُدعا کبھی پُورا نہ ہوگا۔ ہزاروں ہی راجے مہاراجے کرشن بھگوان سے باریاب ہُوئے۔ لیکن گیتا تو کسی نے نہ سُنی۔ ارجن نے سُنی۔ اور وہ بھی اُس وقت جب راج، عزّت، جان، سر، خویش و آشنا، دین و دُنیا کو کرشن کے چرنوں پر نثار کر بالکل ہار کر ویراگ سروپ (سراپا شوق) ہو رہا تھا۔ اگر شوق صادق ہے۔ تو یہ محض نا ممکن ہے۔ کہ تجربہ کار عالم یا اور کوئی مدد جو ضروری ہے۔ خود بخود کھینچ کر نہ چلی آئے۔ کوئلہ کو آگ لگی ہُوئی تو آکسیجن کو اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔ کیا حضرتِ انسان کے دِل کی آگ ہی اتنی بے بس ہے۔ کہ مُرشدِ کامل کے وصل سے محروم رہے؟

پس یہ فرض ہی محال ہے۔ کہ طالبِ صادق ہو اور ضروری مدد سے محروم رہے۔

(۹) انسان کو زندگی میں جتنی ٹھوکریں لگتی ہیں۔ اور تکلیفیں آتی ہیں۔ بظاہر اُن کا سبب خواہ کیسا ہی کیوں نہو۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور اُن مصیبتوں کا سامنا ہونے سے بیشتر کی اپنی اندرُونی حالت کو بلا تعصب دھوکے سے آزاد ہوکر سچ سچ اور ٹھیک ٹھیک یاد کیا جائے۔ تو بلا ناغہ۔ بلا امکان استثنےٰ معلوم ہوگا کہ آفت بیرونی تو پیچھے آئی۔ زوالِ اندرُونی پہلے آ چکا تھا۔ یعنی دِل معمول سے کہیں زیادہ آتما (ذاتِ حقیقی) کی حیثیتِ عالمگیر چھوڑ کر محدود جسم و اسم کی حیثیت سے حقارت و محبّت وغیرہ میں مُبتلا ہو گیا تھا۔ اور دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یُوں کہو۔ کہ دِل اشیائے عالم کے اصلی سُروپ (ذاتِ حقیقی۔ آتما۔ برہم) کو نظر انداز کرکے اُن کے ظاہری اسماء و اشکال میں بُری طرح سے اُلجھ گیا تھا۔ مثلاً عورت کی رنھیا (ملودی) صُورت شکل کی چاہ میں ڈُوب گیا تھا۔ یا کسی کو دُشمن گردان کر اُس (نام روپ) فرضی سایہ کو سچ مان کر زہر اُگل رہا تھا جو اپنے ہی آپ کو چڑھا۔

پیارے یار کا خط آیا۔ وہ خط بھی پیارا لگنے لگا۔ مگر اُس میں محبت درحقیقت اُس پرچۂ کاغذ کے ساتھ نہیں تھی۔ یار کے ساتھ تھی۔ اسی طرح بیٹا۔ عورت۔ گھربار۔ عِلم و دولت وغیرہ کو خطوط منجانب یارِ حقیقی (آتما۔ برہم) جان کر اُس یارِ ازلی کی اگر محبّت اُن سے ہو تو نبھ سکتی ہے۔ ورنہ جُو ہیں یہ چھٹیاں بجائے خود عزیز بنیں۔ اور چٹھی والے کو ہم نے چھوڑا (مذہب کے قانون کو توڑا) تو شامت آئی۔

اس پر وید کا ارشاد ہے۔

ब्रह्म तं परादाद्योऽन्यत्रात्मनो ब्रह्म वेद,
क्षत्रं तं परादाद्योऽन्यत्रात्मनः क्षत्रं वेद,
लोकास्तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो लोकान्वेद,
देवास्तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो देवान्वेद,
वेदास्तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो वेदान्वेद,
भूतानि तं परादुर्योऽन्यत्रात्मनो भूतानि वेद,
सर्वं तं परादाद्योऽन्यत्रात्मनः सर्वं वेद,

(बृह० उप० २, ४, ६)

(جو بھی کوئی برہمن کو برہمن کی حیثیت سے دیکھے گا۔ اور آتما کی حیثیت سے نہ دیکھے گا۔ (یعنی برہمن کے جسم و اسم کو محض ٹیلیفون نہ جانے گا۔ جس کے ذریعہ سے آتما یعنی خُدا خود باتیں کر رہا ہے) تو وہ شخص برہمن سے دھوکا کھائے گا۔ جو بھی کوئی وجہ سے راجہ کو راجہ (جسم و اسم) کی حیثیت سے دیکھے گا۔ اور آتما کی حیثیت سے نہ دیکھے گا۔ وہ راجہ سے دھوکا کھائے گا جو بھی کوئی دولتمندوں کو دولتمندوں کی حیثیت سے دیکھے گا۔ اور آتما کی حیثیت سے نہ دیکھے گا۔ وہ دولتمندوں سے دھوکا کھائے گا۔ جو بھی کوئی دیوتاؤں کو دیوتاؤں کی حیثیت سے دیکھے گا۔ اور آتما کی حیثیت سے نہ دیکھے گا۔ وہ دیوتاؤں سے دھوکا کھائے گا۔ جو بھی کوئی عناصر کو عناصر کی حیثیت سے دیکھے گا۔ اور آتما کی حیثیت سے نہ دیکھے گا۔ وہ عناصر سے دھوکا کھائے گا۔ اور جو بھی کوئی خواہ

کسی شے کو اسم و شکل کی حیثیت سے دیکھے گا اور آتما کی حیثیت سے نہ دیکھے گا۔ وہ اُس شے سے دھوکا کھائے گا (بِرِہد اَرنیک اُپنشد)

یہی قانونِ زندگی ہے۔ جس کی چوٹیں کھا کھا کر باوجود اس خواہش کے شہادتِ مخالف ہونے کے حضرت محمدؐ صاحب وغیرہ کو ضرورت پڑی۔ کہ میناروں پر سے پُکار پُکار کر دُنیا کو بانگیں سُنائیں "لا الہ الا اللہ" اور کچھ نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ عیسائی مت میں مصلوب ہو کر پھر جی اُٹھنے (احیاء) سے بھی اسی طرح کا زندہ بجنّ ہونا مُراد ہے۔ زندگی کے کڑے تجربوں کی بُنیاد پر بُدھ بھگوان اسی قانونِ رُوحانی کو زبانِ حال اور قال سے جنگلوں میں سُناتا پھرا کہ "جو کوئی بھی اشیائے عالم کو سچ مان کر اُن پر بھروسا کرے گا۔ دھوکا کھائیگا"

پس یہ قانُونِ رُوحانی" وہ قُدرتی سبب ہے" جو مذہبی عمل کے نتیجے کی ترقیؔ پر غضب کا اثر رکھتا ہے۔ اگر کوئی فردِ بشر اس حقیقت ایزدی (آتما) کے ساتھ ہمدم و ہمساز ہوگا۔ تو تمام دُنیا اس کی ہمدم و ہمساز ہے۔ اگر کوئی قوم بمقابلہ دیگر اقوام کے اس راستی اور صُلح باطنی کو عمل میں لائے گی۔ تو وہ قوم عرُوج پائے گی۔ اور برخلاف اس کے جو بھی کوئی شخص اس حقیقت کو عملاً بھُولے گا۔ وہ شخص تباہ ہوگا۔ اور جو بھی کوئی قوم اس حقیقت کو حقیر جانے گی۔ وہ حقیر ہو جائے گی۔ اور جو لوگ اس قانُون مذہبی کو عقلاً جانتے ہی نہیں۔ یا عملاً بھُول بیٹھے ہیں۔ وہ حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مِٹ جائیں گے۔ یا زیرِ خط بربادی آجائیں گے۔

(۶) مذہب کی جان (اصلیت) تو اُوپر مذکور ہوچُکی ہے۔ وہ تحلیلِ قلب ہے۔ خودی کی جگہ خُدائی کا آجانا ہے۔ اور وہ ایک ہی ہے۔ اور نہ وہ ادل بدل کے قابل ہی ہے۔اب رہے مذہب کے اجسام۔ وہ کئی ہیں۔ اور ضروریاتِ زمانہ۔ مُلک اور عوارض کے مطابق اختلاف پذیر ہیں۔ عوام کے لئے "مذہب" سے مُراد جسمِ مذہب ہی ہوتا ہے۔ اس میں مجلس (سوسائٹی)۔ رسم و رواج۔ کھانا پینا۔ بُزرگانِ دین۔ کُتبِ دینی۔ یکسُو دلی کا ذریعہ۔ خیالاتِ متعلقہ آرزوئے موت۔ وسیلۂ نجات۔ اور بحث مباحثہ۔ نُکتہ چینی وغیرہ بہت زیادہ حِصّے لیتے ہیں۔ بہ نسبت تحلیلِ قلب کے۔

جو لوگ حقیقی مذہب سے محض نابلد ہیں۔ وہ ظاہری مذہب کو بدلتے پھرتے ہیں۔ اور "کسی مذہب کی فضیلت۔ ایک کا اختیار کرنا دُوسرے کا ترک کرنا وغیرہ" وہ کس نتیجۂ تحقیقات پر منحصر رکھتے ہیں اُن کی وُہی جانیں۔ ہم اس بارے میں کُچھ نہیں کہہ سکتے۔

(۷) "رچنا (اظہارِ عالَم) کا باعث اور مُدّعا"۔ یہ سوال دُوسرے لفظوں میں یُوں بیان ہوسکتا ہے۔ دُنیا کیوں بنی؟ دُنیا کب بنی؟ دُنیا کہاں بنی؟ دُنیا کس طریقہ سے بنی؟ وغیرہ۔ یا زیادہ تصریح کی جائے۔ تو سوال کی صورت یہ ہوگی۔ دُنیا کس عِلّت (سبب) سے بنی؟ کس زمانہ میں بنی؟ کس مقام پر بنی؟ کس ذریعہ سے بنی؟ وغیرہ

جواب:۔ ذرا غور کی جائے تو دُنیا (عالَم) کے بڑے بڑے ارکان خود "سلسلۂ علّت و معلول" "زمانہ"۔ "مکان"۔ "تعلقات"۔ وغیرہ ہی ثابت ہوں گے۔ اس لئے اس سوال کے ضمن میں کہ "دُنیا کس عِلّت سے

بنی"۔ یہ سوال شامل ہے کہ "سلسلۂ علت و معلول" کس عِلّت سے
وقوع میں آیا۔ اور یہ سوال ناجائز ہے اس میں چکر دوش
(reasoning in a circle گردش قیاس) ہے۔

اس سوال کے ضمن میں کہ "دُنیا کس زمانہ میں بنی"؟ یہ
سوال شامل ہے کہ "زمانہ" کس "زمانہ" میں پیدا ہُوا۔ یہ بھی ناجائز ہے۔
اور اس سوال کے ضمن میں کہ "دُنیا کہاں پر بنی"؟ یہ سوال شامل
ہے کہ "مکان" کس "مکان" میں ظاہر ہُوا؟ یہ بھی ناجائز ہے۔علیٰ
ہذا "کس ذریعہ سے بنی ہے" یہ بھی ناجائز ہے۔ پس آدمی بہ حیثیت
آدمی کے اس مسئلہ پر مغزپچی کرتا ہُوا بیفائدہ تضیعِ اوقات کرتا ہے
ع کہ کس نکشُود و نکشاید بحکمت ایں معمارا۔ یہی مایا ہے۔

(۸) مذہب اور سائنس:-

عمل (۱) سائنس کا علم تجربہ و مشاہدہ۔ قیاس و استقراء پر موقوف
ہے۔ اور اس میں طریقۂ نفی و اثبات (method of agreement
and difference) سے رشتۂ علت و معلول قائم کیا جاتا
ہے۔ مذہب کا قانونِ رُوحانی بھی جو سوال ۵ (د) کے جواب میں
درج ہو چکا ہے تجربہ اور مشاہدہ۔ قیاس اور استقرا سے ثابت
ہوتا ہے۔ اور طریقۂ نفی و اثبات پر مبنی ہے۔ کوئی بھی شخص اپنے
چت کی اوستھا (حالتِ دِل) کا صحیح بیان بلا کم و کاست لکھتا جائے
اور جو جو سانحہ و صدمہ وقوع میں آتا جائے اُسے بھی قلمبند
کرتا جائے۔ علم کیمیا (Chemistry) اور علم الاجسام (Physiology)
والے طریقے کو برتاؤ میں لائے۔ تو مذہب کے قانونِ رُوحانی کی

صداقت کا معتقد خواہ مخواہ ہونا پڑے گا۔

(ب) سائنس اور مذہب کے علموں میں فرق اتنا ہوگا۔ کہ سائنس باہر کی چیزوں پر تجربہ اور مشاہدہ برتے گا۔ جو مقابلۃً بہت آسان ہے۔ اور مذہب بیچ کی اندرونی کیفیتوں پر تجربہ اور مشاہدہ کام میں لائے گا۔ جو بہت مشکل ہے۔

(مدعا)۔ سائنس کا مدّعا ہے اختلاف میں اتحاد کو کھوجنا (to discover unity in variety) اور دُنیا میں وحدت کا ظاہر کرنا۔ مثلاً درخت سے گرتے ہوئے سیب میں اور زمین کے گرد پھرتے ہوئے چاند میں ایک ہی قانون (کششِ ثقل) کا دریافت کرنا۔ اور مسئلہ ارتقاد (صعودِ عالم) کے ذریعہ ادنےٰ سے ادنےٰ نباتی بیج سے لیکر حضرت انسان تک رشتۂ وحدت اور رسائی دکھلانی۔ اور مذہب کا مُدعا (بلکہ خود مذہب) بھی یہی ہے۔ یعنی ظاہری اختلاف و مخالفت میں اتحاد و اتفاق بلکہ ساری دُنیا میں وحدت و توحید کا دیکھنا اور برتنا۔

فرق اتنا ہے کہ سائنس عقلی اور علمی طور پر وحدت کا رنگ دکھاتا ہے۔ اور مذہب عملی اور حالی طور پر توحید میں غوطے دلاتا ہے۔

ادھر ارنسٹ ہیکل (Ernst Haeckel) پال کیرس (Paul Karus) روما نیز (Romanes) وغیرہ سائنس دانانِ حال بیرونی دُنیا میں وحدت ہی وحدت پُکارتے ہیں۔ اُدھر اُپنشد تاؤ ازم۔ تصوّف وغیرہ مذاہبِ متقدمین توحید ہی توحید ہمارے رگ و ریشہ میں اُتارتے ہیں۔ سائنس زیادہ تر پرتیکش پرمان (ثبوتِ نظری)

پر چلتا ہے۔ مذہب بھی ساکشاتکار (مکاشفہ۔ حق الیقیں) پر مبنی نہ ہو تو مذہب ہی نہیں بلکہ سُنی سُنائی کہانی ہے۔ یا پکش پات (تعصب) ہے۔ پر فرق اتنا ہے۔ کہ سائنس چونکہ اسما و اشکال سے زیادہ تعلّق رکھتا ہے۔ حواسِ خمسہ کی مدد کا زیادہ محتاج ہے۔ اور مذہب چونکہ واحد ہیولے (substance۔آتم ستّا) کو براہ راست انُوبھو (ضمیر) میں لاتا ہے۔ اس لئے اُس دُرونی آنکھ کو برتتا ہے۔ جو بیرونی آنکھ کی آنکھ (نورؔ) ہے۔ آج کل کی سائکالوجی (علم الرُوح) کی اصطلاح میں مذہب قلب و باطن (ganglionic centres) کو روشن کرتا ہے۔

اوم! اوم!! اوم!!!

نقد دھرم

(یہ لیکچر غازی پور میں اکتوبر ۱۹۰۵ء میں ہوا تھا)

सत्यमेव जयते नानृतम् (मुराडकोपनिषद्)

ہمارے وید میں لکھا ہے کہ جے (فتح) ست ہی کی ہوتی ہے۔ جھوٹ کی کبھی نہیں۔ سانچ کو آنچ نہیں۔ دروغ کو فروغ نہیں۔ جہاں کہیں دُنیا میں دولت و اقبال ہے۔ دھرم ہی اُس کا اصلی سبب ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ لکشمی وِشنو کی اِستری ہے اور وہ پتی برتا ہے۔ جہاں وشنو (ست یا راستی) ہوں گے۔ وہیں لکشمی ہوگی۔ اس کو اور کسی شخص کا لحاظ نہیں۔ اقبال جنسِ جغرافیہ نہیں۔ یعنی کسی مقام پر محدود نہیں۔ جو لوگ یورپ اور امریکہ وغیرہ کی ترقی کو وہاں کی سرد آب و ہوا سے منسوب کرتے ہیں یا جو بعض اور مُلکوں کی پستی کو وہاں کے حدود اربعہ سے تعلق دیتے ہیں۔ غلطی کرتے ہیں۔ ابھی دو ہزار سال نہیں ہوئے انگلستان کے باشندے روم وغیرہ میں بردے اور غلام بنے بکتے تھے۔ آج انگلینڈ کتنے ہی بڑے مُلکوں کا راج کر رہا ہے۔ کیا انگلینڈ اپنے پُرانے حدود اربعہ سے بھاگ کر کہیں نکل گیا ہے؟ پانسو سال

پہلے امریکہ زمین کے اُسی موقعہ پر تھا جہاں آج ہے۔ لیکن اس عرصے میں وہاں کے باشندوں کی حالت میں تفاوت کا اندازہ لگائیے۔ روما۔ یونان۔ مصر۔ اور ہمارا ہند آج وہیں تو ہیں جہاں اُن دنوں تھے۔ جبکہ تمام دُنیا میں اُن کے علم و فضل کی دھاک تھی۔خوشحالی مُلکوں اور انسانوں کا لحاظ نہیں کرتی۔جو لوگ ست یا راستی پر چلتے ہیں۔صرف اُنہیں کی جے (فتح) ہوتی ہے۔ اور جب تک ست دھرم پر چلتے رہتے ہیں۔ اُن کی جے رہتی ہے۔

پیارے! معاف کرنا۔رام آپ کا ہے اور آپ رام کے ہیں۔ تُم ہمارے ہو ہم تُمہارے ہیں۔پُورے پریم کے ساتھ سامنے آؤ۔ جو کچھ ہم کہیں گے محبت کے ساتھ کہیں گے۔لیکن خوشامد نہیں کریں گے۔ محبت اس بات کی مقتضیٰ ہے کہ خوشامد نہ کرے۔ رام جاپان میں رہا۔امریکہ میں رہا۔یورپ کے بعض مُلک بھی دیکھے۔ پر جہاں فتح پائی۔راستی کی پائی۔ امریکہ جو ترقی کر رہا ہے۔ دھرم پر چلنے سے کر رہا ہے۔ دھرم پر کسی کا اجارہ نہیں۔ہر جگہ عمل میں آسکتا ہے۔ دھرم دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک نقد اور دُوسرا اُدھار۔ یہ ایک مثال سے واضح ہوگا۔

ایک آدمی نے کچھ مال زمین میں دفن کر رکھا تھا۔اُس کے لڑکے کو معلوم ہوگیا۔لڑکے نے زمین کھود کر روپیہ نکال لیا اور صرف کر ڈالا۔ لیکن تول کر اُتنے ہی وزن کے پتھر وہاں رکھ چھوڑے۔چند روز کے بعد جب باپ نے زمین کھودی اور روپیہ ندارد۔ تو رونے لگا "ہائے! میری دولت کہاں گئی"۔ لڑکے نے کہا

بُابا جان! روتے کیوں ہو۔آپ نے اُسے برتاؤ میں تو لانا ہی نہ تھا اور رکھ چھوڑنے کے لئے دیکھ لو اُتنے ہی وزن کے پتھّر وہاں موجود ہیں۔

ع براے نہادن چہ سنگ وچہ زر

مذہبی لڑائیاں اور رَولے جو ہوتے ہیں۔ وہ نقد دھرم پر نہیں ہوتے۔ اُدھار دھرم پر ہوتے ہیں۔ نقد دھرم وہ ہے۔جو بعد از مرگ سے نہیں بلکہ موجودہ زندگی سے سروکار رکھتا ہے۔اُدھار دھرم اعتباری ہوتا ہے۔نقد دھرم یقینی۔اُدھار دھرم کہنے کے لئے ہے۔ نقد دھرم کرنے کے لئے۔ وہ حصّہ دھرم کا جو نقد ہے اُس پر تمام ہی مذاہب کا اتّفاق ہے۔ ست بولنا۔ علم پڑھنا اور اُس پر عمل کرنا۔خود غرضی سے پاک ہونا۔پرائے مال کو۔ پرائی۔عورت کو دیکھ کر حرام دِل نہ ہونا۔ دُنیا کے لالچ اور دھمکیوں کے جادُو میں آکر حقیقتِ اصلی (ذاتِ مُطلق) کو نہ بھُولنا۔ مضبوط دِل اور مستقل مزاج ہونا۔وغیرہ۔اس نقد دھرم پر کہیں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ جھگڑے اُس دھرم پر ہوُئے ہیں جو دباکر رکھا جاتا ہے۔ اُدھار کے دعویٰ مدعی پیشہ لوگوں کو سونپ کر خود فرضِ موجودہ (نقد دھرم) پر چلنے والے عروج اور ترقّی کو پاتے ہیں۔اس بات کا عَلمی یقین اور مُلکوں میں جانے سے ہُوا۔

ہندوستان اور امریکہ میں کیا فرق ہے۔ یہاں دن ہے تو وہاں رات ہے۔اور وہاں دن ہے تو یہاں رات ہے۔ جن دنوں ہندوستان کا ستارہ عرُوج پر تھا امریکہ کو کوئی جانتا

بھی نہ تھا آج امریکہ عروج پر ہے تو ہندوستان کی پُوچھ نہیں۔
ہندوستان میں بازار وغیرہ میں بائیں رُخ چلتے ہیں۔ وہاں
دائیں رُخ۔ پُوجا اور تعظیم کے وقت یہاں جُوتا اُتارتے ہیں۔
وہاں ٹوپی۔ یہاں گھروں میں راج مردوں کا ہے۔ وہاں عورتوں
کا۔ اِس مُلک میں یہ شکایت ہے کہ بیوہ ہی بیوہ ہیں۔ اُس مُلک
میں کنّواری ہی کنواری عورتیں زیادہ ہیں۔ ہم کہتے ہیں کتاب میز
پر ہے وہ کہتے ہیں کتاب پر میز ہے (book on the table)۔
اِس مُلک میں گدھا اور اُلّو بیوقوفی کی علامت ہیں۔ اُس مُلک میں
گدھا اور اُلّو نیکی اور عقلمندی کی نشانی ہیں۔ اِس مُلک میں جو
کتاب لکھی جاتی ہے اگر نصف کے قریب پچھلے بُزرگوں کے حوالوں
سے نہ بھری ہو تو اُس کی قدر نہیں۔ اُس مُلک میں کتاب کی
کُل باتیں نئی نہ ہوں۔ تو اُس کی قدر نہیں۔ یہاں کار آمد بات
معلوم ہو جائے تو اُس کو چُھپا کر رکھتے ہیں۔ وہاں مطبع میں مشتہر
کر دیتے ہیں۔ یہاں مذہب پرستی بے انداز ہے وہاں نقد دھرم
بہت ہے۔ ہمارے یہاں اس بات میں بڑائی ہے۔ کہ اوروں سے
نہ ملیں۔ اپنے ہی ہاتھ سے پکا کر کھائیں۔ سب سے الگ رہیں۔ وہاں
پر جتنا اوروں سے ملیں۔ اُتنی ہی قدر ہے۔ یہاں پر غیر مُلکوں
کی زبان پڑھنا کچھ معیوب سا مانا جاتا ہے۔ وہاں جس قدر غیر
مُلکوں کی زبان سے واقفیت حاصل کرو اُتنی ہی زیادہ عزّت
ہوتی ہے۔

جب رام جاپان کو جا رہا تھا۔ تو جہاز پر امریکہ کا ایک

عمر رسیدہ پروفیسر دوست بن گیا۔ وہ رُوسی زبان پڑھ رہا تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہُوا کہ گیارہ زبانیں پہلے بھی جانتا ہے۔ اُس سے پُوچھا گیا کہ اِس عُمر میں یہ نئی زبان کیوں سیکھتے ہو؟ جواب دیا کہ میں جیالوجی (علمِ طبقات الارض) کا پروفیسر ہُوں۔ رُوسی زبان میں جیالوجی پر ایک نادر کتاب لکھی گئی ہے۔ اگر اُس کا ترجمہ کرسکوں گا تو میرے اہلِ مُلک کو فائدہ کثیر پہنچے گا۔ اس لئے رُوسی زبان پڑھتا ہُوں۔ رامؔ نے کہا "اب تُم موت کے قریب ہو۔ اب کیا پڑھتے ہو۔ اب خُدا کی خدمت کرو۔ ترجمہ کرنے میں کیا دھرا ہے"۔ جواب دیا کہ "بندوں کی خدمت خُدا کی خدمت ہے"۔

ع بندہ ہُوں بے خُدائیں۔ بندے مِرے خُدا ہیں

نیز اگر بفرضِ محال یہ کام کرتے دوزخ میں جاؤں تو جاؤں کچھ پرواہ نہیں۔ اگر مجھے جہنّم کے دُکھ ملتے ہیں تو ہزار جان سے قبول ہیں بشرطیکہ بھائیوں کو سُکھ د لابھ مل جائے۔ اس زندگی میں لذّتِ خدمت گذاری کا حق مَیں موت کے اُس پار کے ڈر سے نہیں چھوڑ سکتا۔

گذشتہ خواب و آئندہ خیال است
غنیمت داں ہمیں دم را کہ حال است

(جو زمانہ گذر گیا ہے وہ خواب ہے اور جو زمانہ آنے والا ہے وہ محض خیال ہے۔ اور جو زمانہ موجودہ ہے اُسی کو غنیمت سمجھ) یہی نقد دھرم ہے۔ بھگوت گیتا میں بڑی خوش اسلوبی سے

ارشاد ہے۔

कर्मण्यवाधिकारस्ते मा फलेषु कदाचन

(गीता, २, ४७)

(کہ کام تو کرتے ہی جاؤ لیکن پھل (نتیجہ) پر نگاہ مت رکھو)

لارڈ میکالے کی دُعا تھی کہ مَیں مروں تو کُتب خانہ میں مروں۔ مروں تو کوچۂ یار ہی میں مروں۔

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں
قبرِ بُلبُل کی بنے گُلزار میں

مریں تو فرض ادا کرتے مریں۔ میدانِ کارزار میں مریں۔ ہمّت۔ آنند اور اُتساہ کے ساتھ جان دیں۔ ایک شخص باغ لگاتا تھا۔ کسی نے پوچھا۔ بڈّھے میاں! کیا کرتے ہو۔ تم کیا اس کا پھل کھاؤگے؟ ایک پاؤں گویا پہلے ہی قبر میں ہے۔ کیا تمہیں وہ فقیر کی بات یاد نہیں ہے

گھر بناؤں خاک اس وحشت کدہ میں ناصحا!
آئے جب مزدُور مجھ کو گورکن یاد آگیا

باغبان نے جواب دیا "اَوروں نے بویا تھا ہم نے کھایا۔ ہم بوئینگے اور کھائیں گے"۔ اسی طرح دُنیا کا کام پڑا چلتا ہے۔ جتنے بُزرگ ہوگئے ہیں عیسٰی۔ محمّد وغیرہ۔ کیا ان حضرات نے اُن درختوں کا پھل خود کھایا تھا۔ جو وُہ بو گئے؟ ہرگز نہیں۔ اُن بُزرگوں نے تو فقط اپنے جسموں کو گویا کھاد بنا دیا۔ پھل کہاں کھائے؟ جن درختوں کا پھل صدیوں کے بعد لوگ آج کھا رہے ہیں۔ وہ اُن رشیوں

کی خاک سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہی اُصول مذہب کی اصل جان ہے۔ یہی اُصول اُس پروفیسر کے عمل میں پایا گیا جو رُوسی زبان پڑھتا تھا۔

محنت سے عار نہیں جس وقت رام جاپان سے امریکہ کو جا رہا تھا۔ جہاز میں کوئی ڈیڑھ سو لڑکے جاپانی تھے۔ جن میں بعض امیروں کے گھر کے بھی تھے۔ پر اُن میں شاید ہی کوئی ایسا تھا۔ جو اپنے گھر سے روپیہ لے چلا ہو۔ اکثر تو ایسے تھے کہ جہاز کا کرایہ بھی اُنہوں نے گھر سے ادا نہ کیا تھا۔ کوئی اُن میں سے امیر مسافروں کے بُوٹ صاف کرنے پر۔ کوئی جہاز کی چھت دھونے پر۔ بعض کسی ایسے ہی اور رذیل کام پر نوکر ہو گئے تھے۔ اور یوں جہاز کا خرچ ادا کر رہے تھے۔ دریافت کرنے سے اُن کا یہ خیال پایا گیا کہ اپنی قوم کا روپیہ غیر مُلکوں میں جا کر کیوں خرچ کریں۔ جہاز کا کرایہ بھی محنت کے ذریعہ سے ادا کرتے ہیں۔ امریکہ میں جا کر ان میں سے بعض لڑکے تو امیروں کے گھروں میں دن بھر محنت مزدوری کرتے تھے۔ رات کو نائٹ سکولوں (Night School) میں پڑھتے تھے اور بعض ریل کی سڑک پر یا بازاروں میں روڑی کوٹنے پر یا کسی اور کام پر لگ گئے۔ یہ لوگ گرمیوں میں مزدوری کرتے تھے اور جاڑوں میں کالج کی تعلیم پاتے تھے۔

پئے عِلم چُوں شمع باید گداخت

(علم کی خاطر مثلِ شمع کے پگھلنا چاہئے)

اسی طور پر سات آٹھ سال بسر اوقات کر کے اپنے دماغ

کو امریکہ کے علم و ہُنر سے اور اپنی جیبوں کو امریکہ کے روپیہ سے بھر کر یہ جاپانی اپنے مُلک میں واپس آتے ہیں۔ ہر جہاز میں بیسیوں اور کئی دفعہ سینکڑوں جاپانی امریکہ وغیرہ کو جاتے رہتے ہیں۔ ہزارہا بلکہ لکھوکھا جاپانی ہر سال جہازوں میں جرمنی و امریکہ کو جاکر وہاں سے علم لیکر واپس آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ پچاس سال ہُوئے جاپان ہندوستان سے بھی پست تھا۔ آج یورُپ سے بھی بڑھ گیا۔ تمہارا ہاتھ خوب گورا چٹا ہے اور اس کا خُون بالکل صاف ہے۔اگر کلائی پر پٹی باندھ دو گے تو خون ہاتھ کا ہاتھ ہی میں رہے گا۔ باقی جسم میں نہیں جائے گا۔ لیکن گندہ ہو جائے گا اور ہاتھ سُوکھ جائے گا۔ پس جن مُلکوں نے یہ کہا کہ ہم ہی خوُب ہیں۔ہم ہی اچھے ہیں۔ ہم ہی بڑے ہیں۔ ہم ملیچھوں یا کافروں سے کیوُں سروکار رکھیں۔ اور اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیا۔ تو اُنھوں نے اپنے آپ پر گویا پٹّی باندھ کر اپنے تئیں خود سُکھا لیا۔ مثل مشہور ہے

ع بہتا پانی نرملا۔ کھڑا سو گندا ہوئے

ع آب دریا بہے تو بہتر۔ انساں رواں رہے تو بہتر

اگر غور سے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ جن مُلکوں نے ترقّی کی ہے۔ وہ چلتے ہی رہنے سے کی ہے۔ امریکہ کے لوگوں کی کیفیت اس بارہ میں دیکھیے؟ تقریباً ۴۵ ہزار امریکن روزانہ پیرس میں رہتے ہیں۔ گروہ کے گروہ آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ کوئی ذرا سی اختراع و ایجاد فرانس میں دیکھی۔تو جھٹ اپنے مُلک میں پہنچادی۔

پُرانے فنون اور ہُنر سیکھنے میں بھی کوئی فروگذاشت نہیں۔ ہر موسم میں کوئی ۸۰ (اسّی) ہزار امریکن مصر میں آتے ہیں۔ میناروں کو دیکھتے ہیں۔ ۴۰ (چالیس) فی صدی امریکن ساری دُنیا گھوم چُکے ہیں۔ اسی طرح سے یہ لوگ جہاں علم ہوتا ہے۔ وہاں سے لاکر اپنے مُلک میں پہنچا دیتے ہیں۔ جرمنی والوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ امریکہ سے آتے وقت رام جرمن جہاز پر سوار تھا۔ قریباً تین سو درجہ اوّل (فرسٹ کلاس) کے مسافر ہوں گے۔ اُن میں پروفیسر۔ ڈیوک۔ بیرن اور سوداگر لوگ شامل تھے۔ دن کے وقت عموماً جہاز کی بالا ترین چھت پر جاکر رام بیٹھتا تھا۔ تنہائی میں پڑھتا لکھتا تھا۔ یا دھیان بچار میں لگ جاتا تھا۔ لیکن جرمن لوگ جہاز کے اوپر کی چھت پر آن کر رام کو نیچے لاتے تھے۔ اور رام کے لیکچر کراتے تھے۔ رام کو غیر مُلک کا سمجھ کر کافر یا ملیچھ کا سُلوک تو نہ تھا۔ بلکہ یہ خیال تھا۔ کہ جتنا بھی علم اس غیر مُلک والے سے مل سکتا ہے لے لیں۔ اضلاع متحدہ میں سب سے پہلا شہر جو رام نے دیکھا سیاٹل واشنگٹن ہے۔ وہاں واشنگٹن یونیورسٹی نے ہندو فلسفہ پر لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔ لیکچر کے بعد ایک جوان پروفیسر سے مُلاقات ہُوئی۔ جو ابھی جرمنی سے واپس آیا تھا۔ رام نے پُوچھا کہ جرمنی کیوں گئے تھے۔ اُس نے کہا "علم نباتات اور علم کیمیا میں اپنی یونیورسٹی کا جرمن یونیورسٹیوں سے مقابلہ کرنے گیا تھا۔ اور عام طور پر اس کا نتیجہ یہ سُنایا کہ دس سال کا عرصہ ہُوا۔ جرمنی ہم سے بڑھ کر تھی۔ لیکن آج ہم اُس سے کم نہیں۔ پُر شوق بیا موز۔ جانفشانی کے ساتھ

غیروں سے سیکھ سیکھ کر اُن لوگوں نے وِدیا (علم) کو پایا اور بڑھایا ہے یہ خیال صحیح نہیں کہ امریکہ کے لوگ ڈالر (روپیہ) کے غلام ہیں۔ بلکہ وِدیا کے پیچھے ڈالر خود آتا ہے۔ جو لوگ امریکہ والوں کو یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُن کا دھرم نقد دھرم نہیں بلکہ نقدی دھرم ہے۔ وہ یا تو امریکہ کی حقیقی حالت سے واقف نہیں یا بالکل بے انصاف ہیں اور مصداق اس مقولہ کے ہیں :-

ع ابھی بچّے ہیں کون دانت کھٹّے کرے

کیلی فورنیا (California) میں ایک عورت نے اٹھارہ (۱۸) کروڑ روپیہ دے کر ایک یونیورسٹی قائم کی۔ اسی طرح علم کے بڑھانے و پھیلانے کے لئے ہر سال کروڑوں کا دان دیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی برہم وِدیا کی وہاں یہ قدر ہے کہ جیسا ویدانت امریکہ میں ہے ویسا عملی ویدانت ہندوستان میں آج کل نہیں ہے۔ مگر گو اُن لوگوں نے ویدانت کو پچا لیا ہے۔ اور اپنے جسم و جاں میں داخل کر لیا ہے۔ لیکن ہندو نہیں بن گئے۔ ویسے ہی ہم اُن کے علوم و فنون کو پچا کر بھی اپنی قومیت قائم رکھ سکتے ہیں۔ درخت باہر سے کھاد لیتا ہے۔ مگر خود کھاد نہیں ہو جاتا۔ باہر کی مٹی۔ پانی۔ ہوا۔ روشنی کو کھاتا ہے۔ اور ہضم کرتا ہے۔ لیکن مٹی۔ پانی۔ ہوا وغیرہ نہیں ہو جاتا۔ جاپانیوں نے یورپ اور امریکہ کے علوم و فنون پچا لئے۔ لیکن جاپانی ہی بنے رہے۔ دیوتاؤں نے اپنے کچ کو راکششوں کے ہاں بھیج کر اُن کی جاں بخش وِدیا سیکھ لی۔ لیکن اُس سے راکشش نہیں ہو گئے۔ اسی طرح تُم یورپ و امریکہ

جاکر اُن کے علم سیکھنے سے غیر ہندو یا غیر ہندوستانی نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ علم کو جغرافیہ کی حد بندی میں ڈالتے ہیں "اوہ! یہ ہمارا علم ہے۔ وہ غیر لوگوں کا علم ہے۔ غیر لوگوں کا علم ہمارے ہاں آنے میں گُناہ ہوگا۔ اور ہائے! ہمارا علم اور لوگ کیوں لیجائیں؟ اس خیال کے لوگ اپنے علم کو جہالتِ مُطلق میں بدلتے ہیں۔

اس کمرے میں روزِ روشن ہے۔ یہ روشنی نہایت دِل پسند اور سُہانی ہے۔ اگر ہم کہیں" یہ ہماری روشنی ہے۔ ہماری ہے۔ ہائے کہیں باہر کی روشنی سے مل کر اپوتر (ناپاک) نہ ہو جائے! اور بدیں خیال اپنی روشنی کی حفاظت کرتے ہُوے ہم چِکیں گرا دیں۔ پردے ڈال دیں۔ دروازے بھیڑ دیں۔ کھڑکیاں لگا دیں۔ روشندان بند کر دیں۔ تو ہماری روشنی ایک دم کافور ہو جائے گی۔ نہیں مُشکِ سیاہ ہو جائے گی۔ یعنی اندھیرا ہی اندھیرا پھیل جائے گا۔ ہائے! ہم لوگوں نے ہندوستان میں یہ غلط پالیسی کی چال کیوں اختیار کی!

؎ حب الوطن از مُلکِ سلیماں خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

کہکر خود تو خار ہو جانا اور مُلک کو خارستان کر دینا حُبِّ وطن نہیں ہے۔

عموماً ایک ہی قسم کے درخت جب اکٹھے گُنجان جھُنڈوں میں اُگتے ہیں۔ تو سب کمزور رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو ذرا الگ بو دو تو بہت مضبوط اور تن آور ہو جاتا ہے۔ یہی

حال قوموں کا ہے۔ کشمیر کی بابت کہتے ہیں۔

اگر فردوس بر رُوے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

لیکن وہ کشمیری لوگ جو اپنے فردوس (happy valley) کو چھوڑنا گناہ سمجھتے ہیں۔ کمزوری ناداری اور جہل میں ضرب المثل ہو رہے ہیں۔ اور وہ بہادر کشمیری پنڈت جو اس پہاڑی فردوس سے باہر نکلے۔ گویا سچ مچ فردوس میں آگئے۔ اُنہوں نے جہاں گئے باقی ہندوستانیوں کو ہر بات میں مات کر دیا۔ اُن میں سے سب اعلےٰ اعلےٰ عہدوں پر ممتاز ہیں۔ جب تک جاپانی جاپان میں بند رہے۔ کمزور تھے اور پست تھے۔ جب غیر مُلکوں میں جانے لگے۔ ہوا لگی مضبوط ہو گئے۔ یورپ کے غریب نادار اور عموماً ادنیٰ لوگ جہازوں پر سوار ہو کر امریکہ جا بسے۔ اب وہ لوگ دُنیا کی سب سے قوی طاقت ہیں۔ چند ہندوستانی بھی باہر گئے۔ جب تک اپنے مُلک میں تھے کچھ پُوچھ نہ تھی۔ اور ملکوں میں گئے اُن چڑھی بڑھی قوموں میں بھی درجے اول میں شمار ہوئے۔ ناموری حاصل کی۔

؎ پانی نہ بہے تو بُو آئے
خنجر نہ چلے تو مورچہ کھائے
گردش سے بڑھا مہر و ماہ کا پایا
گردش سے فلک نے اَوج کو پایا

جیسے درخت سب رُکاوٹوں کو کاٹ کر اپنی جڑیں اُدھر

بھیج دیتا ہے۔ جدھر پانی ہو۔ اُسی طرح امریکہ۔ جرمنی۔ جاپان و انگلینڈ کے لوگ سمندروں کو چیر کر پہاڑوں کو کاٹ کر روپیہ خرچ کرکے ہر طرح کی تکلیفیں جھیل کر وہاں وہاں پہنچے ہیں جہاں سے تھوڑا بہت خواہ کسی قسم کا بھی علم میسّر ہو سکا۔ یہ ایک باعث ہے اُن ملکوں کی ترقّی کا۔ اب اور سُنئے۔

جان نثاری

ایک جاپانی جہاز میں چند ہندوستانی لڑکے سوار تھے۔ جہاز میں جو اس درجے کے مسافروں کو کھانے کو مِلا وہ خاص وجہ سے اُنھوں نے نہیں لیا۔ ایک غریب جاپانی لڑکے نے دیکھا کہ یہ ہندوستانی بھُوکے ہیں۔ سب کے لئے دُودھ اور پھل وغیرہ خرید کر لایا اور سامنے رکھدیا۔ ہندوستانیوں نے پہلے تو حسبِ دستُور انکار کیا۔ بعد کو کھا لیا۔ جب جہاز سے اُترنے لگے۔ تو شُکریہ کے ساتھ قیمت اُن چیزوں کی دینے لگے۔ جاپانی نے نہیں لی۔ لیکن رو کر التجا کرنے لگا۔ کہ جب ہندوستان میں جاؤگے تو کہیں یہ خیال نہ پھیلا دینا کہ جاپانی لوگ ایسے نالائق ہیں کہ اُن کے جہازوں پر ادنیٰ درجہ میں غیر مُلک کے مسافروں کے لئے کھانے پینے کا انتظام خاطر خواہ نہیں ہے۔ ذرا خیال کیجئے گا۔ ایک غریب مسافر لڑکا جس کا جہاز کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں ہے وہ اپنے نِج کا پیسہ قُربان کر رہا ہے کہ کہیں کوئی اُس کے مُلک کے جہازوں کو بُرا نہ کہے۔ یہ لڑکا اپنے تئیں علٰحدہ ہستی نہیں مانتا۔ سارے مُلک کی ہستی

کو عملی طور پر اپنی ہستی جان رہا ہے۔ کیا محبت ہے! کیا جان نثاری ہے! یہ ہے عملی وحدت۔ نقد دھرم۔ اس عملی توحید کے بغیر اور کوئی صورت فلاح و بہبودی نہیں

س مرنا بھلا ہے اُس کا جو اپنے لئے جئے
جیتا ہے وہ جو مر چکا انسان کے لئے

آپ کو یاد ہوگا کہ جاپان میں جب ضرورت پڑی کہ رُوسیوں کی تاخت کو روکنے کے لئے کچھ جہاز سمندر میں غرق کئے جائیں۔ مکاڈو نے کہا کہ مَیں رعیّت میں کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ لیکن جن کو ایسے جہازوں کے ساتھ غرق ہونا منظور ہے۔ خود والنٹیر کریں۔ اور عرضیاں پیش کریں۔ ہزاروں عرضیاں ضرورت سے زیادہ ایک دم آگئیں۔ اب اُن میں انتخاب کی ذرا دِقّت تھی۔ اس پر جاپانی جوانوں نے اپنے بدنوں سے خُون نکال کر خُون کی لکھی ہُوئی درخواستیں حاضر کیں۔ کہ جلدی منظور ہوں۔ آخر خُون کی عرضیوں کو ترجیح دی گئی۔ جب جہازوں کے ساتھ یہ لوگ غرقاب ہو رہے تھے۔ تو اُن میں دو ایک کپتان اگر چاہتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے۔ کسی نے کہا! کپتان صاحب آپ کام تو کر چکے۔ اب جان بچا کر جاپان چلے جاؤ۔ تو موت کی ہنسی اُڑاتے ہُوئے کپتان نے حقارت سے جواب دیا۔ کیا مَیں نے واپس جانے کے لئے یہاں آنے کی عرضی دی تھی

ع اینجا جُز اینکہ جان بہ سپارند چارہ نیست
(یہاں بجُز اس کے کہ اپنی جان دیدیں اور کوئی چارہ نہیں ہے)

مردانگی کا درجہ وہ نہیں ہے کہ واپس لوٹا جائے۔

ع شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

یہ ہے نقد دھرم۔عملی توحید۔

नैनं छिन्दन्ति शस्त्राणि नैनं दहति पावक।

ے مُجھکو کاٹے کہاں ہے وہ تلوار؟
داغ دے مجھ کو ہے کہاں وہ نار؟
غرق مُجھکو کہاں کرے پانی؟
باد میں تاب کب سُکھانے کی؟
موت کو موت آ نہ جائے گی؟
قصد میرا جو کرکے آئے گی؟

علمی تحقیقات کے لئے زندہ انسان کی جراحت کی ضرورت پڑی۔امریکہ میں نوجوان اپنی چھاتیاں کھول کر کھڑے ہو گئے کہ لو چیرو۔ہمیں کاٹو۔ انچہ انچہ کرکے ہماری جان جائے۔ ہماری وی وی سیکشن (جراحتِ زندہ) ہزار بار مبارک ہے۔اگر اس سے علم کو ترقی ہو اور دُوسروں کا بھلا ہو۔" اب اسے ہم پریم کہیں کہ بہادری؟ یہ ہے نقد دھرم ۔عملی توحید (ویدانت)

امریکہ کے پریسیڈنٹ ابراہم لنکن کا تذکرہ ہے کہ ایک مرتبہ اپنے مکان سے دربار کو آ رہا تھا۔راستے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک سُوَر دلدل میں پھنسا ہوا نیم جاں ہو رہا ہے۔بہت ہی زور کر رہا ہے۔ لیکن نکل نہیں پاتا۔درد سے کراہ رہا ہے۔ پریسیڈنٹ سے دیکھا نہ گیا۔سواری سے اُتر کر سُوَر کو باہر نکالا۔اور اُس کی

جان بچائی۔ تمام لباس پر کیچڑ کے چھینٹے پڑ گئے۔ لیکن پرواہ نہ کی۔ اور اسی حالت سے دربار میں آیا۔ لوگوں نے پُوچھا۔ اور جب وہ قصّہ معلوم ہُوا تو سب نے بڑی تعریف کرتے ہُوئے کہا کہ آپ بڑے رحم دل اور خدا ترس ہیں۔ پریسیڈنٹ نے کہا کہ بس بس۔ زیادہ مت بولو۔ مَیں نے رحم وحم کچھ نہیں کیا۔ مرضِ متعدی کی طرح اُس سُوٴر کے درد نے مجھ میں اپنا اثر پیدا کیا۔ پس مَیں تو فقط اپنا درد دُور کرنے کے لئے اُس سُوٴر کو نکالنے گیا تھا۔ واہ کیسی محبت عالمگیر ہے۔ کیسی وحدت۔ ہمدردی ہے!

ع خونِ رگِ مجنُوں سے نکلا فصد لیلیٰ کی جو لی

کیا توحیدِ عملی ہے

پتّی کو پھُول کی لگا صدمہ نسیم کا
شبنم کے قطرے آنکھ سے اُن کی ٹپک پڑے

زندہ مذہب (نقد دھرم) کی رُوح یہ ہے کہ تُم سارے مُلک کے خود (آتما) کو اپنا خود (آتما) دیکھو۔ یہ مذہب کی جان جن مُلکوں میں عملاً ہے وہ ترقی کر رہے ہیں۔ جن قوموں میں یہ نہیں وہ گر رہی ہیں۔ اپنے مُلک کی بابت ایک بات بڑے درد سے کہنی پڑے گی۔ اِن دنوں ہانگ کانگ میں سِکھوں کی فوج ہے۔ اس کے پہلے پٹھانوں کی فوج تھی۔ ہانگ کانگ میں سِکھوں کو (ہمیں ٹھیک یاد نہیں) شاید ایک پونڈ فی کس مشاہرہ ملتا ہے اور عام فوجی سپاہی کو اس سے بھی کم۔ شاید دس روپیہ (دو تہائی پونڈ) ماہوار مشاہرہ ملتا ہے۔ ہانگ کانگ میں پٹھانوں کو گوروں کے برابر

فی کس شاید تین تین پونڈ ملتا تھا۔ جنگِ چین کے موقع پر جب
سکھ لوگ وہاں گئے۔ تو پٹھانوں کی یہ سہ چند سے بھی زیادہ تنخواہ
انہیں ناگوار گذری۔ برٹش پارلیمنٹ کے ہاں عرضیاں پیش کیں کہ
پٹھانوں کو جو تین تین پونڈ ملتا ہے۔ کیوں نہیں ہمیں آج کل کے
دو تہائی پاؤنڈ کے بجائے ایک پورا پونڈ ماہوار ہی دیا جاتا اور
ہمیں اُن کی جگہ بھرتی کرلیا جاتا؟ ان درخواستوں کے خانگی اور
بیرونی گورنمنٹوں کے ہاں پھرنے گھومنے کے بعد پٹھانوں سے پوچھا
گیا کہ کیا تم لوگوں کو بجائے تین پونڈ کے ایک پونڈ مشاہرہ لینا
منظور ہے؟ ایک پٹھان نے بھی قبول نہ کیا۔ پس کُل کی کُل فوج
پٹھانوں کی موقوف کی گئی۔ سب پٹھان بے روزگار ہوگئے۔ بھولے
سکھوں نے اتنا نہ دیکھا کہ آخر یہ پٹھان بھی ہمارے مُلک کے
ہیں۔ درد نہ آیا کہ ان کا رزق مارا گیا۔ رحم نہ آیا کہ بھائیوں کا
گلا کٹ گیا۔ ہائے رشک اور مُلکی پھوٹ! یہ بھوکوں مرتے
پٹھان تلاشِ روزگار میں افریقہ گئے۔ اور سومالی لینڈ کے مُلّا
کے ساتھ ہوکر انہیں سکھوں سے لڑے! اس لڑائی میں بغیر
لڑے آب و ہوا کی سختی وغیرہ ہی سے سکھوں کا وہ حال
ہُوا کہ الٰہی توبہ!۔ لقوے ہوگئے۔ گردنیں مُڑ گئیں۔ بدن سُوکھ گئے۔
تپ وغیرہ نے نڈھال کردیا۔ سچ کہا ہے کہ جو اوروں کی موت کی تدبیر کرتا
ہے وہ اپنی ہی تدابیر سے مرتا ہے۔ کردنی خویش آمدنی پیش۔ چاہ کندہ را
چاہ در پیش۔ جو آدمی خندق کھودتا ہے۔ وہ خود گرے گا۔
جاپان میں ایک ہندوستانی لڑکا تعلیم پاتا ہے۔ علمِ جرِ ثقیل

کی ایک کتاب لائبریری سے عاریتًا لے گیا۔ باقی عبارت یا اُس کے مطلب کو تو اپنی کاپی پر اُتارا لیکن مشینوں کے نقشوں یا تصویروں کی نقل نہ کرسکا۔ اب یہ نہ سوچا کہ اور لوگ بھی اس کتاب سے فائدہ اُٹھانے والے ہیں۔ یہ نہ خیال کیا کہ اس حرکت سے میرا مُلک بدنام ہوگا۔ جھٹ کتاب سے وہ اوراق جن پر تصویریں تھیں پھاڑ لئے۔ اور کتاب واپس کردی۔ کتاب ضخیم تھی۔ بھید نہ کُھلا۔ لیکن چُھپے کیسے؟ سچ بھی کبھی چُھپا ہے؟ ایک روز ایک جاپانی طالبعلم اُس کے کمرے میں آیا۔ میز پر وہ پھٹے ہُوئے اوراق پڑے تھے۔ دیکھکر اُس نے افسر کو اطلاع کردی۔ اور وہاں قانون ہوگیا کہ اب کسی ہندوستانی لڑکے کو کوئی کتاب نہ دی جائے۔ ڈُوب مرنے کا مقام ہے۔ ایک تو آپ نے اُس جاپانی لڑکے کی بات سُنی جو جہاز پر ہندوستانی لوگوں کے لئے کھانا لایا تھا۔ اور ایک اس ہندوستانی لڑکے کی کیفیت دیکھئے۔ جاپانی اپنے نج کا سب کچھ دیدینے کو حاضر ہے کہ مُلک پر دھبا نہ آجائے۔ اور ہندوستانی نج کا بھلا چاہتا ہے سارا مُلک بڑا بدنام ہو۔

ہاتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اکیلا یا علیحدہ ہُوں۔ میرا خُون اور ہے اور سارے جسم کا خون اور ہے۔ اِس غیربینی (بھید باؤ) سے یہ خیال پیدا ہوگا کہ "ہائے! کماؤں تو مَیں اور ملے سارا جسم"! اس خود غرضی کو پُورا کرنے کے واسطے صرف ایک ہی صورت ہوسکے گی وہ یہ کہ جو روٹی کمائی ہے

بجائے سارے جسم کے لئے مُنہ میں ڈالنے کے ہاتھ اُسے اپنی ہتھیلی پر باندھ لے۔ یا ناخنوں میں گھسیڑ لے۔ پر کیا یہ خود غرضی کی پالیسی کار آمد ہوگی؟ البتہ ایک صورت اور بھی ہے کہ شہد کی مکھّی یا بھِڑ سے ہاتھ اپنی اُنگلیاں ڈسوا لے۔ اس طرح سارے جسم کو چھوڑ کر خود اکیلا ہاتھ بہت موٹا ہو جائے گا۔ لیکن یہ فربہی تو سُوجن ہے۔ بیماری ہے۔ اسی طرح جو لوگ قوم کا بھلا اپنا بھلا نہیں سمجھتے۔ اپنے خود (آتما) کو قوم کے خود (آتما) سے جُدا مانتے ہیں۔ ایسے خود غرضوں کو سوائے سُوجن بیماری کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ہاتھ وہی مضبوط اور طاقتور ہوگا جو کان ناک آنکھ پَیر وغیرہ سارے جسم کی آتما کو اپنی آتما مان کر عمل کرتا ہے۔ اور آدمی وُہی پھلے پُھولے گا جو ساری قوم کی جان کو اپنی جان مانتا ہے

امریکہ کا ذرا مفصّل حال

امریکہ میں پہلا تعجب کا ماجرا یہ دیکھا گیا کہ ایک جگہ خاوند تو پروٹسٹنٹ تھا اور عورت رومن کیتھلک۔ دل میں خیال آیا کہ اس قسم کے اختلاف مذہب والے لوگ ہمارے ہند میں (مثل آریہ سماجی اور سناتن دھرمی کے) تو ایک محلہ میں مُشکل سے کاٹتے ہیں اس میاں بیوی کی ایک گھر میں کیسی گذرتی ہوگی۔ دریافت سے معلوم ہُوا کہ بڑے پیار سے رہتے سہتے ہیں۔ اتوار کے روز خاوند پہلے عورت کو اُس کے رومن کیتھلک گرجا میں ساتھ جاکر چھوڑ آتا ہے۔ زاں بعد خود اپنے دُوسرے

گرجا میں جاتا ہے۔ خاوند سے بات چیت ہُوئی تو وہ کہنے لگا کہ جی! میری بیوی کے مذہب کا سوال تو اُس کے اور خُدا کے درمیان ہے۔ میں کون ہُوں دخل در معقولات دینے والا؟ میرے ساتھ اُس کا حساب بالکل پاک ہے۔ خُدا کے ساتھ اپنے سَودے کی وہ جانے۔ کیا خُوب!

امریکہ میں اتحادِ مُلکی کے سامنے اختلافِ مذہبی کی کچھ حقیقت نہیں۔ ہندوستان کا آریہ سماجی ہو۔ سِکھ ہو۔ مسلمان ہو۔ عیسائی ہو۔ امریکہ میں ہندُو ہی کہلاتا ہے۔ اُن کے دِلوں میں وحدتِ مُلکی اس قدر سما رہی ہے کہ وہ ہمارے یہاں کے اتنے بھاری مذہبی تفرقوں کو نظر انداز کرتے ذرا دیر نہیں لگاتے۔ ہندوستان کے بعض فرقوں کے لوگ اگر یہ جانتے کہ انجام کار اور مہذّب مُلکوں میں ہم نے ہندو ہی کہلانا ہے۔ تو لفظ ہندو پر اتنے جھگڑے نہ کرتے اور اس نام سے اس قدر عار نہ مانتے۔

ایک باعث اُس مُلک کے زبردست ہونے کا یہ بھی ہے کہ وہاں برہم چریہ ہے۔ طاقتِ انسانی عصمت کو زائل نہیں ہونے دیتے۔ عموماً بیس برس تک تو لڑکے یا لڑکی کو خیال بھی نہیں آتا کہ بیاہ کیا چیز ہے۔ اس کا ایک سبب بغور دیکھنے سے یہ معلوم ہُوا کہ لڑکے لڑکیاں بچپن سے اکٹھے کھیلتے کُودتے ایک چھت کے نیچے پڑھتے۔ لکھتے اور ساتھ رہتے سہتے ہیں۔ اور پھر پہلو بہ پہلو کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ بدیں وجہ آپس میں بھائی بہن کا سا رشتہ بنا رہتا ہے۔ اور دِل عفّت اور

پاکیزگی سے بھرے رہتے ہیں۔ وہاں لڑکیاں بلحاظِ جسم لڑکوں کے برابر مضبوط ہوتی ہیں۔ اس لئے جوانی میں اُن کی اولاد بھی طاقتور ہوتی ہے۔ مرد اگر مضبوط ہے اور عورت کمزور تو اُس کا اثر نصفا نصف کے اَولاد پر ہوگا۔

ایک مرتبہ جھیل (لیک جینوا) کے کنارے رام رہتا تھا۔ ایک تیرہ سال کی لڑکی جھیل میں تیرتے تیرتے تین میل تک چلی گئی۔ کشتی پیچھے پیچھے تھی۔ مبادا ڈُوبنے لگے تو مدد کی جائے۔ مگر کہیں مدد کی ضرورت نہ پڑی۔ جب لڑکیوں کا یہ حال ہے۔ تو بعد میں اُن کی اولاد کیوں قوی نہ ہوگی۔ اور جب بدن میں صحت ہے تو دِلوں میں صحت یعنی پاکیزگی کیوں نہ ہوگی۔ اور ان کے برہم چریہ کی یہ بھی ایک وجہ ہے۔ کمزوری سے پاپ ہوتا ہے۔ بدہضمی سے ناپاکی ہوتی ہے۔ معدہ صحت میں نہ ہو تو خواہ مخواہ کی چِنتا اور فِکر دامنگیر ہوتے ہیں۔ جب صحت دُرست نہیں ہے تو بات بات میں غُصّہ آتا ہے۔ وید میں لکھا ہے کہ کمزور اس آتما کو نہیں جان سکتا۔

नायमात्मा बलहीनेन लभ्यः (मुं० उप० ३।२।४)

کمزور کی دال ایشور کے گھر میں بھی نہیں گلتی۔ جس کے اندر جسمانی اور رُوحانی بل (یا طاقت) نہیں ہے وہ برہم چریہ کو کب قائم رکھ سکتا ہے؟ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ برہم چریہ سے عاری جسمانی اور رُوحانی طاقت سے عاری ہوجاتا ہے۔

وہاں کالجوں میں کیا کیفیت ہے۔ بی۔ اے۔ ایم۔ اے اور

ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تک جسمانی تعلیم ساتھ ساتھ دیجاتی ہے۔ جنگی تعلیم اور زراعت۔ لوہار۔ بڑھئی۔ معمار کا کام برابر سکھلایا جاتا ہے۔

آدمی کے اندر تین بھاری محکمے ہیں۔ ایک کرم اندریہ۔ دُوسرا گیان اندریہ۔ اور تیسرا انتہ کرن۔ ان کو انگریزی میں ایچ (H) والے تین لفظوں سے تعبیر کرسکتے ہیں اور اُردو میں ان کو تین دال والے تعبیر کیا جا سکتا ہے یعنی دست۔ دِل و دماغ۔ ہینڈ۔ ہیڈ اور ہارٹ۔ گیان اِندریوں (حواسِ خمسہ) سے باہر کا علم اندر جاتا ہے۔ اور باہر کی اشیاء اندر اثر کرتی ہیں۔ کرم اِندریوں (مثل ہاتھ پیر) سے اندر کی طاقت باہر اثر کرتی ہے۔ کرم اِندریہ اور گیان اِندریہ۔ اگر متناسب نشوونما اور ترقی پاویں تو بہتر ہے۔ اگر باہر سے علم کو ٹھوستے جاویں۔ اور اندر کے علم و طاقت کو باہر نہ نکالتے رہیں۔ تو حالت ویسی ہی ہو جاتی ہے کہ آدمی کھاتا تو رہے۔ لیکن اُس کے بدن سے کُچھ اخراج نہ ہو سکے۔ اِس کا نتیجہ ہوگا عقلی بدہضمی اور روحانی قبض۔ یہ تعلیم نہیں ہے۔ بیماری ہے۔ امریکہ میں عموماً یونیورسٹی کی تعلیم کا یہ مقصد اور غرض ہے کہ مُلک کی چیزیں کام میں لائی آجاویں۔ یعنی زمین۔ معدنیات۔ نباتات اور اجناس وغیرہ کا استعمال اور زیادہ قیمتی بنانا معلوم ہو جائے۔ جتنے فنون سکھلائے جاتے ہیں۔ براہ راست کارآمد اور مفید مطلب۔ کوئی لڑکا بے فائدہ کیمسٹری نہیں پڑھے گا اگر اُس نے علم کیمیا کو استعمال میں لانے کا ہُنر مثل کیمیکل انجینرنگ وغیرہ بھی ساتھ نہ سیکھنا ہو۔

ایک مذہبی کالج میں رام کا لیکچر ہُوا۔ لیکچر کے بعد کالج کے لوگوں نے اپنی جنگی قواعد دکھلائی۔ اور کالج کے جنگی نعروں وغیرہ سے لیکچر کی سلامی کی۔ رام نے پُوچھا۔ یہ کیا؟ مذہبی تو کالج اور جنگی تعلیم! پرنسپل صاحب نے جواب دیا۔ مذہب کے معنی ہیں جسم و جسمانیت کو عیسیٰ کی طرح صلیب پر چڑھا دینا۔ خودی کو مٹا دینا۔ جان کو مُلک کی خاطر ہتھیلی پر اُٹھائے پھرنا۔ اور یہ جاں نثاری اور سچّی بہادری کی روح جنگی تعلیم سے آتی ہے۔

اب نرم دِلی اور صفا قلبی دانتہ کرن کی شُدھی) کی تعلیم کی کیفیّت دیکھئے۔ ایک یونیورسٹی میں رام گیا۔ جو طالب علموں اور اُستادوں کی کمائی سے چل رہی تھی۔ طالب علم وہاں فیس وغیرہ کچھ نہیں دیتے۔ علاوہ اور تعلیم کے پروفیسروں کے زیر اہتمام کالج کی زمین پر یا مشینوں (کلوں) پر کام کرتے ہیں۔ پروفیسر ایجاد و اختراع کرتے ہیں اور کرنا سکھلاتے ہیں۔ زمین کے انوکھی ڈھنگ کی نرالی پیداوار اور نئی کاریگری کی آمدنی سے سب اخراجات ادا ہوتے ہیں۔ رام کی موجودگی میں ایک کمرے میں طالب علموں کی آپس میں تکرار ہو پڑی۔ پریزیڈنٹ کے پاس مقدمہ گیا۔ پریزیڈنٹ نے اُس کمرے میں سب کام بند کر دیا۔ پیانو باجا بجانا شروع کرا دیا۔ ۱۵ منٹ میں مقدمہ فیصل ہوگیا۔ یعنی خود بخود صُلح ہوگئی۔ واہ! جن کے اندر شانت رس بھرا ہے باہر کی موسیقی اُن کے اندر کی صُلح اور امن کو دم اکسانے کے لئے کافی بہانہ ہوجاتی ہے۔ اور کیسا انتظام ہے۔ ہوا میں ستوگن بھر دیا۔ دِلوں کی کھٹ پٹ

آپ ہی رفع ہو گئی۔

شکاگو یونیورسٹی کے ایک انڈرگرایجویٹ نے رام کے فلسفہ پر چند لیکچروں کے نوٹ لئے اور تھوڑے دنوں میں اپنی طرف سے افراط و تفریط کے بعد اُن کی ایک کتاب بناکر یونیورسٹی میں پیش کی۔اس طالب علم کو ایک جماعت کی ترقی فی الفور دی گئی۔ یہ نہیں دیکھا کہ آیا اس طالب علم نے مِل اور ہمیلٹن وغیرہ کی کتابوں سے اپنے دماغ کو لیٹر بیگ (چٹھیوں کا تھیلا) بنایا ہے کہ نہیں۔ بیشک اصلی تعلیم کا معیار یہ ہے کہ ہم اندر سے کس قدر علم باہر نکال سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ باہر سے کس قدر اندر ڈال چکے ہیں۔

رام ایک دفعہ وہاں کوہستان شاستنا کے جنگلوں میں رہتا تھا۔ کچھ آدمی ملنے آئے اُن کے ساتھ ایک بارہ برس کی لڑکی تھی۔ سب رام کے اُپدیش کو بغور سُنتے رہے۔لیکن تھوڑی دیر کے لئے لڑکی الگ جاکر بیٹھ گئی۔جب واپس آئی تو ایک کاغذ پیش کیا۔ یہ کیا تھا؟ رام کا کُل اُپدیش جسے وہ انگریزی نظم میں پرو لائی۔ بعد میں یہ پوئٹری وہاں کے اخباروں میں چھپ بھی گئی۔بچّوں کی یہ ذہانت اور لیاقت اُن کو آزاد رکھنے کا نتیجہ ہے۔

انسان خواہ بچّہ ہو خواہ بُزرگ "حیوان ناطق" کہلاتا ہے۔ ان دو اجزاء میں نطق تو سوار ہے اور حیوانیت گویا سواری کا گھوڑا۔ جب ہم بچّوں کے نُطق کو پریم سے سمجھاکر اُن سے کام نہیں لیتے بلکہ زجر و توبیخ اور جھڑک ملامت سے اُن پر حکومت

کرتے ہیں تو گویا حیوانیت کے گھوڑے کو لاٹھی کے زور سوار (نفس ناطق) کے رانوں تلے سے نکال لے جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بچّہ کے اندر والے کو غصّہ کیوں نہ آئے۔ بچّوں کو ڈانٹنا صرف حیوانیت سے کام لینا ہے۔ اور اُن میں اُس جزو کی ہتک کرنا ہے۔ جس کے بدولت انسان اشرف کہلاتا ہے۔ جبر یا ملامت کرنا اُن کے اندر بیٹھے بزرگ کی توہین ہے۔ بلا سمجھائے یا وجہ بتلائے بچّے پر حکم یوں ہی نافذ کرنا کہ ایسا مت کرو ویسا مت کرو اُسے وہ کام کرنے کی تحریک بالواسطہ کرنا ہے۔ جس وقت خداوند تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے فرمایا کہ فلاں درخت کا پھل مت کھانا۔ تو اُسی روک کے باعث حضرت آدمؑ کے دِل میں یہ خیالِ بد پیدا ہوا۔ اُس باغِ جنّت میں ہزاروں درخت تھے۔ لیکن جب قید لگائی کہ یہ نہ کھانا تو خواہ مخواہ اُس کے کھانے کی خواہش ہوئی۔ بہت ہی ضروری اشتہاروں کا یہ عنوان ہوتا ہے۔ "اِسکو مت پڑھنا"۔

کسی شخص نے ایک فقیر سے منتر چاہا۔ مہاتما نے منتر بتلاکر کہا کہ تین مالا جپنے سے منتر سِدّھ ہو جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ خبردار مالا جپتے کہیں بندر کا خیال نہ آنے پائے۔ تھوڑے تجربہ کے بعد وہ بیچارہ فقیر سے آکر کہنے لگا۔ پیرو مُرشدا بندر میرے تو کہیں خواب میں بھی نہ تھا لیکن آپ کے خبردار کرنے سے اب تو (نعوذ باللہ) مجھے چھوڑتا ہی نہیں۔ یہ اثر معکوس والی اُستادی کا ڈھنگ امریکہ میں نہیں۔ بچّوں کی تعلیم وہاں کنڈر گارٹن (Kinder Garten) گلزارِ نونہال کے طریق پر ہوتی ہے۔

اُستاد بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے گاتے ناچتے پڑھاتے چلے جاتے ہیں - اور بچے دل لگی کے طور پر کمال حاصل کرتے جاتے ہیں۔ مثلاً لڑکوں کو جہاز کا سبق دینا ہے۔ ایک ایک لکڑی کا جہاز بنا ہُوا ہر لڑکے کی کُرسی کے آگے رکھا ہُوا ہے - اور بانس کی بھانکیں وغیرہ پاس دھری ہیں - جن سے نیا جہاز بن سکے - بچوں کے ساتھ ملے ہُوئے اُستاد یا اُستانیاں کہتی ہیں "ہم تو جہاز بناوینگے ہم تو جہاز بناویں گے۔" بچے بھی دیکھا دیکھی کہنے لگتے ہیں - ہم بھی جہاز بناویں گے۔ اَیلو! سب بیٹھ گئے۔ ایک لڑکے نے جہاز بنادیا - وہ دُوسرا بھی کامیاب ہوگیا - پھر تیسرے نے بنالیا - جس کو ذرا دیر لگی اَور بچوں نے یا اُستانی نے مدد دی - پھر بچوں نے بڑے شوق سے اُستانی سے خود سوال کرنے شروع کئے۔ اس حصّے کا کیا نام ہے؟ وہ حِصّہ کیا کہلاتا ہے؟ یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ اُستانی مستول وغیرہ سب کا حال و نام بتلاتی جاتی ہے۔ اور بچے جہاز کے متعلّق سب باتیں گویا خود ہی سیکھ گئے۔ ہمارے یہاں لڑکے پڑھتے "کیل۔ کیل" معنی جہاز کی پیندی۔ سر میں کیل ٹھُک گئی۔ مگر لڑکے کو خبر بھی نہ ہُوئی کہ کیل کیا چیز ہے اور جہاز کیسا ہوتا ہے۔ وہاں بستے (پدارتھ) سے واقفیت پہلے کرائی جاتی ہے اور نام پیچھے بتلایا جاتا ہے - یہاں پد (نام) پہلے یاد کراتے ہیں - پدارتھ (بستے) کا خواہ ساری عمر پتہ نہ لگے۔ وہاں بچے سوال کرتے ہیں (جیسا کہ بچوں کا سب جگہ دستُور ہے) اور اُستاد کا کام ہے اُن کو پُورے پُورے جواب دیتے جانا۔ یہاں اتنے بڑے

اُستادوں کو شرم نہیں آتی ننھے ننھے بچوں کو سوال پُوچھ پُوچھ کر
حیران کرتے ہیں۔ پڑھنا وہ کیا ہے۔ جس سے لذّتِ رُوحانی نہو۔
یہاں اُستاد کو دیکھکر بچّوں کی مارے دہشت کے جان جاتی ہے
وہاں بچّوں کی جو محبّت اُستادوں سے ہے ماں باپ سے نہیں۔
جو خوشی اسکول میں ہے گھر میں نہیں۔ اسکولوں میں فیس
وہاں نہیں لی جاتی اور کتابیں سب کو مفت دیجاتی ہیں۔

دوکانوں کی وہاں کیا حالت ہے؟ شکاگو میں رام ایک دوکان
پر مدعو ہُوا جس کے فرش کا رقبہ ایک تہائی غازی پور سے
کم نہ ہوگا۔ اور دوکان کے نیچے اوپر پچیس منزلیں تھیں۔ جس
منزل پر جانا ہو بالاکش (elevator ایلیویٹر) جھٹ لیجائیں گے۔
ہر منزل میں نئی قسم کا مال بھرا ہُوا تھا۔ کروڑوں کے گاہک
روز آتے ہیں۔ لیکن دوکان والوں کا سلوک سب کے ساتھ
یکساں ہے۔ چاہے لاکھ کا خریدار ہو چاہے پیسہ کا۔ قیمت ایک
ہی ہوگی۔ جو ہر چیز کے اوپر لکھی ہے۔ اس سے کوڑی کم نہیں۔
کوڑی زیادہ نہیں۔ اور خندہ پیشانی سب کے ساتھ یہاں تک
کہ جو کچھ بھی نہ خریدے اور دس چیزوں کی قیمت پُوچھ پُوچھ کر
چلا جائے اُسے بھی دروازے تک چھوڑنے آتے ہیں۔ اور حسب
دستور سلام کرتے ہیں۔ اس بڑی دوکان پر ہی نہیں۔ معمولی
دوکانوں پر بھی یہی سلوک ہوتا ہے۔

امریکہ۔ جاپان۔ انگلینڈ۔ جرمنی میں پولیس از حد شائستہ
اور رعایا کی خدمتگار ہے۔ پرجا رکشک ہے۔ پرجا بھکشک نہیں

بعض حاضرین شاید دل میں کہہ رہے ہوں گے۔ کہ بس! اب بند کرو۔ امریکن لوگوں کی ثنا خوانی کرنی۔ اُن کے گیت کہاں تک گائے جاؤ گے؟ کیا ہمیں امریکن بنانا چاہتے ہو؟ اس وہم والوں سے رام کہتا ہے۔ کہ ہندوستانی امریکن بنیں؟ ہر! ہر!! ہر!!! دُور ہو یہ خیال جس کے دل میں بھی آیا ہو۔ دفع ہو یہ اُمید جس نے کبھی کی ہو! رام کا ایسا خیال ہرگز نہ ہوا۔ نہ ہو گا۔ البتہ بعض باتیں اُن مُلکوں سے لینا ہم لوگوں کے لئے ضروری ہیں۔ اگر ہم نیستی کے چُنگل سے بچنا چاہتے ہیں۔ اگر ہمیں ہندو بنے رہنا منظور ہے۔ تو ہمیں اُن کے علوم و فنون لینے ہوں گے۔ خواہ کسی قیمت پر ملیں۔ جب رام امریکہ میں رہا تو سر پر پگڑی ہندوستانی تھی۔ لیکن بازاروں میں برف ہونے کے باعث پاؤں میں جُوتا اُسی مُلک کا تھا۔ لوگوں نے کہا کیُوں جُوتا بھی ہندوستانی نہیں رکھتے؟ رام نے جواب دیا کہ "سر تو ہندوستانی رکھوں گا لیکن پاؤں تمہارے سے لوں گا۔" رام کی نیت تو یہ ہے کہ آپ ہندوستانی بنے رہکر امریکہ وغیرہ والوں سے بڑھ جاؤ۔ اور یہ اُن قوموں سے گُریز کرتے ہُوئے نہیں ہوسکتا۔ آج برق اور دُخان۔ ریل۔ تار وغیرہ زمان و مکان (فاصلہ اور وقت) کو گویا ہڑپ کرگئے ہیں۔ دُنیا ایک چھوٹا سا ٹاپو بن گئی ہے۔ سمندر سدراہ ہونے کے بجائے شاہ راہ ہوگیا ہے۔ جن کو کبھی علیٰحدہ مُلک گنتے تھے۔ وہ شہر ہوگئے ہیں۔ اور اگلے شہر گویا گلیاں ہورہی ہیں۔ آج اگر ہم اپنے تئیں الگ تھلگ رکھنا چاہیں اور

دیگر قوموں سے جُدا مان کر اپنے ہی ڈھائی چاول کی کھچڑی پکائیں۔ آج بیسویں صدی میں اگر ہم بیسویں صدی قبل از مسیح کے رسم و رواج برتیں۔ آج اگر ہم مغربی فنون کا مقابلہ کرنا نہ سیکھیں۔ اور اگر آج ہم اُدھار دھرموں کی لڑائی جھگڑے چھوڑ کر نقد دھرم کو نہ برتیں۔ تو ہم اس طرح سے اُڑتے ہیں جس طرح برق و دُخان سے فاصلہ اور وقت۔ اپنی حالت کو پہچانو۔

> کنچن ہووے کیچ میں پکھ میں امرت ہوئے
> ودیا ناری نیچ میں تینوں لیجے سوئے

جب ہندوستان میں اقبال تھا تو اپنے کو اہل ہند نے کنوئیں کا مینڈک نہیں بنا رکھا تھا۔

جب پُشکر میں جگ ہُوا۔ تو حبشی۔ چینی۔ اور ایرانی قوموں کے لوگوں کو دعوت دی گئی۔ راجسُو جگ کے پہلے۔ بھیم۔ ارجن نکل۔ سہدیو۔ دُور دُور کے غیر مُلکوں میں گئے۔ خود رام چندر مریادا پرشوتم اوتار نے سمندر پار جانے کی مریادا باندھی۔

> دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرِ ما
> چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما

(کل مسجد سے شراب خانہ کی طرف ہمارے مُرشد آئے۔

(ایسی صُورت میں اے اہل طریقت بتاؤ اس کے بعد ہم کیا کریں)

اُن دنوں تو ہندوستان کسی غیر مُلک کا محتاج بھی نہ تھا۔ لیکن آج غیر مُلکوں کے فنون سیکھنے کی ضرورت ہے کہ اُن کے بغیر جان جاتی ہے۔ پس آج ہندوستان اگر جینا چاہے تو امریکہ۔

یورپ ۔ جاپان وغیرہ باہر کی دُنیا سے اپنے تئیں خود چھینک نہ دے (خارج نہ کرے)، باہر کی ہَوا لگنے سے جان میں جان آجائے گی۔ ہندو باہر جائیں گے۔ تو سچے ہندو بن جائیں گے۔ باہر جانے سے اپنے شاستر کی قدر معلوم ہوگی۔ اور شاستر عمل میں آنے لگیں گے۔ تم اپنے تئیں تارک الدُنیا بنا نہیں سکتے۔ جتنا اجنبی لوگوں سے گریز کیا اُتنا اُن کے غلام بن کر رہنا پڑا۔

قوتِ خیال:۔ پُرانوں میں سُنا کرتے تھے اور پڑھا کرتے تھے کہ فلاں رشی کے بر یا شاپ سے فلاں شخص کی حالت بدل گئی۔ یوگ باشِشٹ میں مثلاً (سِرشٹی) میں سرِشٹی (دُنیا) دکھانے کا ذکر آتا ہے۔ لیکن امریکہ میں اس قسم کے نظارے آنکھوں کے سامنے مشاہدے سے گذرے۔ یونیورسٹی کے مکانوں اور ہسپتالوں میں اس قسم کے تجربے کئے جاتے ہیں۔ ہزاروں بیمار صرف قوتِ خیال سے راضی کئے جاتے ہیں۔ پروفیسر کی تحریک سے میز کا گھوڑی نظر آنا یا جمیز صاحب کا ڈاکٹر پال ہو جانا (شخصیت کا بدل جانا) پُرانے جمیز پن کا اُڑ جانا اپنی آنکھوں دیکھا۔

توحید:۔ سنسکرت میں بیدانت (توحید) کے از حد مستانہ نسخے ہیں۔ وِناترے کی ادوُھوت گیتا۔ اشٹاوکر گیتا۔ شنکر آچاریہ کے استوتر۔ یا بعض حصے یوگ باشِشٹ کے۔ فارسی میں سب سے بڑھکر توحید کا کلام شمس تبریز کا ہے۔ اُس سے اُتر کر مثنوی شریف۔ شیخ عطار۔ مغربی وغیرہ۔ لیکن امریکہ میں والٹ وہیٹ مین کے اوراقِ گیاہ وہی توحید کی مستی اور آزادی لاتے ہیں

جو ابدُھوت گیتا۔ اشٹاوکر گیتا۔ ترانہ ہائے شنکر و شمس تبریز اور بُلّھا شاہ کا کلام بلکہ اُن سے بھی کہیں بڑھکر۔

ع ڈٹ کر کھڑا ہُوں خوف سے خالی جہان میں
تسکینِ دِل بھری ہے مِرے دِل میں جان میں
سُونگھیں زماں مکاں ہیں میرے پاؤں مثلِ مگ
مَیں کیسے آسکوُں ہُوں قیدِ بیان میں

حبشی غلاموں کو آزادی دینے کے لئے امریکہ کی خانہ جنگی کے دنوں یہ وہٹمین ہر لڑائی میں سب سے آگے موجود تھا۔ دونوں طرف کے زخمیوں کو مرہم پٹی کرنا۔ پیاسوں کو پانی پلانا۔ سسکتی جانوں کی جان میں اپنے تبسّم سے جان لانا اور اسی موقع کی اپنی تازہ تصنیف (نغمہِ اوراقِ گیاہ) کو رات دن گاتے پھرنا اُس کا دل لگی کا کام تھا۔ اس ہنگامہ اور شور و شیون میں معرکہ کے کارزار میں۔ بلا کے جنگ و جدل میں۔ وہٹمین ایسا بشاش و مطمئن پھرتا تھا۔ جیسے شوشنکر بھُوت پریت کے گھمسان میں یا جیسے کرشن بھگوان کورو کھیشتر کے میدان میں مبارک تھے۔ ان لگاتار لڑائیوں کے نیم بسمل۔ جو ایسے مسیحا کے درشن کرتے جاں بحق ہُوئے

ع شب ہو۔ ہوا ہو۔ دھُوپ ہو۔ طُوفان ہو چھیڑ چھاڑ
جنگل کے پیڑ کب اِنہیں لاتے ہیں دھیان میں
گردش سے روزگار کی ہلجائے جس کا دِل
انسان ہو کے کم ہے درختوں سے شان میں

اس درجہ کا برہم نشٹھ (عارف با عمل) امریکہ میں ہنری تھورو بھی ہُوا ہے۔ سچے برہم چاری سنّیاسی کی زندگی تنہا جنگلوں میں بسر کرتا تھا۔ البتہ سُستی پرست سادھو نہ تھا۔ امریکہ کا سب سے بڑا مصنف ایمرسن اُس تھورو کی بابت لکھتا ہے کہ شہد کی بھڑیں اُس کی چارپائی پہ ساتھ سوتی ہیں۔ لیکن اُس نڈر پریم کے پُتلے کو نہیں ڈستیں۔ جنگل کے سانپ اُس کے ہاتھوں اور ٹانگوں کو چمٹ جاتے ہیں۔ لیکن وہ کنگن اور پازیب کی طرح اُن کی پروا نہیں کرتا۔ کیسا دیال بھُوشن ہے! رستہ چلتے چلتے ایمرسن نے پُوچھا کہ یہاں کے پُرانے باشندوں کے تیر کہاں ملتے ہیں؟ تو حسب دستور جھٹ جواب دیا "جہاں چاہو" اور اتنے میں جُھک کر اُسی جگہ سے مطلوبہ تیر اُٹھا کر دیدیا۔ درِشٹی سرِشٹی یا مسئلہ دید پدید کی کیا عملی مشق ہے!

خود ایمرسن جس کی تصنیفات نے نئی دُنیا میں نئی رُوح پھُونکدی بھگوت گیتا۔ اور اُپ نِشدوں کا نہ صرف عالم بلکہ بہت بڑا عامل تھا۔ اُس نے اپنے مضامین میں اُپنشدوں اور گیتا کے اکثر جگہ حوالہ دئے ہیں۔ اور اُس کے بچ کے دوستوں کی زبانی معلوم ہُوا کہ اُس کے خیالات پر بالخصوص گیتا۔ اور۔ اُپنشدوں کا اثر تھا۔ مہاتما تھورو اپنے والڈن میں لکھتا ہے "علی الصباح میں اپنے دِل و دماغ کو بھگوت گیتا کے پوتر گنگا جل میں اشنان کراتا ہوں۔ یہ وہ معظم اور عالمگیر فلسفہ ہے۔ کہ اس کو تحریر میں آئے دیوتاؤں کے سالوں کے سال بیت گئے۔ لیکن اسکے

برابر کی تصنیف نہیں نکلی۔ اس کے مقابلہ میں ہماری موجودہ دُنیا مع اپنے علم ادب کے حقیر اور ناچیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کی بُزرگی ہمارے قیاس و گمان سے اس قدر برتر ہے کہ مُجھے کئی دفعہ خیال آتا ہے کہ شاید یہ فلسفہ کسی اور ہی یُگ میں لکھا گیا ہوگا" ایک موقع پر مصر کے عالیشان میناروں کا ذکر کرتے ہُوئے تھورو لکھتا ہے "پچھلی دُنیا کی تمام یادگاروں میں بھگوت گیتا سے عجیب ترین کچھ نہیں"۔ یہی بھگوت گیتا اور اُپنشدوں کی تعلیم عمل میں آئی ہُوئی عملی ویدانت یا نقد دھرم ہو جاتی ہے۔ اسی کو رگوں پٹھوں میں لاکر وہ لوگ ترقی پا رہے ہیں۔ آپ کے یہاں یہ قیمتی نوٹ (ہُنڈی) موجود ہے۔ پر کاغذ کے نوٹ سے خواہ کتنا ہی قیمتی ہو بھوک نہیں اُترتی۔ پیاس نہیں بجھتی۔ بدن کا جاڑا دُور نہیں ہوتا۔ اس ہُنڈی کو بھُناکر نقد دھرم میں بدلنا پڑے گا۔ آج وہ لوگ اس نوٹ کی قیمت دے سکیں گے۔ آج وہاں پر یہ ہُنڈی کھری ہو سکتی ہے۔ جاؤ اُن کے پاس۔

جب سیتا جی اجودھیا سے بن باس کو سدھاریں۔ تو اُن کے پیچھے رونق دُور ہو گئی۔ ماتم پھیل گیا۔ رعیت بیچین ہو گئی۔ راجہ کا شریر چھُوٹ گیا۔ رانیوں کو رونا پیٹنا پڑ گیا۔ تخت چودہ برس تک گویا خالی رہا۔ اور جب سیتا جی کو سمندر پار سے لانے کے لئے مہاراج رامچندر کھڑے ہو گئے۔ تو پرندے (گرُڑ اور جٹایو) بھی مدد کو تیار ہو گئے۔ جنگل کے حیوان (بندر۔ ریچھ

وغیرہ) لڑنے مرنے کے لئے خدمت میں حاضر ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اپنی چھوٹی حیثیت کے مطابق گلہریاں بھی مُنہ میں ریت کے دانے بھر بھر کر پُل باندھنے کے لئے سمندر میں ڈالنے لگ گئیں! ہَوا اور پانی بھی موافق بن گئے۔ پتّھر بھی جب سمندر میں ڈالے تو سیتا کی خاطر اپنی عادت کو بھُول گئے اور بجائے ڈوبنے کے تیرنے لگے

کنُم صد سر فدائے پائے سیتا
چہ یکتا سر چہ دہ تا سر چہ سی تا

(ایک سر۔ دس سر یا تیس سر تو کیا۔ میں سو سر سیتا جی کے قدموں پر فدا کرتا ہوں)

سیتا سے مراد ادھیاتم رامائن میں ہے "برہم ودیا"۔ ہم کہیں گے "عملی برہم ودیا"۔ عملی برہم ودیا (نقد دھرم) کو الوداع کہنے سے ہندوستان میں سب طرح کی تباہی وارد ہُوئی۔ کیا کیا مصیبت نہیں آئی۔ کس کس دُکھ اور بیماری نے ہمیں تختۂ مشق نہیں بنایا؟ ہائے! یہ سیتا سمندر پار چلی گئی! عملی برہم ودیا کو سمندر پار سے آج لانے کے لئے کھڑے تو ہو جاؤ۔ اور دیکھو۔ تمام کائنات کی طاقتیں آپس میں شرطیں باندھ باندھ کر تمہاری خدمت بجا لانے کو دست بستہ حاضر کھڑی ہیں۔ سب کے سب دیوتا اور ملایک سرِ تسلیم خم کئے پڑے ہیں۔ قُدرت کے قانُون قسمیں کھا کھا کر تمہاری مدد کو کمر بستہ تیّار کھڑے ہیں۔ اپنی خُدائی میں جاگو تو سہی۔ اور پھر دیکھو ہوتا ہے

کہ نہیں۔

سارے جہاں میں اچھّا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اُس کی وہ بوستاں ہمارا

اوم! اوم!! اوم!!!

بشواس یا ایمان

(یہ لیکچر ستمبر ۱۹۰۵ء کو فیض آباد میں ہوا)

سوامی جی نے فرمایا کہ ویاکھیان سے پہلے ہم سبھوں کو دھیان کر لینا ضروری ہے یعنی اس بات کا خیال کریں کہ ہم سب میں ایک ہی آتما ویاپک ہے۔ ایک ہی سمندر کی ہم سب لہریں ہیں۔ ایک ہی تاگے میں ہم سب مالا کے موتیوں کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔

پھر تھوڑی دیر تک ایک عالمِ خاموشی رہا اور سوامی جی اور حاضرین اس دھیان میں ڈوب گئے۔ زاں بعد ادم کو بآواز بلند کہکر سوامی جی نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی۔

بناس پتی (Botany علم نباتات) کا یہ ایک مسئلہ ہے کہ جن سے پودے پھول نہیں دیتے وہ اپنے پتّوں کو اس طرح شوبھا دیتے ہیں کہ اُن کے سامنے پھول مات ہو جاتے ہیں۔ خواہ رنگت کے لحاظ سے دیکھو خواہ خوشبو کے خیال سے۔ رنگ و بُو دونوں ہی میں وہ پتّے پھولوں سے کسی حالت میں کمتر نہیں ہوتے۔ بلکہ زور اور طاقت کے لحاظ سے وہ پھولوں سے بہتر ہیں۔ کیونکہ اُن میں بجائے پھولوں کی نزاکت اور کمزوری

کے قوّت اور طاقت ہوتی ہے۔ اس کا باعث کیا ہے۔ اس کا سبب بھی وہ ہی "برہم چریہ" ہے یعنی پُشپوں کا بیاہ ہوتا ہے۔ مگر وہ پودے جو پُھولتے نہیں برہم چاری رہتے ہیں۔ جب یہ بات درختوں میں پائی جاتی ہے تو کیا انسان میں اس کا ظہور نہیں ہے؟۔

ہماری نگاہ ست حقیقت پرمیشور میں اس طرح جمنی چاہئے کہ اس کے سامنے اس جگت کے پدارتھ سب کے سب متھیا (بے حقیقت) نظر آنے لگیں۔

حور پر آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا

ٹھگنی کیا نینا چمکاوے
کبیرا تیرے ہاتھ نہ آوے

رام اسی حالت کا نام ابھیاس۔ یقین۔ شردّھا۔ بشواس یا اسلام بتلاتا ہے۔

وحشی قوموں کا ذکر ہے کہ رات کو وہ جاڑے کے مارے ٹھٹھر رہے ہیں۔ اگر کسی نے اُن کو کمبل دیدیا تو اوڑھ لیا۔ پھر جہاں صُبح ہُوئی اور دُھوپ نکلی۔ پھر جس نے چاہا ایک مصری کی ڈلی دے کر اُن سے کمبل لے لیا۔ رات ہُوئی۔ اب پھر کانپ رہے ہیں۔ پھر دُوسری رات کو کمبل پایا۔ اوڑھا اور دِن میں کسی نے ایک ذرا سی مصری کی ڈلی کا لالچ دے کر اُن سے کمبل لے لیا۔ یعنی اب دِن کو اس مصری کی ڈلی کے

سامنے وہ رات کا جاڑا جو اب سامنے موجود نہیں ہے یاد نہیں آتا۔ اسی طرح ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے آپ کو وحشی نہیں کہتے۔ مگر وہ اُس چیز کو نہیں مانتے جو اُن کی آنکھوں کے سامنے اس وقت موجود نہیں۔ یعنی وِشواش نہیں رکھتے۔ اُس چیز کا ماننا جو اُن کی آنکھوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔ وشواش۔ یقین (Faith) یا اسلام کہلاتا ہے۔

ایک دفعہ دیوتاؤں کا اُسروں کے ساتھ یُدھ ہُوا۔ دیوتا لوگ اسروں سے طاقت میں کم تھے۔ اُن کے گُرو برہسپتی نے چارواک کی فلاسفی اُسروں کو سکھلائی۔ اس فلاسفی کے ایسے ہی اصول ہیں۔ Eat, drink and be merry (کھاؤ۔ پیو۔ اور مزے اُڑاؤ)۔ اور کسی چیز کو جو تُمہارے سامنے نہ ہو مت مانو۔

جس قوم میں نیکی۔ ست۔ یا ایشور پر وِشواس۔ شردّھا یا اسلام نہیں ہے۔ وہ قوم فاتح نہیں ہوسکتی۔ ایک صاحب نے آج رامؔ سے یہ شکایت کی کہ وِشواس نے ہندوستان کو برباد کردیا۔ وہ صاحب وِشواس کا ارتھ نہیں جانتے ہیں۔ لو آج رامؔ وِشواس کے بارے میں کچھ بولے گا۔ والٹ وھٹمین (Walt Whitman) جس کا ذکر رامؔ نے کل کیا تھا اور جس کے نام پر آج سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی جنہوں نے اس کے آنند بھرے کلاموں کو پڑھا ہے۔ اُسی طرح جان دینے کے لئے تیار ہیں۔ جس طرح عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ پر

اہلِ اسلام محمد صاحب پر۔ اور ہندو لوگ بھگوان رام یا کرشن پر۔ اپنی کتاب موسومہ بہ (Leaves of Grass اوراقِ گیاہ) میں اس طرح لکھتا ہے کہ آسمان پر تارے اور زمین پر ذرّے صرف دھرم یا وشواس کی خاطر چمکتے ہیں۔ اس امریکن مصنّف کا حوالہ رام اس وجہ سے دیتا ہے کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یورپ اور امریکہ والے سب کے سب ناستک ہوتے ہیں۔ یعنی ایشور کو نہیں مانتے۔ بھلا یہ کب مُمکن ہے کہ بِلا ایشور میں وِشواس کئے ہُوئے کوئی مُلک ترقی کر سکے۔ ہاں بیشک وہ ایسے ایشور کو نہیں مانتے جو آدمیوں سے الگ دُنیا سے پرے کہیں بادلوں کے اوپر بیٹھا ہُوا ہے۔ کہیں اُس کو وہاں زُکام نہ ہو جائے۔ اور جس مُلک میں Scepticism (وہم و شک) پھیل جاتا ہے یعنی جہاں شک گھر کر لیتا ہے اُس مُلک کی حالت تباہ ہو جاتی ہے۔ اس مرض کا جلدی علاج کرو۔ ورنہ یہ مرض مُہلک تپِ دق کا ہو جائے گا۔ Heroism یعنی بہادری یقین والوں کے لئے ہے۔

س مرنا بھلا ہے اُس کا جو اپنے لئے جئے
جِینا ہے وہ جو مرچکا انسان کے لئے

کہاں عرب کا ریگستان۔ وہاں ایک اُمّی جنگلوں کے رہنے والے یتیم کے دِل میں اِسلام (شردھا۔ Faith۔ یا وِشواس) کی آگ بھڑک اُٹھی۔ یعنی سوائے اللہ کے اور کُچھ بھی نہیں ہے "لا الہ الا اللہ" (ایک میوا دو نیم) اس بات کا یقین

اُس کے دِل میں جم گیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس کے جگر میں آگ بھڑکی اور اِس ریگستان میں پڑی۔ جہاں ریگ کا ایک ایک ذرّہ آتش فشاں بارُود کا چھرّا بن گیا۔ اور ساری دُنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔

گرینا ڈا (Granada) سے لیکر دہلی تک اور یورپ افریقہ اور ایشیا کے اس سرے سے اُس سرے تک ایک آفت مچا دی۔ یہ کیا تھا۔ یقین اور ایمان کا زور۔ وِشواس کی طاقت۔ نہ کہ تلوار اور بندوق کی طاقت۔ جیسا کہ لوگ اکثر کہا کرتے ہیں کہ بندوق اور تلوار کے زور سے اہل اسلام نے فتح پائی۔

جس وقت محمد غوری اور محمود غزنوی ہندوستان میں آئے تو وہ لوگ بہت کم تھے۔ اور ہم لوگ دَل کے دَل۔ جس طرح آندھی کے سامنے خاک اُڑتی چلی جاتی ہے۔ اُسی طرح ہندوں کے دَل کے دَل مسلمانوں کے سامنے اُڑتے چلے جاتے تھے۔ کیا وجہ تھی کہ ہماری شکست ہُوئی اور اُن کی فتح۔ اس کا باعث وُہی یقین یا وِشواس تھا۔ جب تک دِل میں یقین نہو ہاتھ میں طاقت بھی نہیں آتی۔ جب دِل وِشواس سے بھرتا ہے تو ہاتھ اور بازُو طاقت سے پھڑکنے لگتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ۔ جب رام بی۔اے کا امتحان دے رہا تھا۔ تو مُمتحن نے ریاضی کے پرچہ میں ۱۳ سوال دے کر اُوپر یہ لکھ دیا۔ کہ

Solve any nine out of these thirteen

ان تیرہ سوالوں میں سے کوئی سے ۹ سوال حل کرو۔ چونکہ رام کے دِل میں یقین جوش مار رہا تھا۔ اُس نے اُسی عرصہ میں سب تیرہ کے تیرہ سوال حل کر کے لکھدیا کہ Examine any nine out of thirteen یعنی ان تیرہ سوالوں میں سے ۹ جانچ لو۔ حالانکہ ان ۱۳ سوالوں میں سے اور لڑکوں نے ۳ یا ۴ سوال حل کئے تھے۔

James (جیمس) بھی ایسا کہتا ہے۔ کہ فتح یا جے اُسی کی ہے جس کو یقین یا وِشواس ہے۔ اور یہی رُوحانی قانُون ہے۔ وِشواس کے بارہ میں بیان کرتے ہُوئے یہ دیکھنا چاہئے کہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو وِشواس اور دوسرا مت۔ جس کا ترجمہ (۱) یقین (Faith) اور (۲) عقیدہ (Creed) ہے

Crusade یعنی عیسائیوں کے اُس جہاد کا ذکر رام سُناتا ہے جس میں رچرڈ اول (Richard, I) شاہ انگلستان بھی شریک تھا۔ جب عیسائی لوگ یرُوشلم میں ہارنے لگے۔ تو ایک بُوڑھا آدمی اُن میں سے یوں بول اُٹھا۔ کہ مَیں نے جبرئیل کو دیکھا۔ جس نے مجھ سے یہ کہا۔ کہ اسی زمین کے تلے جہاں ہم لوگ لڑ رہے ہیں وہ نیزہ دبا ہُوا ہے۔ جس سے حضرت مسیح چھوئے گئے تھے۔ اگر وہ نیزہ مل جاوے تو ہماری فتح ضرور ہوگی۔ اس کو سُن کر لوگوں نے اُس زمین کو کھودنا شروع کیا۔ مگر کوئی نیزہ نہ ملا۔ کھودتے کھودتے آخرکار ایک نیزہ نہایت بوسیدہ

زمین میں سے نکلا۔ وہ لوگ اُس نیزہ کو عیسیٰ والا نیزہ جان کر جی توڑ کر لڑنے لگے اور آخر کار وہ فتحیاب ہُوئے۔ مرتے وقت اُس بُوڑھے شخص نے پادری کے سامنے اس امر کا اقرار (confession) کیا کہ مَیں نے یروشلم کی لڑائی میں نیزہ والی کہانی گھڑلی تھی۔ تاکہ فتح ہو۔ چاہے کچھ ہو۔ مگر وہ بات اُس وقت کام کرگئی۔ اس کہانی کا وہ حصہ جس سے لوگوں کے دِلوں میں یقین بڑھ گیا۔ وشواس (Faith) ہے۔ اور کہانی مت (عقیدہ) ہے۔ یا یقین کی طاقت زندگی ہے۔ رام اوپر کے مت (عقیدے) پر زور نہیں دیتا۔ وہ تو اندر کی آگ آپ ہی میں سے نکالا چاہتا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یورپ کے بڑے بڑے آدمی ناسِتک ہیں۔ بریڈلا (Bradlaugh) اور ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) گو عیسائیوں اور مسلمانوں یا اور مذہب والوں کے خُدا کو نہ مانتے تھے مگر اُن میں یقین اور وِشواس ضرور تھا۔ اور اُن لوگوں کے چال چلن آپ لوگوں کے پنڈتوں۔ مذہبی اُپدیشکوں اور واعظوں سے بدرجہا بہتر تھے۔

بریڈلا (Bradlaugh) گو رام کو نہیں جانتا تھا مگر اُس کا دِل پریم سے بھرا تھا۔ آپ کے مذہبی لوگ اپنی اُلفت کو کسی خاص فرقہ یا مُلک میں ہی محدود کر دیتے ہیں۔ مگر اُس کا دل انگلستان ہی میں محدود نہ تھا بلکہ ہندوستان کی بہتری کے لئے بھی خون برسا رہا تھا۔ وہ نیچر (قُدرت) کے لافانی قانُون

پر ایمان رکھتا تھا، ہی وشواس یا ایمان کی ہندوستان کو بھی ضرورت ہے۔ یہ گالی ہے کہ تم بے ایمان ہو۔ یعنی تمہارا ایمان نہیں ہے۔ اور ایمان نادیدنی چیز پر یقین لانے کا نام ہے۔ اور یہ ہی مذہب۔ وشواس یا اسلام ہے اور بغیر اس کے کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ آر کی میڈیز (Archimedes) یہ کہا کرتا تھا۔ کہ "Give me a point to stand, and I'll move the earth" اگر مجھ کو ایک جگہ (نقطہ) کھڑے ہونے کو مل جاوے تو میں دُنیا کو اُلٹ دوں گا۔

رام بتلاتا ہے کہ وہ قایم نُقطہ تمہارے ہی پاس ہے۔ اگر تُم اُس آتم دیو کو جو دُور سے دُور اور نزدیک سے نزدیک ہے جان لو۔ تو وہ کون سی چیز ہے جس کو تُم نہیں کر سکتے

؎ وہ کون سا عُقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

اس یقین کو دِل میں جگہ دو۔ اور پھر جو چاہو۔ سو کرو۔ کیونکہ لا انتہا طاقت کا سرچشمہ تمہارے اندر موجود ہے۔

ہکسلے (Huxley) کہتا ہے کہ اگر تمہاری یہ دلیل رانی اور عقل و دانش واقعات کے جاننے میں مدد نہیں کرتے تو

ع بریں عقل و دانش بباید گریست

(ایسی عقل و سمجھ پہ رونا چاہیئے)

ایسے منطق کو بدل دو۔ عقل کو پھینک دو۔ مگر واقعات کو آپ بدل نہیں سکتے۔

آتما یعنی اندر والی شکتی پر وِشواس رکھو۔ ٹیٹری (ایک پرند) کے دِل میں وِشواس آگیا۔ اُس نے کمر ہمت باندھی۔ سمندر سے مقابلہ کیا۔ اور فتح پائی۔ ایک کہانی ہے۔ کہ ٹیٹری کے انڈے بچے سمندر بہالے گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ آج میرے بچّے بہالے گیا۔ توکل میرے اور ہمجنسوں کے بچّوں کو بہالے جائے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ سمندر کا خاتمہ کردیا جائے۔ اور ایسا خیال کر کے سمندر کا پانی اُن پرندوں نے اپنی چونچوں سے بھر بھر کے باہر پھینکنا شروع کیا۔ اور مصیبت کے وقت میں اپنا حوصلہ پست نہ کیا۔

؎ شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

اتنے میں ایک رِشی جی وہاں آئے۔ اور چونچوں سے سمندر کا پانی خالی کرتے دیکھکر کہا کہ یہ بیہودہ حرکت کر رہے ہو۔ کیا تُم سمندر کا پانی خالی کرسکتے ہو؟ کیا اکیلا چنا بھاڑ کو پھوڑ سکتا ہے؟ اِس بیہودہ حرکت سے باز آؤ۔ اُس پر اُسی ٹیٹری نے جواب دیا۔ کہ "مہاراج! آپ دیو رِشی ہوکر مجھ کو ایسے ناستک پنے کا اُپدیش کرتے ہو۔ آپ ہمارے شریروں کو دیکھ رہے ہو۔ ہمارے آتم بل کو نہیں دیکھتے" (یہی جواب کاگ بھسنڈ کو مہاراج دتاترے جی نے دیا تھا۔ اور کہا "یار تُم تو کوّے ہی رہے۔ کیونکہ تُمہاری دِرشٹی ہمیشہ ہاڈ چام پر جاتی ہے)۔ جسم تو مَیں نہیں ہُوں۔ مَیں تو وہ ہُوں جس کی تھاہ وید بھی نہیں پاسکتے۔ آتم دیو تو وہ ہے۔ جو کبھی بھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اِس جواب کو سُن کر رِشی جی مہاراج ہوش میں آئے۔ اور سمندر سے کرودھ

کرکے بولے "ارے اِس کے انڈے بچّے کیوں بہا لے گیا" اس پر سمندر نے جھٹ انڈوں بچّوں کو پھینک دیا اور کہاں تو مخول بازی (دل لگی) کرتا تھا۔

اس کہانی میں امر اور اجر آتم دیو میں یقین کا ہونا تو وِشواس۔ مذہب یا اسلام ہے۔ باقی سب کہانی۔ مت یا عقیدہ ہے۔ مگر رام تو وِشواس ہی سکھاتا ہے۔ اور بات سے اُس کو سروکار نہیں۔

اکیلے فرہاد نے نہر کو کاٹ کر بادشاہ کے محلوں میں پہنچا دیا۔ یہ سب واقعات ہیں۔ آپ اُن تصویروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو فرہاد نے پہاڑوں پر نہر کاٹتے وقت بنائی تھیں۔ سوائے اہلِ یقین کے دوسرے کا یہ کام نہیں۔ جس کو اِس امر کا یقین ہے۔ کہ میرے اندر آتما موجود ہے۔ تو پھر وہ کون سا عقدہ ہے۔ جو حل نہیں ہو سکتا۔ پھر کوئی طاقت ایسی نہیں۔ جو میرے خلاف ہو سکے۔ سورج ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ اور چاند سرِ تسلیم خم کر رہا ہے۔ ذرا دیکھئے! اکیلے تو رام چندر اور اُن کے ساتھ ایک بھائی۔ اور سیتا جی کو سمندر چیر کر واپس لانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ آسان کام ہے؟ کشتی نہیں۔ جہاز نہیں۔ مگر واہ رے صاحبِ ہمّت! کہ جن کی خدمت کرنے کو وحشی جانور بھی تیار ہیں۔ بندر سے چنچل جانور بھی آپ کی سیوا میں حاضر ہیں۔ چنانچہ بندر بھی آپ کی خدمت کے لئے جاں بحق ہوا جاتا ہے۔ گلہریاں بھی چونچ میں ریت بھر بھر کر سمندر پر پُل باندھنے کی کوشش کرتی اور مریادا پرشوتم بھگوان کی سیوا کرتی ہیں۔ اگر ہر ایک کے دل میں وُہی شردّھا پیدا ہو جاوے۔ جو رام میں تھی۔ تو

ع قمریاں عاشق ہیں تیری سروٗ بندہ ہے ترا

والی حالت سب کی ہو جاوے۔ اگر اِس بات کا یقین نہیں آتا کہ "مَیں وہ ہی ہُوں" تو اس بات کا یقین تو ہونا چاہئے۔ کہ میرے اندر وُہ ہی ہے۔ جب میرے اندر وہ ہی ہے تو مَیں سب کا خاوند ہُوں اور جو چاہُوں سو کر سکتا ہُوں۔ یہ خیال بڑا زبردست ہے۔ اور یہ ہی خیال دِل میں ہر وقت رکھنا چاہئے تاکہ اندر کی طاقت ظاہر ہونے لگے۔ امریکہ اور انگلینڈ کے اکثر ہسپتالوں میں سرکاری طور سے ایسے علاج جاری ہو گئے ہیں۔ جن میں صرف طاقتِ خیال سے مریض چنگا کر دیا جاتا ہے۔ اور بہتوں نے اِس بات کی قسم کھائی ہے۔ کہ ہم تمام عمر دوائی نہ کھائیں گے۔ اور اگر کوئی بیماری ہو جائے گی۔ تو محض طاقتِ خیال سے اُس کو بھگا دیں گے۔ یہ طاقتِ یقین ہے۔ یہ ہی بِشواس ہے۔

آج کل کے عِلم الخیال نے اِس بات کو ثابت کر دیا ہے۔ کہ میز کی جگہ آپ کو گھوڑی دکھلائی دے۔ کیا آپ نے اس روایت کو نہیں سُنا؟ کہ جیمز صاحب کا ڈاکٹر پال بن گیا۔ حقیقت وُہ ہی ہے۔ جو یقین کی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ اگر دیکھنا ہے۔ تو اُس آتما کو دیکھو۔

ایک پینسل کی فیکٹری کو دیکھو کہ جس سے ہزاروں آدمی پل رہے ہیں اور قوم کی دولت بڑھ رہی ہے۔ ریل والوں کو فائدہ۔ ڈاک والوں کو فائدہ۔ اس کارخانہ کی حقیقت کہاں ہے۔ اس ایک چھوٹے سے کیمیکل ری ایکشن (chemical reaction) یعنی کیمیائی تبدیلی یا اندرونی تبدیلی پر ہے جو نظر نہیں آتی۔ inner equation (اندرونی اعتدال) ہی Spiritual revelation (رُوحانی

انکشاف) ہے۔

جاپان اور امریکہ کی ترقی کا راز اُن کی باہر کی دولت اور ثروت کے دیکھنے سے نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ اُن مُلکوں کے عُروج کا باعث اُن کے اندر کی تبدیلی ہے۔ وہ کیا ہے؟ یقین یا وِشواش ہے۔ سب قوموں اور مُلکوں کی ترقی کا اصل باعث اُن کی رُوح میں ہے۔ جسم تو محض خول کی طرح ہے۔

۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کو کیا ۳۳ لاکھ کروڑ دیوتاؤں کو پڑے مانا کرو۔ مگر جب تک آپ میں اندرُونی طاقت جوش نہ مارے گی۔ آپ کا کُچھ بھلا نہ ہوگا۔ جس وقت آپ کے اندر کا آتم بل جاگے گا تو سارے دیوتا اپنی خدمت کے لئے دست بستہ کھڑے پائیے گا۔ اب تُم اُن کو مانتے ہو۔ تب وہ تُم کو مانیں گے۔

ے اگرچہ قُطب جگہ سے ٹلے تو ٹل جائے
اگرچہ بحر بھی جُگنو کی دُم سے جل جائے
ہمالہ باد کی ٹھوکر سے گو پھسل جائے
اور آفتاب بھی قبلِ عرُوج ڈھل جائے
کبھی نہ صاحبِ ہمت کا حوصلہ ٹُوٹے
کبھی نہ بھُولے سے اپنی جبیں پہ بل آئے

اِسی کا نام وِشواس۔ یقین اور پرمیشور میں بھروسہ رکھنا ہے۔ جس دِل میں یہ یقین ہے۔ وہ باہر کی چیزوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ گھر ہی کیا جس گھر میں چراغ نہ ہو۔ وہ شُتر ہی کیا جو بے مہار ہو۔ وہ کشتی ہی کیا جس کا rudder یعنی پتوار نہ ہو۔ اور وہ

دِل ہی کیا جس میں یقین نہ ہو۔ کوئی متنفس ہی کیا۔ جس کو خُدا سچائی (Truth) یا حقیقت میں وِشواس نہ ہو۔ جب مصیبت آتی ہے تو قُربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندو۔ مسلمان۔ یہودی۔ عیسائی۔ سب میں یہ دستُور قُربانی کا جاری ہے۔ ایک بیچارے جانور (بکرے) کو کاٹ ڈالا۔ یا آگ میں ڈال دیا۔ اور کہدیا۔ یہ قُربانی ہے۔ کیا قُربانی اسی کا نام ہے۔ نہیں! نہیں! حقیقی قُربانی تو یہ ہے

؎ کر نت کرے تُمھاری سیوا۔ رسنا تُمرو گُن گاوے

(ہاتھ ہمیشہ تُمھاری خدمت کرے اور زُبان تمھارا گُن گاین کرے)

بن لاڑے کے برات بھلا کس کام کی

پیارے! قُربانی تو یہ ہے کہ پرمیشور کے سچ مُچ ہوجاویں۔ اور اُسی سچّائی کے سامنے اس دُنیا کی لذّات اور نفسانی خواہشات کی کُچھ حقیقت نہ رہے

Take my life and let it be
Consecrated Lord! to Thee,
Take my heart and let it be
Full saturated, Love! with Thee,

Take my eyes and let them be
Intoxicated, God! with Thee
Take my hands and let them be
For ever sweating, Truth! for Thee.

(مطلب) پران مہاپربھو سویکرت کیجئے
نج پد ارپت ہونے دیجئے

انتہ کرن ناتھ! لے لیجئے
رنج سے اُسے پریم بھر دیجئے
سوکرت کیجے نیتر ہمارے
رنج سے متوالے کر پیارے
لیجے ست پربھوُ! ہاتھ ہمارے
سدا کرے شرم ہیتو تُمہارے

تُم کام کئے جاؤ کیول پرمیشور کی خاطر۔ خودی اور خود غرضی ذرا نہ رہنے پاوے۔ اگر تُم انانیت کو بھی پرمیشور کی خاطر قربان کردو یعنی خودی کو مِٹادو۔ پھر تو تُم آپ ہی آپ ہو۔

ع آپ ہی آپ ہُوں یاں غیر کا کچھ کام نہیں
ذاتِ مُطلق میں مری شکل نہیں نام نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ ایسی حالت میں ہم سے کام نہیں ہوسکیں گے۔ علم آب میں ایک لمپ کا ذکر آیا ہے جس کی صورت ایسی ہوتی ہے جس میں سفید حصّہ جو نیچے دیکھتے ہو۔ وہ تیل سے بھرا ہوتا ہے۔ اور سیاہ حِصّہ ٹھوس ہوتا ہے۔ جیُوں جیُوں جلنے سے تیل خرچ ہوتا جاتا ہے وہ ٹھوس حِصّہ نیچے کو گرتا جاتا ہے۔ یعنی تیل کی Specific Gravity (خاص وزن یا گمبھیرتا) ٹھوس کے برابر ہوتی ہے۔

اب اس مثال میں تیل کو بیرونی کام کاج سمجھو۔ اور دوسرے نِصف گرّہ کو یقین۔ وشواس۔ اسلام یا شردّھا کہو۔

لوگ کہتے ہیں ہم کو فرصت نہیں۔ مگر بقول جانسن کے

Time also is sufficient if well employed

یعنی وقت کافی ہے اگر اچھی طرح سے کام میں لایا جائے۔ یہ کیا تمہارے ہاتھ اور پیر کام کرتے ہیں؟ نہیں! نہیں! بلکہ تمہارے اندر کا آتم بَل۔ یقین اور وِشواس ہے۔ جو تمہارے ہر ایک رگ و ریشہ میں حرکت اور حرارت پیدا کر دیتا ہے۔

ارے یارو! آتم دیو کو جو اکال مُورت ہے۔ اُس کو کال یعنی وقت سے باندھا چاہتے ہو۔ اسی کا نام ناستکتا۔ کُفر یا (Atheism) ہے۔ ہکسلے (Huxley) ناستک نہیں ہے۔ جیسا تُم سمجھے ہُوئے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ مَیں ایسے خُدا کو مانتا ہُوں جس کو سپائینوزا (Spinoza) نے مانا ہے۔ اور بغیر حقیقی اور اندر والے پرمیشور پر یقین لائے ہم ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتے

ع چوں کُفر از کعبہ برخیزد کُجا ماند مُسلمانی

(جب کعبہ سے کُفر اُٹھ پڑے تو مُسلمانی کہاں رہ سکتی ہے)

پرمیشور تو آپ کے اندر ہے۔ جو ہمہ جا۔ حاضر و ناظر ہے۔ اگر پرہلاد کے دِل میں یہ یقین ہوتا کہ خُدا کہیں آسمان پر بیٹھا ہُوا ہے تو اُس کی زبان سے کبھی یہ الفاظ نہ نکلتے۔

موہیں رام۔ تو ہیں رام\
کھڑگ کھمبہ میں ویاپک رام\
جہاں دیکھوں تہاں رام ہی رام

رام تو کہتا ہے کہ دست درکار اور دِل دربار ہو۔ ہاتھوں سے ہو کام اور دِل میں ہو رام۔ ایسے ہی شخص جب کرشن بھگوان

کے مندر میں جاتے ہیں تو اپنی آنکھوں سے دُرِ آب دار اُس منوہر مُورتی پر نچھاور کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اور اگر مسجد میں جاکھڑے ہوتے ہیں تو دُنیا سے ہاتھ دھوکر (وضُو کرکے) نماز مستانہ پڑھنے لگتے ہیں۔ اور اگر اُن کا گُذر گرجے میں ہوتا ہے تو رُوح القُدس کے سامنے جسمانیت کو صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔

اوم! اوم! اوم!

آنند

अन्यच्छ्रेयोऽन्यदुतैव प्रेय: । (कठ० २, १)

شُرتی (وید) کا کلام ہے "شریے اَور ہے اور پریے اور ہے فرض کچھ کہتا ہے۔ لیکن غرض اَور طرف کھینچتی ہے۔ شریے فرض یا ڈیوٹی تو کہتے ہیں۔ وید و۔ تیاگ!" لیکن پریے (غرض) ترغیب دیتے ہیں "لو۔ لیلو! یہ ہمارا حق ہے۔ ادھکار ہے۔ رائٹ ہے!" دُنیا میں اپنے اپنے رائٹ (حق) ادھکار پر زور دینا تو عام ہے اور آسان ہے۔ لیکن اپنے دھرم یا فرض کے ادا کرنے میں زور دینا مُشکل اور بے مزہ معلوم دیتا ہے۔ حقیقت پر غور کریں۔ تو فرض اور غرض میں وُہی رشتہ ہے جو درخت کے بیج کو اُس کے پھل کے ساتھ ہوتا ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ پھل تو سب لوگ کھانا چاہتے ہیں۔ لیکن بیج کو بونے اور اُس کو پرورش کرنے کی محنت سے گُریز کرتے ہیں۔ بات یوں ہے کہ جب ہم لوگ اپنی ڈیوٹی بجالانے پر زور دیتے چلے جائیں تو ہمارے رائٹ ہمارے حق ہمارے پاس خود بخود آویں گے۔ جب ہم لوگ صرف اپنے حق پر زور دیں گے۔ اپنے رائٹ بھڑکائیں گے تو

ہم بے بہرہ مُنہ تکتے ہی رہ جاویں گے۔حق بھی باطل ہوجاویں گے۔ قُدرت کا قانون ایسا ہے۔

ڈیوٹی چار طرح کی ہے۔ اوّل ڈیوٹی پرمیشور کی طرف۔ دُوسری ڈیوٹی نوعِ انسان کی جانب۔ تیسری ڈیوٹی مُلک کی سیوا میں۔چوتھی ڈیوٹی اپنی طرف۔ یہ سب ڈیوٹیاں انجام کار ایک ہی ڈیوٹی میں سما جائیگی۔ وہ کیا ہے! جو آپ کی ڈیوٹی اپنے آپ کی طرف ہے۔ جو لوگ اپنا رِن (قرض) اپنے آپ کو پُوری طرح سے ادا کرتے ہیں۔ اُن کے باقی تینوں رِن (قرض) خود بخود ادا ہو جاتے ہیں، کہا جاتا ہے۔ کہ کرپا (نوازش) تین طرح کی ہے۔ ایشور کرپا۔ گرُو کرپا۔ اور آتم کرپا یعنی فضلِ الٰہی توجہ مُرشد۔ اور ہمّتِ ذاتی۔ ایشور کرپا اُس پر ہوتی ہے۔جس پہ گرُو کرپا ہوتی ہے اور گرُو کرپا اُس پہ ہوتی ہے۔ جس پر آتم کرپا ہوتی ہے۔ دیکھیئے ایک لڑکا اسکول میں پڑھتا ہے۔ اگر اپنی ذاتی ڈیوٹی کو اچھی طرح سے پُورا نہ کرے۔ اگر آتم کرپا نہ کرے۔ تو گرُو کرپا اُس پر نہ ہوگی۔ اور جب سبق اچھّی طرح سے یاد کرے۔ تو گرُو کرپا اُس پر خواہ مخواہ ہوگی۔ اور گرُو کرپا ہونے سے ایشور کرپا ہو ہی جاتی ہے۔

مُلک کی سیوا وہ آدمی نہیں کرسکتا۔جس نے پہلے اپنی سیوا نہیں کی۔ جو اپنا بھی حق ادا نہیں کرسکا۔ وہ مُلک کی خدمت کیا خاک کرے گا۔جس کسی نے کوئی عِلم حاصل نہیں کیا۔ کوئی ہُنر نہیں سیکھا۔ کسی بات میں کمال نہیں کیا۔کسی صنعت یا حرفت میں دسترس پیدا نہیں کی۔ اور دم بھرنے لگے مُربئ مُلک ہونے کا۔ تو بھلا بولو اُس سے کیا بن پڑے گا؟ البتہ یہ ضرور ہے۔کہ جس کے دِل میں صداقت

بھر جائے وہ بے کمال بھی کچھ نہ کچھ مُلک کی سیوا کر سکتا ہے۔ مُلک کی خدمت کوئلہ بھی جل کر اور لکڑی بھی کٹ کر ناؤ بن کر کر سکتے ہیں۔ جب لکڑی یا کوئلہ بھی کٹ یا جل کر مُلک کی خدمت کر سکتے ہیں تو وہ شخص بھی جس نے کوئی علم یا ہُنر نہیں پڑھا مُلک کی خدمت صداقت کے زور کچھ نہ کچھ کیوں نہیں کر سکتا؟ مگر اُس کی خدمت کو صرف کوئلہ اور لکڑی کی خدمت سے نسبت دیجا سکتی ہے۔ نیز صداقت والا انسان بے کمال کیسے کہلا سکتا ہے؟ صداقت سچائی تو بذاتِ خود کمال ہے۔

وُہ شخص جس نے اپنی ڈیوٹی اپنی طرف کسی قدر ادا کر دی اور اپنے تئیں رُوحانی یا عقلی بچپن کی حالت سے آگے بڑھا دیا۔ مثلاً کچھ نہیں تو ایم اے یا شاستری وغیرہ درجوں کی سی لیاقت حاصل کر لی۔ یہ شخص جس حد تک روحانی یا عقلی زور پیدا کر چکا ہے۔ اُسی اندازہ سے قوم کی گاڑی کو ترقّی کی سڑک پر آگے کھینچ سکتا ہے۔ ایسا شخص مُلک کی ریفارمری (مصلح پن) کا دم اگر نہ بھی بھرے۔ اور ظاہر بیں پُوری خدمت بھی مُلک کی نہ کرے۔ تاہم اُس کو دیکھ کر اور یاد کر کے بہت سے آدمی جوش میں آجاویں گے۔ کہ ہم بھی ایم۔ اے پاس کریں۔ ہم بھی لیاقت پیدا کریں۔ یہ شخص اپنے اعمال سے لوگوں کو اُپدیش کر رہا ہے۔ اور مُلک کے زور کو بڑھا رہا ہے

ع دامن آلودہ اگر خود ہمہ حکمت گوید
از سخن گفتن زیبائش بداں بہ نشنوند
وآنکہ پاکیزہ دِل است ارنبشیند خاموش
ہمہ از سیرتِ صافیش نصیحت شنوند

(ناپاک شخص اگر پوری عقلمندی کی باتیں بھی کرے تو اُس کی
باتوں سے بُرے آدمی سُدھریں گے نہیں۔ اور جو پاک دِل ہے
اگر چُپ چاپ بھی بیٹھا رہے تو سب لوگ اُس کی نیک خصلت
سے نصیحت حاصل کریں گے)

سر آئیزک نیوٹن جس کو خیال بھی نہ تھا۔ کہ دُنیا کی خدمت کریگا
اس طرح سے علم کے پیچھے دَوڑ رہا تھا۔ کہ جس طرح شمع کے اُوپر پتنگ
دوڑتے ہیں۔ سر آئیزک نیوٹن (Sir Isaac Newton)
اپنی طرف جو ڈیوٹی ہے اُس کو اَدا کرتا ہُوا۔ آتم کرپا کرتا ہُوا محسن دُنیا
ثابت ہُوا۔ اگر ایک شخص میدان میں کھڑا ہوکر نگاہ پھیلاوے۔ تو
تھوڑی دُور تک دیکھ سکتا ہے۔ اور چند آدمیوں کو اپنی آواز پہنچا سکتا
ہے۔ لیکن جب وہ اونچے مینار یا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ تو
اپنی آواز چاروں طرف بہت دُور تک پہنچا سکتا ہے۔ رَام کے
ساتھ ایک مرتبہ تھوڑے سے آدمی گنگوتری کے پہاڑ پر جا رہے تھے۔
راستہ بھُول گئے۔ جھاڑیوں اور کانٹوں سے بدن چھل گئے۔ ساتھیوں
میں سے اگر کوئی پُکارتا۔ تو اُس کی آواز دُوسروں تک نہیں پہنچ سکتی
تھی۔ مُشکل کے ساتھ آخر چوٹی پر پہنچ کر جب رَام نے آواز دی۔ تب
سب آ گئے۔ اسی طرح سے جب تک ہم خود نیچے گِرے ہُوئے ہیں
پڑے آوازیں دیں۔ سُنائی نہیں دیں گی۔ اور جب چوٹی پر چڑھ کر آواز
دیں۔ تو سب کے سب سُنیں گے۔ اس چوکی کو جو رَام کے سامنے ہے
اگر ہلانا چاہیں اور پرلی طرف یا بیچ میں ہاتھ ڈالیں۔ اور زور ماریں۔
تو نہیں ہلے گی۔ لیکن نزدیک سے نزدیک مقام سے ہاتھ ڈال کر

ہم ساری چوکی کو کھینچ سکتے ہیں۔ دُنیا کے ساتھ انسان کا تعلّق بھی ایسا ہی ہے

؎ بنی آدم اعضائے یکدیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

(آدم کی اولاد باہم ایک دوسرے کے عضو ہیں کیونکہ ایک ہی جوہر سے اُن کی پیدایش ہے)

تمام دُنیا کو اگر تُم ہلانا چاہتے ہو۔ تو دُنیا کا وہ حصّہ جو نزدیک ترین ہے یعنی اپنا آپ اُس کو ہلاؤ۔ اگر اپنے آپ کو ہلادوگے۔ تو تمام دُنیا ہل جائے گی۔ نہ ہلے تو ہم ذمہ دار۔ جس قدر اپنے آپ کو ہلا سکتے ہو۔ اُسی قدر دُنیا کو ہلا سکتے ہو۔ بعض لوگ تو اصلاح (ریفارم) کے کام میں ہزار جتن کرتے ہیں۔ رات دِن لگے رہتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اُن کے جیتے جی یا مرجانے کے بعد اُن کی یادگار میں اُن کے نام پر لوگ خود بخود کالج بڑے بناتے ہیں۔ سوسائٹیاں بڑے قائم کرتے ہیں۔ اور سینکڑوں اصلاحیں بڑے کرتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ بس یہی کہ یہ ما بعدالذکر مہاتما اپنے مصلح (ریفارمر) خود بنے۔ یونان میں ایک بڑا ریاضی داں گذرا ہے۔ آرکمیڈیز (Archimedes)۔ اُس کا قول ہے کہ مَیں تھوڑی سی طاقت سے تمام دُنیا کو ہلا سکتا ہُوں۔ بشرطیکہ مجھے ایک قائم نصاب (مستقل مقام) لیور (بیرم) کے سہارے کو ملجائے۔ مگر غریب کو کوئی قائم نصاب نہ مِل سکا۔ پیارے! وہ قائم نقطہ جس پر کھڑے ہوکر دُنیا کو ہلا سکتے ہیں۔ وہ قائم نقطہ آپ کا اپنا ہی

آتا ہے۔ وہاں جم کر اپنے سروپ میں استھت ہوکر جو جُنبش اور حرکت سرزد ہوگی۔ وہ تمام دُنیا کو ہلا سکتی ہے۔

جب ایک جگہ کی ہوا سُورج کی گرمی جذب کرتی کرتی لطیف ہوکر اُوپر اُڑ جاتی ہے۔ تو اُس کی جگہ کو بھرنے کو خود بخود چاروں طرف سے ہوا چل پڑتی ہے (اور بعض دفعہ آندھی بھی آجاتی ہے) اسی طرح جو شخص خود ہمت (حرارتِ الٰہی) کو جذب کرتا کرتا اوپر بڑھ گیا وہ خواہ مخواہ مُلک میں چاروں طرف کے فرقوں کو کئی قدم آگے بڑھانے کا باعث ہو جاتا ہے۔ طلسمات کا ریفارمر ہے۔

اب یہ دکھلایا جائے گا۔ کہ کیونکر اپنی ڈیوٹی اپنے آپ کی طرف نباہتے ہُوئے ہماری ڈیوٹی خُدا کی طرف بھی پُوری ہو جاتی ہے مسلمانوں کے ہاں ایک روایت ہے۔ ایک شخص طالبِ حق تھا۔ تلاشِ پرشور میں پریم کا مارا چاروں طرف دَوڑتا تھا۔ کاش! کوئی ایسا عارف کامل جائے۔ کہ جس کی زیارت سے جگر کی آگ بجھے۔ دل کو ٹھنڈک پڑے۔ یونہی تلاش کرتا ہُوا ناامید ہوکر جنگل میں جا پڑا۔ کہ اب نہ کچھ کھائیں گے۔ نہ پئیں گے۔ جان دے دیں گے

بیٹھے ہیں تیرے در پہ تو کچھ کرکے اُٹھیں گے
یا وصل ہی ہوجائے گا یا مرکے اُٹھیں گے

اُس زمانہ کے عارفِ کامل حضرت جُنید تھے۔ اور اُس دن حضرت جُنید دجلہ میں گھوڑے کو پانی پلانے جا رہے تھے۔ گھوڑا رُکتا تھا۔ اور دجلہ کی طرف نہیں جاتا تھا۔ اور گھوڑے کو اڑتا ہُوا اور سرکش سا دیکھکر جُنید نے جانا کہ اس میں بھی کوئی حکمت ہوگی۔ آخر گھوڑے

کے ساتھ جنید چھوڑدی اور کہا "چل جہاں چلتا ہے۔ چاروں طرف میرے ہی خدا کا ملک تو ہے۔ سب میری ہی ولایت ہے۔" گھوڑا دَوڑتا ہوا اس جنگل میں۔ خاص اُسی مقام پر آپہنچا۔ جہاں وہ بچارا طالب صادق پریم کا متوالا۔ عشق کا جلا ہوا۔ پرمیشور کا بھوکا پیاسا پڑا تھا۔ جنید گھوڑے سے اُتر کر اُس شخص کے پاس آکر حال پوچھنے لگے۔ اور تھوڑی ہی صحبت سے وہ طالبِ صادق مالا مال ہوگیا۔ جب جنید جانے لگے تو اُس شخص سے کہا کہ اگر پھر کبھی قبض وارد ہوجائے۔ اور تجھے مُرشد کامل کی ضرورت ہو تو بغداد میں آجانا میرا نام جنید ہے۔ کہیں سے پُوچھ لینا۔ اس مست نے جواب دیا کہ کیا اَب میں حضور کے پاس گیا تھا؟ مجھے اب بھید معلوم ہوگیا۔ اب مَیں آنے جانے کا نہیں نہیں۔ اگر آئندہ ضرورت ہوگی تو اب کی طرح پھر بھی خواہ حضور خواہ اور کوئی گردن سے پکڑا ہُوا گھسیٹا آئیگا

سہ اثر ہے جذبِ اُلفت میں تو کھنچکر آہی جائیں گے
ہمیں پرواہ نہیں مُطلق اگر وہ تن کے بیٹھے ہیں
واہ ری کششِ رُوحانی کیمیائی

بیہودہ چرا درپئے او می گردی
بنشیں اگر او خداست خود می آید

(بیفائدہ اُس (خدا) کے پیچھے کیوں گھومتا ہے۔ بیٹھ جا اگر وہ خدا ہے تو خود ہی آتا ہے)

عشق اول در دلِ معشوق پیدا میشود
تا نسوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود

پہلے عشق معشوق کے دِل میں پیدا ہوتا ہے۔ تا وقتیکہ شمع نہ جلے
پروانہ کب اُس پر عاشق ہوتا ہے)

گردِ خود گرد غنی چند کنی طوفِ حرم
رہبرے نیست دریں راہ بہ از قبلہ نما

(اے غنی! اپنے ہی گرد گھوم۔ کب تک کعبہ کے گرد گھومتا رہے گا
اس راستہ میں قبلہ نما (آتما یا دِل) سے بڑھکر کوئی رہبر نہیں ہے)

"یہ ہماری قسمت میں نہیں تھا" "خدا کی مرضی"! "آج کل مرشد نہیں مِل سکتا" "صحبت نیک نہیں" "دُنیا بڑی خراب ہے" وغیرہ ایسے ایسے کلمے سب ہمارے دِل کی حرامزادگی پر دال ہیں۔

کیسے گِلے رقیب کے؟ کیا طعنِ اقربا؟
تیرا ہی دِل نہ چاہے۔ تو باتیں ہزار ہیں

آپ نے بیسیوں کتھائیں سُنی ہوں گی۔ کہ کس کس طرح سے دھرو پرہلاد نامدیو وغیرہ چھوٹے چھوٹے لڑکوں نے پرمیشور کو بُلایا۔ پرگٹ کرلیا۔ ایک ذرا سا لڑکا نام دیو اپنے نانا کو ٹھاکر پُوجن کرتے ہُوے دیکھا کرتا تھا۔ اُس کے من میں بھی آنے لگا۔ کہ مَیں بھی پُوجا کروں گا۔ چُپکے چُپکے "ٹھاکر جی! ٹھاکر جی"! جپا کرتا تھا۔ اُس کی نگاہ میں شالگرام کی پرتیما (مُورتی) سچّے ٹھاکر جی تھے۔ جب اُس کا داؤ لگتا۔ شالگرام کی مُورتی کے پاس آکر بڑے تپاک سے کہا کرتا! "ٹھاکر جی جھات!" مگر اُسے ٹھاکر جی کو نہلانے اور پُوجا کرنے کی اُس کا نانا اجازت نہیں دیتا تھا۔ ایک دن اُس کے نانا کو کہیں باہر جانا تھا۔ اور بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ بچّے نے نانا سے کہا "اب تُم تو جاتے ہی

ہو۔ تمہارے پیچھے میں ہی ٹھاکر جی کی پوجن کروں گا۔" اُس نے کہا اچھا تُو ہی سہی۔ لیکن تُو تو صبح کو بغیر ہاتھ مُنہ دھوئے روٹی مانگتا ہے۔ تیرے ایسا نادان پُوجن کیا کرے گا؟ اگر پُوجن کیا چاہتا ہے۔ تو پہلے ٹھاکر جی کو کھلانا۔ اور پھر خود کھانا۔" خیر! ناناجی تو چلے گئے۔ رات کو مارے پریم کے لڑکے کو نیند نہ آئی۔ بچہ اُٹھ اُٹھ کر اپنی ماتا سے کہتا تھا۔ صبح کب ہوگی؟ ٹھاکر جی کی پُوجن کب کروں گا؟ صبح ہوتے ہی بچہ گنگا جی پر سنان کے لئے گیا۔ اور سنان کے بعد اُس کی ماں نے ٹھاکر جی کی چوکی کو اُتار کر نیچے رکھدیا۔ اور بچے نے مُورت کو نکال کر گنگا جل کے لوٹے میں جھٹ ڈبُودیا۔ اور پھر چوکی پر بٹھلاکر ماں سے دودھ مانگنے لگا۔ کہ جلدی دُودھ لا۔ جلدی دُودھ لا۔ ٹھاکر جی نہا بیٹھے ہیں۔ اور اُن کو بھوک لگی ہے۔ اُس کی ماں دُودھ کا کٹورا لائی۔ لڑکے نے ٹھاکر جی کے آگے رکھدیا اور کہنے لگا کہ مہاراج! پیجئے۔ دُودھ پیجئے۔ اُس پرتما نے دُودھ نہیں پیا۔ لڑکا آنکھیں بند کرکے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلانے لگا۔ اور مُنہ سے رام رام یا ٹھاکر ٹھاکر کا نام بُڑبڑانے لگا۔ اس خیال سے کہ میری اس بھگتی سے پرسن ہوکر تو ضرور دودھ پی لیں گے۔ لیکن بیچ بیچ میں آنکھیں کھول کھول کر دیکھنا بھی جاتا تھا۔ کہ ٹھاکر جی ابھی دودھ پینے لگے ہیں۔ یا نہیں۔ بہتیرا منتر پڑھا۔ رام رام ٹھاکر ٹھاکر جی کہا۔ مگر دُودھ ٹھاکر جی نہیں پیتے۔ آخر دق ہوکر بچارا بالک ناامید ہو۔ بھوک پیاس رات کی تھکاوٹ اور مایوسی کے مارے رونے لگا۔ ٹھنڈے لمبے سانس آنے لگے۔ دم گھٹے ہو رہے ہیں۔ گلا رُکنے لگا۔ ہچکیوں کا تار

بندھ گیا۔ ہونٹ خشک! ہائے! ارے ٹھاکر! آج تیرا دِل پتھر کا کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں اس ننھے سے بچّے کی خاطر دُودھ نہیں پیتا؟ ایسے بھولے بھالے معصوم سے بھی کوئی ضِد کرتا ہے؟

سیمیں بری تو جاناں لیکن دِل تو سنگ است
در سیم سنگ پنہاں دِیدم ندیدہ بُودم

(اے پیارے جسم تو تیرا چاندی جیسا لیکن دِل پتھر۔ چاندی میں پتھر کو چھپا دیکھا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا)

ہائے! چاندی کے بدن میں دِل پتّھر کا کہاں سے آگیا! بچارا بچہ روتا ہُوا نڈھال ہو رہا ہے۔ آنکھوں سے ندیاں بہ رہی ہیں۔ روتے روتے غش کرگیا۔ لوگوں نے گلاب چھڑکا۔ جب ہوش آیا۔ لوگوں نے سمجھانا چاہا۔ کہ "بس! اب تُم پی لو۔ ٹھاکر جی نہیں پیا کرتے۔ وہ صرف باسنا کے بھُوکے ہیں"۔ بچّہ میں ابھی یہ عقل نہیں آئی تھی۔ کہ پرمیشور کو بھی جھُٹلانے۔ بچّہ ٹھاکر جی کو دھوکا دینا نہیں سیکھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ جھُوٹ مُوٹ بھوگ لگایا جاتا ہے۔ بچّہ تو سچّا تھا۔ صداقت کا پُتلا تھا۔ مچل کر چلّایا۔ کہ اگر ٹھاکر جی دُودھ نہیں پیتے۔ تو کھانے پینے یا جینے کی پرواہ ہم کو بھی نہیں

नायमात्मा बलहीनेन लभ्यः (मुं० उप०) آتما کمزور دِل کو کبھی پراپت نہیں ہوتا۔ ہائے! ننھّے سے نادیو! تجُھ میں کس قدر زور ہے۔ کیسا آتم بل ہے۔ اس ننّھے سے بچّے نے وہ ضِد جو باندھی تو ایک لمبا سا چھُرا نکال لایا (ہندوستان میں اُن دنوں ہتھیار رکھنے کی اجازت تھی) اور اپنے گلے پر رکھ لیا۔ پھر بولا "ٹھاکر جی! پیو! ٹھاکر جی پیو!

نہیں تو بَس نہیں۔" چُھرا چل رہا تھا۔ گلا کٹنے کو تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ٹھاکر جی ایکدم مُورتی مان ہوکر (پرتیکش ہوکر) دُودھ پینے لگے۔ آپ لوگ کہیں گے۔ کہ گپوڑا ہے۔ رام کہتا ہے۔ آپ لوگوں کا بشواس (یقین) کہاں گیا کہ گپوڑا بن گئے۔ رام امریکہ میں رہ کر کالجوں میں۔ ہسپتالوں میں اپنی آنکھ سے ایسے نظارے دیکھ آیا ہے۔ کہ بشواس (یقین) کی تحریک سے اس چوکی کو جو آپ کے سامنے ہے۔ گھوڑا دکھا سکتے ہیں۔ علم سائیکالوجی کے تجربے علانیہ اس قسم کے معاملات کو راست ثابت کر دکھا رہے ہیں۔ تو کیا سچے معصوم۔ پُورے بھگت بچارے نامدیو کے یقین کا بل (زور) ٹھاکر جی کو مُورتی مان نہیں کر سکتا تھا؟ پرمیشور تو سرب بیاپی (سب جگہ حاضر و ناظر) ہے۔ لیکن آتم کرپا (یقین کامل) وہ شے ہے۔ کہ اُس کی بدولت پرمیشور ساتویں نہیں چودھویں آسمان سے۔ بہشت سے۔ ہزاروں سورگ سے بیکنٹھ سے گئولوک سے اس سے بھی پرے سے غرض جہاں بھی ہو وہاں سے کھنچکر آسکتا ہے

ع تھامے ہُوئے کلیجے کو آؤ گے آپ سے
مانو گے جذبِ دل میں بھلا کیوں اثر نہیں

یہ شعر ایسا بھی سُنا جاتا ہے

ع تھامے ہوئے کلیجے کو آؤ گے بے طلب
پھر کیوں کہو گے آہ میں میری اثر نہیں

ع وہ کونسا عُقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

ع کیڑا ذرا سا اور وہ پتّھر میں گھر کرے
انساں وہ کیا جو نہ دلِ دلبر میں گھر کرے

اے حضرت انسان! آپ کے اندر وہ دولتِ عظیم اور طاقتِ لا انتہا ہے۔ کہ اُس کا با قاعدہ اظہار ہی مُلک۔ دُنیا اور خُدا تک کو خوش کرتا ہے۔ اے گُلِ نوبہار! تُو اپنی ذات میں خنداں تو ہو۔ تو اُس بچ کے قرض ادا کرنے میں تیرے باقی سب قرض ادا ہو جائیں گے۔ پرندے انسان اور ہوا تک سب خوش ہو جائیں گے۔

تو خوشی تو خوبی و کانِ خوشی
تو چرا خود منت بادہ کشی

اجب تُو خود آنند سرُوپ۔ شُدّھ سرُوپ اور آنند کی کھان ہے تو پھر شراب کا احسان اپنے پر کیوں لیتا ہے؟

بچ کا قرض ادا کرنے کے لوازمات

ایک لڑکا سکاٹلینڈ کے ایک یتیم خانہ میں پلتا تھا۔ عموماً بچوں کے دستور کے موافق یہ لڑکا کھلاڑی تھا۔ اور شریر بھی تھا۔ ایک دن وہ اُس یتیم خانہ سے بھاگ نکلا اور رستہ کے دیہات میں روٹیاں مانگ مانگ کر گُذارہ کرتے ہوئے لنڈن میں آ پہنچا۔ وہاں کے سب سے زیادہ مالدار لارڈ میر کے باغ میں گھُومنے لگا۔ (لارڈ میر عموماً وہ دولتمند ہوتے ہیں۔ جن سے امیر لوگ راجا لوگ اور بادشاہ لوگ بھی ضرورت کے وقت قرض لیا کرتے ہیں) یہ غریب لڑکا باغ میں ٹہل رہا تھا۔ ایک بلّی کو دوڑتے پایا۔ اُس کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اور واہی تباہی باتیں لگانے لگا۔ اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ اور دُم کھینچتا تھا۔ اور لڑکپن کی ترنگ میں بلّی سے چھیڑ خانی کرتا تھا۔ پڑوس میں گرجے کا گھڑیال بج

رہا تھا۔ لڑکا بلّی سے پُوچھتا تھا" یہ پاگل گھڑیال کیا بکتا ہے؟ کہو" دیا گل اس لئے کہ گھڑیال عموماً کوئی چار بجاکر بند ہو جاتا ہے۔کوئی آٹھ۔حد بارہ بجاکر تو اکثر گھڑیال رُک جاتے ہیں۔لیکن گرجے کا گھڑیال بجتا ہی چلا جاتا ہے۔پاگل کی طرح بند ہونا ہی نظر نہیں آتا۔ بلّی بچاری تو گھڑیال کی آواز کو کیا سمجھتی؟ لڑکا بلّی کی طرف سے خود ہی جواب دیتا تھا۔

"ٹن ٹن ٹن - وہٹنگٹن - وہٹنگٹن - (وہٹنگٹن اس لڑکے کا اپنا نام تھا) گھڑیال کہتا ہے:۔ ٹن ٹن، ٹن
وٹہنگٹن - وہٹنگٹن

لارڈ میر آف لنڈن

ذرا خیال کیجئے گا۔یتیم خانہ سے بھاگ کر آیا ہُوا تو ذرا سا لڑکا۔ اور اپنے خواب کہاں تک دوڑا رہا ہے۔ گھڑیال کی آواز میں بھی اپنے لارڈ میر ہونے کے گیت سُن رہا ہے۔واہ! ٹن ٹن ٹن۔ وٹہنگٹن۔ وٹہنگٹن لارڈ میر آف لنڈن۔

اتنے میں لارڈ میر صاحب بھی اپنے باغ میں ہوا خوری کرتے وہاں آنکلے۔لڑکے سے پُوچھا "ارے تو کون ہے اور کیا بکتا ہے؟" لڑکا مستی اور آنند بھرا جواب دیتا ہے۔"لارڈ میر آف لنڈن! لارڈ میر آف لنڈن"! بچّے پر غصّہ تو کیا آتا۔اُلٹا وہ آزادانہ حالت لڑکے کی لارڈ میر کے دل میں کھُب گئی۔اور آزادی بھلاکس دِل کو پیاری نہیں لگتی؟ لارڈ میر نے پُوچھا "سکول میں داخل ہُوا چاہتے ہو"؟ لڑکے نے جواب دیا "اگر اُستاد مارا نہ کرے"۔ تو وہ لڑکا سکول میں

داخل کرایا گیا۔ سکول میں ترقی کرتے کرتے پھر رفتہ رفتہ کالج کی سب جماعتیں پاس کر کے باعزت گریجویٹ ہو گیا۔ اتنے میں لارڈ میر کے مرنے کا دن آ گیا۔ اُس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ لارڈ میر نہایت زیادہ حصّہ اپنی جائداد کا اُس لڑکے کو دے مرا۔ یہ لڑکا اُس جائداد کو بڑھاتے بڑھاتے ایک دن خود لارڈ میر آف لنڈن ہو ہی گیا۔ آپ لارڈ میروں کی فہرست میں اُس کا نام پائیں گے۔ یہ دُنیا اور اُس کا آپ کے ساتھ سلوک آپ کی ہمّت اور من کے بھاؤ کا جواب ہے۔ وشنگٹن کی بچپن میں ہمت بلند تھی۔ اور دِل کے بھاؤ اُونچے اور سچّے تھے۔ اس کو ویسا ہی پھل کیوں نہ ملتا؟ نیّت پر مُراد ملتی ہے۔ جیسا دِل میں بھروگے۔ ویسا پاؤگے۔ جیسا اپنی زمینِ خیال میں بوؤگے۔ ویسا باہر کاٹوگے۔

چین میں ایک طالب علم بہت ہی نادار تھا۔ رات کو پڑھنے کے واسطے اُسے تیل بھی میسّر نہ ہوتا تھا۔ جگنوؤں کو اکٹھا کر کے ایک پتلے ململ کے کپڑے میں باندھ کر کتاب کے اُوپر رکھ لیا کرتا۔ اور اُس کی چمک میں پڑھا کرتا تھا۔ کسی نے کہا۔ کہ اتنی محنت کیوں کرتے ہو۔ کیا چین کے وزیر ہو جاؤگے؟ اُس نے جواب دیا۔ کہ اگر طاقتِ خیال کے متعلق خُدا کے قانون سچّے ہیں۔ تو ایک روز مَیں ضرور وزیر ہو جاؤں گا۔ چین کی تاریخ میں دیکھئے کہ ایک دن آیا۔ یہی لڑکا وزیر بن گیا۔

تذکرہ آبِحیات میں پروفیسر آزاد نے ایک عجیب واردات لکھی ہے۔ ایک دن لکھنؤ میں ایک شاعر نواب صاحب اور تمام دیوان و مصاحبوں کو اپنے اشعار سے خوش کر رہا تھا۔ محل میں نواب صاحب

دیر سے پہنچے۔ بیگموں نے پوچھا کہ دیر کیوں ہوئی نواب صاحب نے فرمایا۔ کہ عجیب و غریب چٹکلے اور شعر و سخن سُنتے رہے۔ بیگمات نے سفارش کی کہ ہم کو بھی سُنوائیے گا۔ دوسرے دن پردہ کیا گیا۔ اور شاعر بُلوایا گیا۔ بیگمات بہت ہی محفوظ ہُوئیں۔ اور فرمائش کی کہ محل میں ایک کمرہ اُس کو رہنے کے لئے دیا جائے۔ شاعر بھانپ گیا۔ کہ محلات میں رہُوں گا۔ تو اس خیال سے کہ میں مستورات کو دیکھ سکونگا نواب صاحب کو ناگوار گذرے گا۔ نواب صاحب کو تامل میں دیکھ کر خود شاعر نے گِلہ شروع کیا کہ اور تو میں سب باتوں میں اچھا ہُوں۔ لیکن صرف ایک ہی بات کی کسر ہے۔ مجھ کو دکھلائی مُطلق نہیں دیتا۔ آنکھوں سے معذور ہُوں۔ شاعر کی یہ شکایت تیر بہدف ہُوئی۔ حیلہ ٹھیک اُترا۔ اور نواب صاحب کے دِل میں جو کھٹکا تھا وہ دُور ہو گیا۔ اور اجازت دیدی کہ محل میں ایک کمرہ اسے رہنے کو دیا جائے۔ لیکن ناپاک شاعر یہ دھوکا دے رہا تھا۔ کہ مَیں اندھا ہُوں۔ دِل میں یہ بُری نیت بھری تھی کہ اس بہانے مَیں بے کھٹکے عورتوں کو بُرا جھانکوں۔ پر دھوکا تو انجام کار سوائے اپنے آپ کے اور کسی کو بھی دینا مُمکن نہیں۔ اور بُرائی میں کامیابی تو گویا زہریلی شراب ہے۔

ایک روز رفع حاجت کے لئے شاعر جانا چاہتا تھا۔ لونڈی سے لوٹا پانی کا مانگا۔ لونڈی نے کہا کمرہ میں لوٹا نہیں ہے۔ کہاں سے لاؤں؟ (قاعدہ ہے کہ خادم لوگ ایسے مہمانوں سے دِق آجاتے ہیں) لیکن شاعر کو جلدی لگی تھی۔ رہا نہ گیا۔ بے اختیار بول اُٹھا "دیکھتی نہیں ہے؟ اندھی ہے؟ وہ کیا لوٹا پڑا ہُوا ہے؟" سچ بھلا کہاں تک چھُپے۔

یہ سُنتے ہی لونڈی بھاگی۔ اور بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ کر کہا کہ یہ مُوا تو دیکھتا ہے۔ اندّھا نہیں ہے۔ اپنے تئیں جھُوٹ مُوٹ اندھا بتاتا ہے۔ اُسی روز وہ محل سے نکالدیا گیا۔ لیکن کہتے ہیں کہ دوسرے ہی روز وہ سچ مُچ اندھا ہوگیا۔ کیسا عبرت ناک معاملہ ہے۔ جیسا تُم کہوگے اور خیال کروگے ویسا ہی ہونا پڑے گا

سه گر در دلِ تو گُل گُذرد گل باشی
در بُلبلِ بیقرار بُلبل باشی
سودائے بلا رنج و بلا مے آرد
اندیشۂ کُل پیشہ کُنی کُل باشی

(اگر تیرے دِل میں پھُول کا خیال گُذرتا ہے تُو پھُول ہوجاتا ہے اور اگر بیقرار بُلبل کا۔ تو بُلبل۔ مصیبت کا خیال رنج وغم لاتا ہے اگر تو سب کی بھلائی کا خیال رکھے تو سب ہوجائے)

لڑکپن میں اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ بعض لڑکے آنکھیں بند کرکے اندھے بن کر اُلٹے چلا کرتے تھے۔ اُن کی ماں یہ دیکھکر اُن کو مارتی تھیں۔ اور منع کرتی تھیں کہ شُبھ شُبھ مُرادیں مانگو۔ اندّھوں کے سوانگ بھرتے ہو۔ کہیں انّدھے ہی نہ ہو جاؤ۔ سچ کہا ہے "کرشن کرشن مَیں کرتی تھی لو مَیں ہی کرشن ہوگئی"

آپ نے دیکھ لیا۔ اندھا کہنے سے انّدھا۔ وزیر کے دھیان سے وزیر۔ لارڈ میر کے خیال سے لارڈ میر بن جاتے ہیں۔ پس اپنی مدد آپ کرنے کے لئے اپنی طرف اپنا فرض ادا کرنے کے لئے سب سے اوّل ضروری امر آپ لوگوں کے لئے ہے خیالات کی پاکیزگی۔ بلند ہمّتی شُبھ

سنسکار۔ پوتر بھاؤ۔ اور "میں سب کچھ کرسکتا ہوں" ایسا خیال۔ فراخ حوصلگی اور استقلال

؎ گر بفرق ما نہد صد کوہ محنت روزگار
چین پیشانی نہ بیند گوشۂ ابروئے ما

(اگر روزگار کی محنت ہمارے سر پر سو پہاڑ رکھدے تو بھی ہماری بھوؤں کا کونہ پیشانی کی شکن کو نہ دیکھے گا)

؎ اگرچہ قطب جگہ سے ٹلے تو ٹل جائے
ہمالہ باد کی ٹھوکر سے گو پھسل جائے
اگرچہ بحر بھی جگنو کی دُم سے جل جائے
اور آفتاب بھی قبلِ عُروج ڈھل جائے
کبھی نہ صاحبِ ہمّت کا حوصلہ ٹوٹے
کبھی نہ بھولے سے اپنے جبیں پہ بل آئے

عالی ہمتی اور خیالات کی بلندی کے یہ معنی نہ سمجھ لینے کہ اپنے تئیں تو تیس مار خاں ٹھان بیٹھیں۔ اور اوروں کو حقیر ماننے لگیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اپنے تئیں نیک اور بزرگ بنانے کے لئے اوروں کی محض نیکی اور بزرگی ہی کو دل میں جگہ دینا لازم ہے۔ بُدھ بھگوان کہا کرتے تھے "جیسا کوئی خیال کرے گا۔ ہو جائے گا" اُن کے پاس دو شخص آئے۔ ایک نے پُوچھا۔ کہ مہاراج یہ جو میرا ساتھی ہے۔ دُوسرے جنم میں اس کا کیا حال ہوگا یہ تو کُتّے کے سے خیال رکھتا ہے۔ کُتّے کے سے کرم کرتا ہے۔ کیا اگلے جنم میں کُتّا نہ بنے گا؟ دوسرا پہلے کی بابت کہتا ہے کہ یہ میرے ساتھ کا ہر بات میں بِلّا ہے۔ کیا اگلے جنم

میں یہ بِلّا نہ ہوگا؟ مہاتما بولے کہ بھائی جیسے تُمہارے سنسکار (خیال) ہونگے ویسے ہی تُم کو پھل ملیں گے۔ لیکن تُم لوگ اس اصول کو غلطی سے لگا رہے ہو۔ وہ تُم کو بِلّا کہہ رہا ہے۔ تُم اُس کو کُتّا۔ اب غور کرنا۔ وہ شخص جو اپنے ساتھی کو کُتّا دیکھتا ہے۔ اُس کا اپنا دِل کُتّے کی صورت قبول کر رہا ہے۔ وہ خود ایسے خیال سے کُتّے کے سنسکار دھارن کرتا جاتا ہے۔ پس جب ایسا شخص مرے گا۔ تو چونکہ اس کے انتہ کرن میں کُتّا سما رہا ہے۔ لہذا خود کُتّا بنے گا۔ اور اسی طرح اپنے پڑوسی کو بِلّا سمجھنے والا خود بِلّا بنے گا۔ اس اصول کو غور سے دیکھنا۔ وہ نُقص جو ہم اوروں میں لگاتے ہیں۔ وہ ہم میں ضرور داخل ہوں گے۔ رامؔ کہتا ہے کہ اپنی مدد آپ کرنے کے لئے آتم کرپا اس بات کی مُقتضی ہے کہ ہم لوگ اوروں کی نُکتہ چینی کو چھوڑ دیں اور اپنے متعلّق بھی عرصۂ خیال میں سوائے نیکی اور خوبی کے اور کچھ نہ آنے دیں۔ جیسے گُنبد میں سے ہماری ہی آواز لوٹ کر آتی ہُوئی گُونج بن جاتی ہے۔ ویسے ہی اس گُنبد نیلوفری کے نیچے ہمارے ہی خیالات لوٹ کر اثر کرتے ہُوئے قسمت کہلاتے ہیں۔

بد نہ سوچ زیرِ گردُوں گر کوئی میری سُنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

اپنے ہی خیالات کو دُرست رکھو۔ ناحق فلک کو ناہنجار اور چرخ کو کجرفتار کہنا بچّوں کی طرح گُنبد کو الزام لگانا ہے۔ اگر سب کچھ کہیں باہر کی قسمت ہی سے ہے۔ تو شاستر ودِھی نشیدھ (امر و نہی) کے کلمات کو جگہ نہ دیتا۔ جب شاستر یہ جانتا تھا کہ تُمہارے اختیار میں کُچھ نہیں ہے۔ سب کچھ قسمت ہی میں ہے۔ تو شاستر نے کیوں کہا کہ یُوں کرو

اور ودّوں نہ کرو۔ اور تُم پر جوابدہی کس منطق سے عائد کی گئی؟

ے درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردۂ
باز میگوئی کہ دامن ترمکُن ہُشیار باش

دریا کی منجدھار میں مجھے تختہ سے باندھکر چھوڑ دیا ہے اور پھر کہتے ہو کہ دامن بھیگنے نہ پائے۔ ہوشیار رہنا

تُمہارے اندر وہ طاقت ہے کہ جو چاہو کر سکتے ہو۔ اور سچ پُوچھتے ہو رام کہتا ہے۔

ے میں نے مانا دہر کو حق نے کیا پَیدا وَلے
مَیں وہ خالق ہُوں میری "کُن" سے خُدا پَیدا ہُوا

पौरुषा दृश्यते सिद्धिः पौरुषाद्धी मतां क्रमः।
दैवमाश्वासना मात्रं दुःखकेवल बुद्धिषु॥

(مطلب) ہمّت ہی سے کامیابی ہوتی ہے۔ اور ہمت ہی سے عاقلوں کے کاروبار چلتے ہیں۔ قسمت کا لفظ تو مصیبت میں نازک دِلوں کے آنسو پونچھنے کے لئے ہے۔

God helps those who help themselves.

پرمیشور اُن کی سہایتا کرنے کو حاضر کھڑا ہے جو اپنی مدد آپ کرنے کے لئے تیّار ہوں۔ یہ ایک قانُونِ قُدرت ہے۔ یہ اٹل قانُونِ قُدرت ہے کہ جب آدمی پُورا ادھکاری (مستحق) ہوگا۔ تو جو اُس کا ادھکار (حق) ہے۔ خود بخود اُس کو ڈھونڈ لے گا۔ یہاں آگ جل رہی ہے۔ آکسیجن کھچکر اُس کے پاس آجائے گی۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے "First deserve and then desire"

"پہلے تم لائق بنو۔ پھر تم خواہش کرو" رام کہتا ہے "Deserve only
and need not desire" خواہش کی ضرورت نہیں محض
لائق یا مستحق بنو۔ کہ جب تم لائق ہو گے۔ تو خواہش کئے بغیر ہی مراد
آملے گی۔

؎ باندھے ہوئے ہاتھوں کو بامیدِ اجابت
رہتے ہیں کھڑے سینکڑوں مضموں مرے آگے

The stone that is fit for the wall
cannot be found in the way

جو پتھر دیوار میں لگنے کے لائق ہے۔ وہ زمین پر کب رہنے پائے گا۔
جب آپ پورے ادھکاری ہوں گے۔ تو آپ کے لائق منصب ہے
اور آپ ہیں۔ منصب کی تلاش میں وقت مت ضایع کرو۔ اپنے تئیں
مناسب بنانے کی فکر کرو۔

؎ ناخنِ خار آکے خود عقدہ ترا کردے گا وا
پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

جب سورج کی طرف منہ کرکے چلتے ہو تو سایہ پیچھے بھاگتا پھرتا
ہے۔ جب سایہ کو پکڑنے دوڑو گے۔ تو سایہ آگے نٹھتا (بھاگتا) چلا جائیگا۔

؎ بھاگتی پھرتی تھی دنیا جب طلب کرتے تھے ہم
اب جو نفرت ہم نے کی وہ بیقرار آنے کو ہے

؎ گزشتم از سرِ مطلب تمام شد مطلب
نقاب چہرۂ مقصود بود مطلبہا

(مطلب (خواہش) کے خیال سے گزرتے ہی مطلب (مقصد) پورا ہوگیا

مطلب (خواہشیں) ہی مقصود (مطلوبہ) کے رُخ پر نقاب تھے)
بھِک منگے (سوالی) کو ہر کوئی دُر دُر کرتا ہے۔ غنی دِل کے پاس مُرادیں خود سلامی کو آتی ہیں۔

ے سو بار غرض ہووے تو دھو دھوپئیں قدم
کیوں چرخ و مہر و ماہ پہ مائل ہُوا ہے تو

جاپان میں تین تین سو چار چار سو سال کے چیڑ اور دیودار کے درخت دیکھے۔ جو صرف ایک ایک بالشت کے برابر یا کچھ زیادہ اونچے تھے۔ آپ خیال کریں۔ کہ دیودار کے درخت کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ مگر کیا باعث ہے کہ اِن درختوں کو صدیوں تک بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ جب ہم نے دریافت کیا تو لوگوں نے کہا۔ کہ ہم ان درختوں کے پتّوں یا ٹہنیوں کو بالکل نہیں چھیڑتے۔ بلکہ جڑ کاٹتے رہتے ہیں۔ نیچے بڑھنے نہیں دیتے۔ اور قاعدہ ہے کہ جب جڑ نیچے نہیں جائے گی تو درخت اوپر نہیں بڑھے گا۔ اوپر اور نیچے (یا اندر اور باہر) دونوں میں اس قسم کا تناسب ہے۔ کہ جو لوگ اُوپر بڑھنا چاہتے ہیں۔ دُنیا میں پھلنا پھولنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں نیچے اپنے اندر باطن (آتما) میں جڑیں بڑھانی چاہئیں۔ اندر اگر جڑیں نہ بڑھیں گی۔ تو درخت اُوپر بھی نہ پھیلے گا۔

ع نفس بہ نَے چو فرو شُد بلند میگردد
(بانسری میں جتنا دم نیچے جاتا ہے۔ اُتنی ہی آواز بلند ہوتی ہے)

ے منصُور سے پُوچھی کسی نے کوچۂ دلبر کی راہ　　پُچھ صاف دِل میں راہ بتلاتی زبان دار ہے
سر ہمچو تارِ سُبحہ بہ صد دُر کشیدہ ایم　　آخر رسیدہ ایم بخود آرسیدہ ایم

(مالا کے دھاگے کی طرح ہم نے اپنے سر کو سو دانوں کے اندر پرو دیا۔
آخر میں جب اپنے تک پہنچے تبھی آرام ملا۔)

آتم کرپا جو رام کہتا رہا۔ اس کے معنی کسی طرح کی خودی۔ خودپسندی یا خود غرضی نہیں ہیں۔ اس کے معنی ہیں تربیتِ رُوحانی اور آتم کرپا یا تربیت روحانی کا جُزوِ عظیم ہے توسیعِ دِل یعنی صفائے قلب پیدا کرنا۔ اس حد تک کہ ہمارا ضمیر مُلک بھر کے ضمیر کا نقشہ ہو جائے۔ شیشۂ جہاں نما کا کام دینے لگ پڑے۔ مُلک بھر کی حاجتوں کو ہم اپنے نِج کی حاجتیں محسوس کرنے لگ پڑیں۔ اور جب لوگوں کی نگاہ میں ہم سارے ہندوستان یا دُنیا بھر کے بھلے کام کر رہے ہوں۔ ہمیں وہ کام صرف نِج کا کام معلوم دے۔ پس اپنے دِل کو ایسا وسیع اور فراخ کرتے جانا کہ یہ دِل ساری قوم کا دِل ہو جائے آتم اُنّتی (ترقّیٔ ذاتی) ہے۔ ذاتی ترقّی کا معراج ہے سب کے ساتھ یہ ہمدردی۔

ع خوں رگِ مجنُوں سے نکلا فصد لیلیٰ کی جو لی

ے پتّی کو پھول کی لگا صدمہ نسیم کا
شبنم کے قطرے آنکھ سے اُن کی ٹپک پڑے

جو رام نے کہا ہے آتم بَل وہ اور لفظوں میں ایشور بَل ہی ہے۔ آپ کی جو ذاتِ حقیقی ہے وہ سب کی ذات ہے۔ اور وُہی اصل میں خُدا کی ذات ہے

ے ما نُورِ خدائیم دریں دَیر فستادہ
یا آبِ حیاتیم دریں جُوئے روانیم

(اس جسم کے مندر میں ہم خُدا کے نُور ہیں۔ یا اس جسم کی نہر میں

ہم آبِ حیات ہیں جو بہہ رہے ہیں ۔)

یہ جسم و اسم اس ذاتِ حقیقی کے ناپائدار سایہ کی طرح ہیں ۔
اپنے تئیں جسم و اسم ٹھان کر جو کام کیا جاتا ہے ۔ وہ خودی اور خود غرضی کا اُکسایا ہُوا ہوتا ہے ۔ اور اُس کا نتیجہ دُکھ اور دھوکا ہوتا ہے ۔ لیکن جو کام مستیٔ وحدت میں ہوتا ہے ۔ یعنی جو کام بہ حیثیتِ ذاتِ جہاں کے کیا جاتا ہے ۔ وہ خودی سے نہیں بلکہ خُدائی سے نکلتا ہے ۔ اور اُس کا نتیجہ ہمیشہ راحت اور کامیابی ہوگا ۔

سارے لیکچر کی غرض یہ ہے ۔ کہ بجائے خودی کے خُدائی کی آنکھ سے سب تعلّقات کو دیکھو اور بجائے جسم و اسم میں لنگر ڈال بیٹھنے کے ذاتِ حقیقی میں گھر کرو

بہت مضبوط گھر ہے عاقبت کا دارِ دُنیا سے
اُٹھا لینا یہاں سے اپنی دولت اور وہاں رکھنا

جو شخص جسم و اسم (جسمانیت و نفسانیت) کی بُنیاد پر کاروبار کا سلسلہ چلا رہا ہے ۔ وہ ہوا کی نیو (بنیاد) پر قلعہ قائم کرنا چاہتا ہے جیتا وُہی ہے ۔ جو دُنیا کی ترّقی و اقبال ۔ ذلت و زوال وغیرہ کو دریا کی جھاگ کی طرح غیر حقیقی مانتا ہے ۔ اور اُن کا بھروسہ نہیں کرتا ۔

سایہ گر سائۂ کوہ است سُبک مے باشد
(سایہ اگر پہاڑ کا سایہ بھی ہو تو ہلکا ہی رہتا ہے)

آنکھوں والا صرف وہی ہے جس کی نگاہ نمودِ دُنیا کو چیر کر اشیاء کے اقرار و انکار کو نظر انداز کرکے لوگوں کی دھمکی اور تعریف کو کاٹ کر ایک حقیقت پر جمی رہتی ہے "نہیں ہے کچھ بھی سوائے اللہ کے"۔

"برہم ہی ستیہ ہے۔ جگت مِتھیا ہے۔" ہوش و حواس والا صرف وہی ہے جو ہر وقت عینِ خوبی۔ کمالِ حُسن یعنی ذاتِ حقیقی کو دیکھنا ہُوا حیرت کا پُتلا ہو رہا ہے۔ سراپا تعجّب بن رہا ہے۔

ؔ کاش دیکھو مجھے مجھے دیکھو
ہر سرِ مُو سے چشمِ حیرت ہو
کُھب گیا جس کے دِل میں حُسن مرا
دنگ سکتے کا ایک عالم تھا

خواب میں کسی کو خزانہ ملا۔ اُس دولت کے بھروسے جو امیر بنے وہ احمق ہے۔ اسی طرح اس خواب دُنیا کی اشیا کے اعتبار پر جو جیتا ہے۔ وہ جیتا ہی مرگیا۔ فرض ادوئے اور آتم کرپا کا کمال یہی ہے کہ

ؔ تو کو اتنا مٹا کہ تُو نہ رہے
اور تجُھ میں دُوئی کی بُو نہ رہے

یہ محدود مادمنی! اس کا نام تک مٹ جائے۔ نشان تک نہ رہنے پائے۔

ع تو مباش اصلا کمال اِینست وبس
(تُو ہرگز مت ہو یعنی خودی کو بالکل مٹادے۔ یہی کمال ہے اور بس)

ع تو خود حجابِ خودی اَے دِل از میاں برخیز
(اے دِل! اپنا پردہ خود آپ ہے۔ بیچ میں سے اُٹھ جا)

ؔ نہ دارِ آخرت نے دارِ دُنیا در نظر دارم
زعشقت کارِ چُوں منصور بادارِ دِگر دارم
(دُنیا و عُقبیٰ کی دار (گھر) میری نگاہ میں نہیں ہے۔ تیرے عشق سے

منصور کی طرح دوسری وار (سُولی) سے میرا سروکار ہے۔)

انانیت کو قائم رکھکر جو بڑا بنتے ہیں۔ فرعون و نمرود ہیں۔ انانیت کو مٹانے والا خود خُدا اناالحق ہے۔

رسّی میں کسی کو سانپ کا وہم ہوگیا۔ اب اگر اُس کے لئے رسّی ہے تو سانپ نہیں۔ اور سانپ ہے تو رسّی نہیں۔ ایک ہی رہے گا۔ خودی ہے تو خُدا نہیں۔ خُدا ہے تو خودی نہیں۔

سہ تیرِ نگاہے نشست مسکنِ خود جاں گذاشت
طاقتِ مہماں نداشت خانہ بمہاں گذاشت

(پیارے کی نگاہ کا تیر لگتے ہی جان نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ مہماں نوازی کی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے گھر مہمان کے لئے چھوڑ دیا۔)

تا شانہ صفت سر نہ نہی در تہِ ارّہ
ہرگز بہ سرِ زُلف نگارے نرسی

(جب تک کنگھی کی طرح سر آرہ کے نیچے نہ رکھو۔ یار کی زُلف تک نہیں پہنچ سکتے)۔

تا سُرمہ صفت سُودہ نگردی تہِ سنگ
ہرگز بہ صفا چشمِ نگارے نرسی

(جب تک سُرمہ کی طرح پتھر تلے پِس نہ ہوگے۔ یارِ حقیقی کی آنکھوں تک نہیں پہنچ سکتے)

اگر کہو کہ آنکھیں نہیں تو یار کے کانوں تک ہی کسی طرح رسائی حاصل کرلیں تو بھی جب تک خود غرضی دُور نہ ہوگی۔ جب تک یہ اہنکار مر نہ لے گا۔ جب تک خودی کم نہ ہوگی یار کے کانوں تک

نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ کان میں رہتا ہے موتی۔ ذرا اُس کی کیفیت دیکھو

تا ہمچو دُرِ سُفتہ نگردی با تار
ہرگز بہ بنا گوشِ نگارے نرسی

(جب تک موتی کی طرح تار سے چھیدے نہ جاؤ۔ یار کے کان تک بھی ہرگز نہیں پہنچ سکتے)

تا خاک تُرا کُوزہ نسازند کُلالاں
ہرگز بہ لبِ لعلِ نگارے نرسی

(کُمہار (مُرشد) جب تک تیری مٹی کا پیالہ نہ بنالیں۔ ہرگز پیارے کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ سکتے)

پس از مُردن بنائے جائیں گے ساغر مری گِل کے
لبِ جاناں کے بوسے خُوب لیں گے خاک میں مِل کے

اِن اشعار میں آنکھ کان لب وغیرہ سے یہ اشارہ نہیں ہے کہ پرمیشور کے آنکھ کان ناک ہیں۔ اس کا مطلب یُوں ہے۔ کہ جیسے ایک ہی دِلدار کو خوش کرنے کے لئے اُس کے کان کو راگ سُنا سکتے ہیں۔ یا اُس کی آنکھ کو سُندر رُوپ دکھا سکتے ہیں۔ یا ناک کو پھُول سُنگھا سکتے وغیرہ۔ کوئی کسی ذریعہ سے اس محبوب کو خوش کر سکتا ہے۔ کوئی کسی اَور ذریعہ سے۔ لیکن کوئی طریقہ ایسا نہیں کہ جس میں بیرُونی خودی کی موت کے بغیر کام نکل سکے۔ بیشک کوئی وشنوَ بن کر پرمیشور کو پُوج سکتا ہے۔ کوئی شیوَ رہ کر بھگتی کر سکتا ہے۔ کوئی مُسلمان کی حیثیت میں پرشتش کرے۔ کوئی عیسائی کی حالت میں بندگی کرے۔ لیکن وَشنوَ۔ شیوَ۔ مُسلمان۔ عیسائی وغیرہ کوئی ہو۔ کامیابی۔ دیدارِ حق۔ وصلِ خُدا تب ہی

ہوگا۔ جب نفسانی زندگی کی موت ہولے گی۔
اگر کہو کہ زُلف آنکھ کان اور لب تک نہیں تو کاش! یار کے ہاتھ تک ہی پہنچ گئے ہوتے تو

نا ہیچو سر نہ نہی در تہِ کارد
ہرگز بہ سرِ انگُشتِ نگارے نرسی

(جب تک مانند قلم کے سر چھُری کے نیچے قلم نہ کرڈالو۔ ہرگز سرِ انگشتِ یار (ہاتھ) تک نہیں پہنچ سکتے۔)
اگر کہو کہ ہمیں سب سے نیچے رہنا منظور ہے۔ یار کے پاؤں تک ہی کسی طرح رسائی ہوجائے تو۔

ے تو ہیچو حنا سُودہ نگردی تہِ سنگ
ہرگز بہ کفِ پائے نگارے نرسی

(جب تک مثل مہندی کے پتھر کے نیچے گھِسے نہ جاؤ۔ ہرگز کفِ پائے یار تک نہیں پہنچ سکتے)

الغرض

ے تا گُل شدہ بریدہ نگردی از شاخ
ہرگز بہ گُلِ حُسنِ نگارے نرسی

(جب تک پھُول کی طرح شاخ (تعلقات) سے کاٹے نہ جاؤ۔ یار تک کسی صورت سے پہنچ نہیں سکتے۔
بانسری سے پُوچھا اری بانسری! کیا بات ہے کہ وہ کرشن وہ پیارا مُرلی منوہر جس کے ابرُو کے اشارے سے شہنشاہ کانپتے ہیں۔ بھیشم۔ ارجن۔ دریودھن ایسے مہاراجہ ادھیراج جس کے چرنوں کو چھُوتے

کے بھُوکے پیاسے ہیں۔ جس کی خاکِ پا (برِج رج) کو ابھی تک راجہ مہاراجہ لوگ جاکر مستک پر دھارن کرتے ہیں۔ اور مہ جبینانِ سیمیں ساق جس کے مرد مُسکان (تبسم شیریں) کو دیکھنے کے لئے ترستے ہیں۔ وہ کرشن تجھ کو چاہ اور پیار سے خود بار بار چُومتا ہے۔ ایک ذرا سی بانس کی لکڑی! تُونے ایسے بڑے بھگوان کرشن پر کیا جادُو ڈالا؟ تُجھ میں یہ کرامات کہاں سے آگئی؟ بانسری نے جواب دیا کہ مَیں سر سے لیکر پاؤں تک (خودی اور اہنکار کو دُور کرکے) بیچ سے خالی ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ کرشن خود آن کر مجُھے بوسے دیتا ہے۔ جس کے چرنوں کے چُومنے کو لوگ ترستے ہیں۔ وہ شوق سے مجُھ کو چُومتا ہے۔ مجُھ سے دِلکش نغمے کیوں نہ نکلیں۔ مجُھ میں رامؔ کا دم ہے۔ میری سُریں اُس کی سُریں ہیں

سہ تہی ز خویش چو نَے شَو ز پائے تا سرِ خود
دگر نہ بوسِ لبِ لعلِ نائی آساں نیست

(مثل بانسری کے سر سے پَیر تک خالی ہوجاؤ۔ ورنہ پیارے مُرلی دھر کے بوسے ملنا آسان نہیں)

اس دُنیا سے مُنہ موڑ کر عارف لوگ حیاتِ ابدی پاتے ہیں

اوم! اوم!! اوم!!!

تدبیر و تقدیر

(یہ لیکچر بمقام لکھنؤ ۱۹۰۵ء میں ہُوا تھا)

اصلی حوالہ یا پرمان تُمہیں خود ہونا چاہیئے۔ کیا کتابیں بیکار ہیں؟ بیشک کتابوں سے مجھے مدد ملی اور جو کچھ اُن کتابوں میں لکھا تھا وہ سب مَیں اپنے تجربہ میں لایا۔ وہ پہلے میرے پرمان اور حوالہ تھیں۔ اور اب مَیں خود پرمان اور حوالہ ہُوں۔ علمِ کیمیا کی کتاب طالبِ علم کو مدد دیتی ہے۔ لیکن طالبعلم کا اپنا تجربہ اُس کی حقیقی تصدیق کرتا ہے۔ وید یا قُرآن تُمہیں رُوحانی کیمیا میں معاون ہو سکتے ہیں۔ لیکن تُمہارا ذاتی تجربہ اصلی پرمان یا حوالہ ہے۔ آپ لوگوں کو آج میری سب باتوں سے تو اتّفاق نہوگا۔ خیر آج نہیں تو کل تو اتّفاق ہوگا۔ اور کل نہیں تو دُوسرے جنم میں جاؤ گے وہاں ماننا ہی پڑے گا۔ سچائی کو ہمیشہ فروغ ہوگا۔ اصل ذات انسان کی تو ہے خُدا۔ اور تمام دُنیا کی طاقتیں اُسکی ماتحت ہیں۔ لیکن جس کو عمُوماً لوگ آدمی یا انسان کہتے ہیں۔ وہ من بُدّھی اور جسم ہے۔ اُس کو اُسی طرح سے قُدرت کی قُوّت حاصل ہے جس طرح سے ندی نالے ابر و باد و مہ و خورشید کو۔ اگر آدمی کو انہیں معنوں میں لیں۔ تو آدمی ایک ناکارہ مجبور جنس مثل دیگر

اجناس کے ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ گیند کو ہاتھ میں لیکر جب ہوا میں پھینکتے ہیں اُس میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کہیں وہ با خبر ہو جائے یعنی اُس میں کانشسنس consciousness (شعور، درک و ادراک) کا مادّہ پیدا ہو جائے تو وہ یہی کہے گا کہ مَیں خود چلتا ہُوں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہ خود نہیں چلتا۔ مختلف قوّتیں ہیں جو اُسے چلاتی ہیں۔ جس میں سے ایک گریوٹیشن (gravitation قوّتِ ثقل) ہے۔ اور ایک وہ فورس (force قوّت) ہے جس نے اُس میں حرکت پیدا کی تھی۔ انسان اسی طرح مثل دیگر اشیاء کے ہے۔ دُوسری طاقتوں کی ماتحتی میں کام کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ درخت پھل پھُول۔ اور نباتات میں حس نہیں اور اس میں حس ہے۔ وہ نہیں کہتے کہ کسی کام کو ہم کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ مَیں کرتا ہُوں۔ مَیں کرتا ہُوں"۔ فی الواقعہ وہ ایک ہی قُوّت ہے جو سب میں کام کرتی ہے۔ گو نام مختلف ہیں۔ دُنیا کی اور چیزوں میں اُسے گریویٹیشن (قوّتِ ثقل) کہو۔ اور اُسی قوّت کا انسان میں چاہے عشق نام رکھو۔ قُدرت میں اُسے افینٹی (affinity۔ رشتہ) کہو۔ اور انسان میں بھگتی۔ قُدرت میں جو اٹریکشن (attraction۔ کشش) اور ری پلشن (repulsion۔ قُوّتِ دافعہ) ہے۔ وہی انسان میں راگ۔ دویش (attachment and detachment۔ رغبت اور نفرت) ہے۔ اسکو ایک مثال سے واضح کیا جائے گا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جمی رہتی ہے۔ اور اسی میں سے گلیشئر (glacier) یا برف کا دریا پیدا ہوتا ہے اور راستوں کو کاٹتا چھانٹتا۔ درختوں کو اُکھیڑتا پچھیڑتا

آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ کس کی بدولت؟ سُورج کی بدولت و نیز دیگر قوّتوں کے باعث جو مِل کر کام کر رہی ہیں۔ پھر وہ آگے بڑھ کر دریا بن کر چلا۔ یہ دریا کیونکر چل رہا ہے؟ وہی سُورج۔ قُوتِ کشش اور دوسری طاقتیں عمل کر رہی ہیں جو برف میں کر رہی تھیں۔ لیکن چونکہ دریا رقیق ہے اس لئے سورج کا اُس میں عکس پڑتا ہے۔ پرندے۔ نباتات اور جمادات جو ترقّی کر رہے ہیں۔ وے پرمیشور کی بدولت۔ کئی مختلف طاقتوں کی بدولت۔ خُدائے لازوال کی بدولت۔ لیکن وے جمی ہُوئی برف کی طرح ہیں اور اُن میں عکسِ آفتاب یا باخبری (جس یا خودی) نہیں۔ انسان کا تعلّق دوسری چیزوں کے ساتھ وُہی ہے جو پگھلتے ہُوئے دریا کا برف کے ساتھ۔ چونکہ اس میں مثل دریا کے ایک عکس چتنیا کا پڑ رہا ہے۔ جس سے وہ باخبر ہے اور خودی کا مادّہ اُس میں پیدا ہوگیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "یہ تو مَیں کرتا ہُوں۔ مَیں کرتا ہُوں۔" حالانکہ کرنے والی وُہی تمام قوّتیں ہیں۔ فی الواقع درختوں کا خُدا وُہی ہے جو تُمہارا خدا ہے۔ درختوں کا انتر آتما وُہی ہے۔ جو تُمہارا۔ اس لئے درخت تمہارے بھائی ہُوئے۔ تمام قُدرت (خدائی) تُمہاری بھائی ہُوئی۔ یہ بات تو نیچر نے تمام کائنات میں دِکھادی ہے۔ نیز یہی مدارج چھوٹے اسکیل (پیمانہ) پر ہر انسان کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ جب وہ بچّہ تھا تو آتما تو ویسا ہی تھا۔ لیکن اہنکار۔ انانیت نہیں سمائی تھی۔ بڑھتے ہی گویا پہاڑوں کی برف پگھل پڑی۔ اور اُس دریا میں سُورج کی کرنیں پڑنے لگیں۔ اور وہ کہنے لگا کہ "یہ مَیں نے کیا۔ مَیں نے کیا۔"

جو بچپن میں نہیں کہتا تھا۔ خوابِ گراں کی حالت لو۔ اس حالت میں بھی جسم کچھ نہ کچھ بڑھ ہی رہا ہے۔ خون کی روانی بند نہیں۔ لیکن اُس وقت وہ انانیت کی حالت نہیں۔ اُس وقت تو تم جمادات یا نباتات کے بھائی ہو۔ جب عالمِ بیداری میں آئے۔ تو پھر رقیق حالت میں آگئے اور کرنیں منعکس ہونے لگیں۔ پھر کہنے لگے۔ کہ کتابیں میں نے لکھیں۔ لیکچر میں نے دیا۔ یہ میں نے کیا وہ میں نے کیا۔" ایک بات اور غور کرنے کی ہے۔ جب انسان کمال کی حالت کو پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ تب خودی کا خیال نہیں ہوتا۔ شاعر کی مثال لے لو۔ جس وقت وہ اپنے خیالات میں محو ہو جاتا ہے۔ اُسے ہرگز خیال نہیں رہتا کہ میں لکھ رہا ہوں۔ خودی کا خیال ہی نہیں۔ جس وقت ایک ریاضی داں مشکل عُقدے حل کر رہا ہو۔ اُس وقت گویا اُس کا دماغ خُدا نے پکڑ لیا ہے۔ خودی معدوم ہے۔ لیکن بیخودی میں حل کر چکنے کے بعد پھڑک اُٹھا کہ "واہ! کیا عُقدہ میں نے حل کیا ہے۔ میں نے کیا ہے۔" نپولین کو دیکھئے کہ میدانِ جنگ میں کھڑا ہے۔ ادھر سے گولہ سنسناتا ہوا نکل گیا۔ اُدھر سے سنسناتا ہوا آیا۔ ہزاروں آدمی گر رہے ہیں۔ لیکن اُسے خبر ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ خودی کا نام ہی نہیں۔ اُس کی وُہی حالت ہے جیسی گلیشیر (glacier) کی۔ جب کمال پر قوت ہوتی ہے۔ خودی نہیں ہوتی۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جتنے بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ انانیت کے بغیر ہوتے ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ جب انانیت آتی ہے تو ہمارے کام کو ردّی کر دیتی ہے۔ ایک آدمی لیکچر دے رہا ہے جس وقت یہ خیال آیا کہ "اچھا لیکچر میں دے رہا ہوں"

اُسی وقت سے وہ بات جاتی رہی۔ لڑکے نے جس وقت اسکول میں یہ خیال کیا کہ "کیا اچھی طرح نظم پڑھ رہا ہوں" پس اُسی وقت مُنہ بند ہوگیا۔ یہ انانیت مثل اُس مکھی کے ہے جو گاڑی چل رہی تھی تو گھوڑے کی پُشت پر بیٹھی ہوئی کہہ رہی تھی کہ گاڑی میں چلاتی ہوں۔ انسان میں جب انانیت آئی تو اُسی وقت سے وہ "تم اور ہو۔ مَیں اور ہوں" ہوگیا۔ یہ انانیت ہی ہے جس کی بدولت دماغ میں یہ بات سما جاتی ہے کہ یہ ہم نے کیا۔ حالانکہ انانیت نے کچھ بھی نہیں کیا۔ جیسے کہ سورج کی گرمی اور کششِ ثقل دریا کو چلانے کا باعث ہیں اگر دریا میں سُورج کا عکس کہدے کہ مَیں دریا چلا رہا ہوں تو کیا آپ اُسے مانیں گے؟ یا وہ مانے جانے کے قابل ہے؟ اسی طرح آپ کی انانیت نہیں ہے جو کام کرتی ہے۔ جو کام آپ کر رہے ہیں یا ہو رہا ہے وہ ایک پرمیشور کی بدولت ہو رہا ہے۔ جیسے لیبورٹری (Laboratory) ہوتی ہے یا اِنونیٹری (Inventory)۔ وہاں خیالی باتیں نہیں ہیں وہاں عملی تجربہ اور مشاہدے کئے جاتے ہیں۔ ویسے امریکہ میں علمِ خیالات کے تجربہ بھی کئے جاتے ہیں۔ بعض تجربے جو رامؔ نے دیکھے ہیں اب اُن کی شہادت دیگا۔ ایک آدمی کو ایسی حالت میں ڈال سکتے ہیں جب انانیت کام نہ کرسکے یعنے دریا بہتا جائے اور سُورج کا عکس نہ پڑے۔ یہ وہ حالت ہے جس وقت انسان ہپنوٹا ئیزڈ (hypnotized) یا سائیکلو جایزڈ (psychologized) کر دیا جاتا ہے۔ رامؔ کے سامنے ایک ایسے آدمی کو اس حالت میں ڈالا جسے چوتھیا کا تپ تھا۔ یعنی

جسے چوتھے روز کی باری سے بُخار آیا کرتا تھا۔ اُسے ہپنوٹائیزڈ کر کے اُس میں یہ خیال ڈالا کہ بُخار دُور ہو جائے۔ اور ایسی قوّتِ دل سے یہ خیال بھرا کہ اُس کا اثر ہو۔ پھر اُسی اصلی حالت میں لے آئے۔ تپ دُور ہو گیا۔ لیکن اُس کے بجائے روز تپ آنے لگا۔ یہ قصُور خیال کا نہیں تھا بلکہ اُس کا قصور تھا جس نے خیال بھرا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر اُس میں تپ کے مطلقاً دفع ہونے کا خیال ڈالا گیا۔ اور پھر جگایا گیا۔ تپ بالکل دُور ہو گیا۔ یہ امر اس بات پر دال ہے کہ آپ کا جسم آپ کے خیالوں سے بنا ہُوا ہے

اور تجربے سُنئے۔ ایک شخص تھا اُسے سِگرٹ پینے کی بُری علت تھی۔ اُنہوں نے چاہا کہ یہ عادت بند کر دیں۔ اُسے عَالمِ بیخبری میں ڈالا۔ اور اُس میں یہ خیال بھرا کہ اُس نے دِن بھر میں ایک ہی مرتبہ سِگرٹ پیا ہے۔ زاں بعد اُس نے ایک اتنا بڑا سِگرٹ بنا کے پینا شروع کیا جو سب کے برابر تھا۔ یہ غلطی خیال ڈالنے والے کی تھی۔ پھر دُوبارہ اُس پر عمل کیا گیا۔ اور وہ عادت بالکل چھُوٹ گئی۔ ان تجربوں میں ابتدا میں تو کچھ ناکامیابی رہی۔ مگر مکمل کامیابی کے تجربے بھی یہی ہیں۔ کل بتایا تھا کہ مسٹر جونز (Jones) کی ایسی حالت بدل گئی اور اُس کے خیالات کی طاقتیں ایسی مروڑی گئیں کہ وہ ڈاکٹر پاک کی حالت میں کام کرنے لگا۔ یہ تجربہ چاہے مانو یا نہ مانو۔ ابھی کچھ زمانہ نہیں گذرا کہ لوگ ریل اور تار کی حیرت انگیز قوّتوں کو نہ مانتے تھے۔ نہ مانو۔ تُمہاری مرضی ہے۔ لیکن آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ اِن کو رام کیسے کہدے کہ نہیں ہیں۔ آپ کے جسم کی صحت

اور بیماری۔ آپ کے چہرے کی رنگت وغیرہ یہ کون سی طاقتیں ہیں جو چلا رہی ہیں؟ یہ طاقتیں خیال کی ہیں۔ آپ کے بیرونی حالات اور اعمال آپ کے اِس خیال کی طاقت پر موقوف ہیں۔ کل رام نے آپ کو بتایا تھا کہ ایک آدمی کو ایسی حالت میں ڈال کر فرش کو جھیل کر دیا اور وہ اُس میں مچھلیاں پکڑنے لگا۔ یہ بھی دیکھا کہ ایک آدمی کو ایسی حالت میں ڈالا گیا اور خیال کیا کہ وہ درخت ہے۔ سر ایک میز پر رکھا اور پاؤں دُوسری میز پر۔ بیچ میں بوجھ رکھا گیا۔ اور لڑکے چڑھے۔ لیکن جھکنے کا نام نہیں۔ یہ کیا؟ یہ ثابت کرتا ہے کہ جسمانی اور بیرونی امور خیال پر منحصر ہیں۔

ع جیسی آپ کی مَتی ہوگی ویسی آپ کی گتی ہوگی

خیالوں کی ایک حالت ہوتی ہے جس میں انانیت کا ساتھ نہ ہو۔ اُس حالت کو کارن شریر (عالم جبرُوت سبجکیٹوائنڈ subjective mind) کہتے ہیں۔ جس حالت میں انانیت کا ساتھ ہو اُسے اوبجکیٹو مائینڈ (objective mind) یا سُوکشم شریر یا عالم برزخ یا ملکوت کہتے ہیں۔ ناسُوت کو استھُول شریر کہتے ہیں۔ یہ تینوں اجسام آپس میں ایسا تعلّق رکھتے ہیں جیسے پانی اور برف کا تعلّق ہوتا ہے۔ جو کام ہاتھ سے ہوتا ہے اُس کا اثر من پر پڑتا ہے۔ اور اِس وقت جو لیکچر سُن رہے ہو وہ اپنے حواس سے اپنی اِندریوں سے سُن رہے ہو۔ یہ جسمانی فعل ہے۔ اور سُوکشم شریر کا فعل یعنی خیال ہو رہا ہے۔ جب یہاں سے چلے جاؤ گے کچھ دیر تک اثر رہے گا۔ پھر یہ اثر من میں بھی نہیں رہے گا۔ آخر یہ طاقت تھی۔ کہیں نہ کہیں ہوگی

اگر تمہارے پاس نہ رہی تو پھر یہ طاقت کہاں رہے گی؟ یہ عالمِ جبروت یا کارن میں رہے گی۔ وہاں کا جانا یوں تسلیم کریں گے جیسے ایک جھیل ہے اُس میں بہت سی چیزیں گریں۔ کچھ دیر اُوپر رہیں۔ پھر تہ میں بیٹھ گئیں۔ اگر ہلاتے ہیں تو سطح پر آگئیں۔ رامؔ ہندوستانی بول رہا ہے۔ انگریزی۔ فارسی من کی تہ میں ہیں۔ عالمِ خیال کی جھیل کو ہلادیں تو سطح پر آسکتی ہیں۔ جس وقت آپ عالمِ خیال میں ہوتے ہیں تو کئی مرتبہ جوش آجاتا ہے کہ "میں یہ کام کروں گا۔ وہ کام کروں گا۔" گویا یہ طاقت باہر سے آئی۔ اس طرح سے یہ آپ کو حرکت میں ڈال دیتی ہے۔ یہ کیا ہوا؟ کسی دُوسرے نے یہ خیال دلادیا یا اندر سے پیدا ہوا۔ رامؔ واضح کرکے دکھادیگا کہ رامؔ کے سامنے یہ تجربہ ہوا۔ ایک لڑکا تھا ہپنوٹائیزڈ کیا گیا۔ اور اس سے کہا کہ "دیکھو جس وقت تو جاگ پڑے گا ہم تالی بجائیں گے۔ ساتھ ہی اس کے تُم پانی کی طرف جانا اور دریا کے پاس ایک چھڑی پڑی ہے اُسے اُٹھالینا اور ناچنا گانا۔ وہاں سے لوٹ کر آکر بیٹھ جانا۔" یہ خیال کارن شریر میں ڈالا گیا۔ جس میں وہ خیال جم گیا۔ لیکن جاگ کر وہ یہ بات بھول گیا کہ کسی نے کچھ کہا تھا۔ بھول جانے کے یہ معنے ہیں کہ جھیل کی تہ میں وہ باتیں تھیں اُسے خبر ہی نہیں رہی۔ جس وقت تہ ہلادی گئی یعنی تالی پٹی۔ مغرب کی طرف چلا اور چھڑی اُٹھالی۔ سر پر رکھی۔ ناچا گایا۔ اور واپس آکر بیٹھ گیا۔ اُس سے پُوچھا جاتا ہے یہ کیا ہے؟ ہم نے تجھے ایسی حالت (hypnotized state حالتِ بیہوشی) میں سمجھایا تھا۔ لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ میرے دِل کا

خیال تھا۔ میرا یہ جوش تھا۔ میری یہ موج تھی۔ اسی طرح اکثر ہم کام کر بیٹھتے ہیں لیکن اُس کی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ عدالت میں اکثر وجہ پُوچھی جاتی ہے۔ وہ لوگ سائیکالوجی کے اصول ہی کو نہیں جانتے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر کام کی کوئی نہ کوئی وجہ معلوم ہی ہو۔

قسمت کیا ہے؟۔ پرارَبدھ یا کرم پھل۔ کرم جس کے لفظی معنی فعل یا کام ہے۔ کیا کام وہ ہے جو جسم سے کیا جائے؟ کام کی تعریف وہ حرکت ہے جس سے من کو تعلّق ہو۔ کرم وہ ہے جس سے من کو لگاؤ ہو۔ اصلی کرم وہ خیال ہے جو عالمِ خیال کی تہ میں ہے۔ پس ہمارے خیالوں سے قسمت بنی ہُوئی ہے۔ اس کے متعلّق ایک بات غور سے سُنئے۔ ہندو کہتے ہیں کہ چوراسی لاکھ چکّر میں ہوکر انسان انسان کی ہیئت میں آیا ہے ایولیوشن (Evolution) صعودِ عالم) کا مسئلہ حد درجہ تک پُہنچا ہے۔ امریکہ میں ڈاروِن کے مسئلہ کی تشریح اعلیٰ درجہ کی کی گئی ہے۔ وہاں ایک عجائب خانہ ہے جہاں ماں کے شکم کا ایک دن کا بچّہ۔ دو دن کا بچّہ۔ تین دن کا بچہ۔ اسی طرح پر نَو مہینے تک کے بچے شیشیوں میں رکھے ہُوئے ہیں۔ آپ خیال کرکے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ پہلے مینڈک۔ مچھلی اور بندر وغیرہ کی صُورت سے وہ گُذر لیتا ہے تب انسان ہوتا ہے۔ یہ معاملہ ہے۔ نیچر نے ہم کو دکھایا ہے کہ دائرے کے اندر دائرہ ہے۔ پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک کے اندر ایک موجود ہے۔ یا دروپدی کے چیر (کپڑوں) کی طرح ساری میں ناری اور ناری میں ساری ہے۔

ایک ہی قانون ہے جو تمام پردوں کی تہوں میں چل رہا ہے۔ وُہی قانون انسان پر چلتا ہے۔ جب انسان ماں کے رحم میں آتا ہے تو ۹ ماہ کے عرصہ میں تمام حالتوں کو طے کر جاتا ہے۔ جیسے بی اے کے امتحان کے قبل لڑکے پوری کتابیں تھوڑے عرصہ میں دُہرا جاتے ہیں۔ جسم کی بناوٹ میں یہ پایا جاتا ہے کہ آپ کے کارن شریر میں پچھلے جنموں کی عادات جمع ہیں۔ یہ جو آپ سُنا کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنے تئیں مردہ بنا ڈالا ہے۔ نبض ساقط ہے۔ دِل نہیں دھڑکتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مرگیا اور پھر جی اُٹھا۔ اُس کے معنی یہ ہیں کہ مینڈک وغیرہ کے جسم میں جو عادت تھی اُس کو دُہرالیا۔ رِدّھی سِدّھی لوگ بہت کہتے ہیں۔ اُن کے پیچھے پڑنے کا نام ترقی نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرنے سے تُم اپنی حالت کو ریچھ اور مینڈک وغیرہ کی حالت میں ڈال سکتے ہو۔ جن میں اب بھی بہت قوّتیں موجود ہیں۔ جو عام میں آسان نہیں ہیں۔ دیکھو کُتّا دُور سے سُونگھ لیتا ہے۔ اگر تُم یہ قوّت حاصل کرو تو یہ کچھ ترقی نہیں ہے۔ بلکہ پچھلی بات کا دُہرانا ہے۔ چونکہ آپ کی قوّتِ خیال سب کچھ کرسکتی ہے تو رامؔ بتلائے گا کہ کس طرف خیال لگاؤ۔ شطرنج کی مثال لو۔ جب تک بعض مُہرے مارے نہ جائیں گے جیتنا ممکن نہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کامیابی حاصل کرنا ہے تو کچھ چیزوں کو چھوڑو اور کچھ چیزوں کو لو۔ اس لئے کہ شکتی یعنی قُدرت بلند آواز سے کہہ رہی ہے کہ زمانہ کے ساتھ تبدیل ہو یا برباد ہو۔ نیچر کی ہر ایک چیز سے۔ ستاروں سے۔ درختوں سے۔ پتھروں سے سبق حاصل کرسکتے ہو۔ ذرا غور سے دیکھو۔ وحشی لوگوں کو کہتے ہیں کہ عالمِ صعود یعنی

ایوولیوشن کی ترقی کے دَور میں وہ لوگ بہت پیچھے ہیں۔ لیکن رامؔ نے دیکھا ہے کہ اُن کی آنکھ میں اتنی تیزی ہے کہ میل دو میل کے فاصلے سے ہرے درخت پر ہرا طوطا دیکھ سکتے ہیں۔ پیروں میں یہ طاقت کہ ہرن کو دوڑ کر پکڑ سکتے ہیں۔ ہاتھ میں یہ طاقت کہ شیر سے بغیر ہتھیار کے لڑ سکتے ہیں لیکن تہذیب یافتہ انسان کے نہ پیر میں نہ ہاتھ میں نہ آنکھ میں ایسی طاقت ہے۔ وجہ اس کی کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ وحشی لوگ ان کو استعمال میں لاتے ہیں۔ بغیر اس کے وے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اُن کی اولاد بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ مہذّب آدمی مثل وحشی کے نہیں دوڑ سکتا ہے۔ جب جانا ہُوا گاڑی گھر پر تیّار ہے۔ امریکہ میں دو دو منٹ کے بعد ریلیں اوپر نیچے اور زمین پر چلتی ہیں۔ اس لئے امریکن کو پیروں کا استعمال کم رہتا ہے۔ ریلیں گویا اُنہیں کی بڑھی ہُوئی ٹانگیں ہیں۔ وحشی ہاتھ سے کام لیتے ہیں۔ مہذّب بجائے اُس کے ہتھیار سے۔ جب آنکھ کمزور ہوگئی اُنہوں نے عینک لگائی۔ دُوربینیں ایجاد کیں کہ دُور سے دُور کی چیزیں نظر آئیں۔ پس معلوم ہُوا کہ تہذیب یافتہ لوگوں نے ہاتھ اور پیر اور آنکھ کے مُہروں کو مروا ڈالا اور دماغ کے مُہرے کو زندہ رکھا۔ ایسے ویسے مُہرے کو پٹوانا ہی بہتر ہے۔ اگر مثل حیوانوں کے ان طاقتوں کو قائم رکھا جاتا تو زندگی وبالِ جان ہو جاتی۔ یہ دیکھئے کہ ایولیوشن (Evolution صعودِ عالم) کے درخت کی شاخیں کس طرف جا رہی ہیں! انسان کو کہتے ہیں کہ انسان تمام دُنیا کا نچوڑ ہے۔ ایک حد تک صحیح ہے۔ کیونکہ تمام دُنیا کے حالات اُس کے دماغ میں آگئے۔ تب یہ تمام دُنیا کا گیان والا انسان پیدا ہُوا۔ یہاں تک ایولیشن

کی حد ہے لیکن اب کس طرف رُخ ہے؟ دُنیا کی کارروائی کا منزلِ مقصود ہے کیا؟ ایک اور حالت آتی ہے جس میں انسان صرف ذہن سے نہیں بلکہ دِل سے ساری دُنیا کو اپنا آپ سمجھنے لگتا ہے۔ سریبرم (Sensorium) میں تمام دُنیا سما جاتی ہے۔ صرف سر و دماغ ہی نہیں بلکہ دِل و جگر، رگ و ریشہ ہر بُنِ مُو میں آپ کے سریبرم میں ساری دُنیا سما جاتی ہے۔ آپ میں وہ حالت آ جاتی ہے کہ تمام دُنیا میرا ہی جسم ہے۔ یہ چرند پرند یہ درخت یہ پہاڑ میرا ہی آتما ہے۔ اس دریا میں میری ہی رگوں کا خُون بہ رہا ہے۔ یہ سورج یہ چندرماں میری ہی آنکھیں ہیں۔ میرا ہی دِل ان سب کی چھاتیوں میں دھڑک رہا ہے۔ پیارے یہ خیال دِل سے اُڑا دو کہ تُم اور ہو۔ وہ اور ہیں۔ تُم اور ہو اور باقی مُلک کے آدمی اور ہیں۔ جو سب میں ہے وہ تُم ہو۔ جس مُلک کے لوگ اس سچّائی کو عمل میں لاتے ہیں وہی قوم باقی رہتی ہے۔ جیسے کل رام نے بتایا تھا کہ عملی طور سے جاپانیوں نے برہم ودیا پر عمل کیا۔ جو لوگ عملی طور پر دُوسروں کے آتما کو اپنا آتما مانتے ہیں وہی زندہ رہتے ہیں۔ تُمہارے بچاؤ کی یہی صورت ہے۔ آپ کے خیال کی طاقت سے علم جر ثقیل یہ قانون بتاتا ہے کہ کئی طاقتیں آپس میں مل کر کام کر رہی ہوں تو اُن طاقتوں کے حاصل کا رُجحان بڑی طاقت کی طرف ہوگا۔ جب وہ طاقت کم ہو جائے گی تو اُس سے کمزور طاقت کی طرف رُجحان ہوگا۔ ایسے ہی آپ کے اندر کا جو خیال زیادہ قوی ہے پہلے وہ عمل کرے گا۔ بعد ازاں دوسرا۔ اب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اندرونی طاقتوں کا بیرونی طاقتوں سے کیا تعلق ہے

یہ لیمپ جو جل رہا ہے ارد گرد کی ہوا سے اس میں آکسیجن کھچکر آجاتی ہے۔ جو اندرونی طاقتیں ہیں وہ کشش خاص سے باہر کی طاقتوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ جیسا خیال ہوتا ہے ویسا ہی سامان مہیا ہوجاتا ہے پازیٹو الکٹریسٹی (positive electricity) کے ساتھ نیگیٹو الکٹریسٹی (negative electricity) خود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ اِدھر لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اُدھر قدرت لڑکے بھی پیدا کرتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پھولوں میں بھی نر و مادہ ہوتے ہیں۔ دریائے گومتی کے کنارے کسی جگہ مادہ پھول ہے اور کسی جگہ نر پھول ہے۔ شہد کی مکھی کے ذریعہ سے نر پھول کا نر حصّہ مادہ پھول تک پہنچتا ہے۔ غرضیکہ جب ضرورت یا خواہش ہوتی ہے تو سامان اپنے آپ مہیا ہوجاتے ہیں۔ یہی قانون آپ کے لئے ہے۔ جیسے آپ کے اندرونی خیالات ہوں گے ویسے ہی بیرونی سامان پیدا ہوجائیں گے۔ جب ہندو مسلمانوں نے مندر مسجدوں میں یوں دُعا مانگی یا پرارتھنا کی کہ "ہم غلام ہیں۔ ہم کو نوکر راکھو جی۔ مَیں داس۔ مَیں داس۔ مَیں پاپی۔ مَیں گنَاہگار" تو قانونِ کشش کو پورا کرنے کے لئے پرکاش سروپ نوراً علیٰ نور پرمیشور نے گورے چِٹے چمکتے دمکتے مُغلوں اور انگریزوں کے نورانی بدن بناکر ہماری مُرادیں پُوری کیں۔ اور غلام بنالیا۔ اس لئے اگر غریب ہو تو اپنے بنائے ہُوئے ہو۔ اپنے ہی خیال سے اپنے کو آپ نے قید میں ڈالدیا۔ اور اپنے ہی خیال سے رہائی ہوسکتی ہے۔

پھر دیکھئے۔ کہاں تک رہائی ہے اور کہاں تک قید ہے؟ کہاں تک تدبیر اور کہاں تک تقدیر ہے؟ ریل گاڑی کی پٹری کی کیفیت ہے۔

ریل آزاد بھی ہے اور قید بھی ہے۔ آزاد تو ایسی کہ پھُر پھُر چلتی ہے۔ اور قید یوں کہ لکیر کی فقیر ہے۔ اِسی طرح آپ کے خیالوں کے ساتھ دماغ میں پٹریاں پڑ جاتی ہیں۔ اور باہر سے سازو سامان مُہیا ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ایفنیٹی (affinity تعلّق یا رشتہ) باہر کے سامان اکٹھا کرلیتی ہے۔ تو آیندہ کے لئے اُن پٹریوں پر ریل چلانا آسان ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ پورانی پٹریاں اُکھڑ سکتی ہیں۔ ریشم کے کیڑے کی مثال لو کہ آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔ یہ ریشم کے نکالنے میں آزاد ہے۔ اور جب نکال چُکا تو اُس کوے (ریشم کے خول یا غلاف) میں پھنس کر قید ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی تمہاری مثال ہے۔ کہ

ع اے روشنئ طبع تو بر من بلا شُدی

تمہاری آزادی تمہیں غُلام بنارہی ہے۔ ایک آدمی نے تمسّک لکھدیا کہ اتنے دنوں میں روپیہ ادا کردیا جاوے گا۔ روپیہ پیدا کرنے میں آزاد تھا۔ تمسّک لکھنے میں آزاد تھا۔ مگر اپنے لکھنے سے آپ قید ہوگیا۔ اسی طرح انسان اپنے فعل میں آزاد بھی ہے اور اُسی سے مقید بھی ہوتا ہے۔ وہی عمل جس کے کرنے میں وہ آزاد تھا کر چُکنے پر اس کے حق میں بندھن (قید) ہو جاتا ہے۔

تقدیر کی پابندی میں بھی تُم آزاد ہو۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر خُدا ایک ہے تو یہ کیا کہ کسی کو اُس نے اندّھا اور کسی کو لُولا پیدا کیا۔ کسی کو امیر کسی کو غریب بنایا؟ رام کہتا ہے کہ اگر خُدا اور ہو اور تُمہاری ذات اور ہو۔ تو یہ دھبہ ضرور آئے گا۔ اور اُس کے رحم میں فرق پڑے گا۔ کیونکہ اُسی باپ کے رُوبرُو ایک لڑکا پھُولوں کے

پاس ہے دُوسرا لڑکا کانٹوں میں گر رہا ہے۔ یہ کیوں؟ کیا اُس میں اتنا رحم نہیں تھا؟ اُس میں بچانے کی کیا طاقت نہیں؟ اگر خدا اور ہوتا تم اُس کے بچے ہوتے۔ تو خُدا کے اوپر بڑا فرق آسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خُدا تُم سے الگ ہی نہیں ہے۔ اگر ایک آدمی خود ہی دریا میں گرے۔ خود ہی قبر میں جاوے خود ہی پاگل خانہ کو۔ تو وہ ظلم نہیں ہے۔ وُہی خُدا اِدھر انگریز ہے۔ وہی خُدا اُدھر مسلمان ہے۔ وہی خُدا ہندو ہے۔ وُہی امیر وُہی غریب۔ وُہی جس کو تم باپ کہتے ہو بچہ بن کر ظاہر ہو رہا ہے

ایک اور بات سُنئے۔ سورج کی روشنی سب جانتے ہیں کہ سفید ہے لیکن جب روشنی کو منشُورِ مثلثی (prism) سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھوکا تھا۔ کیونکہ سات رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کیا بات؟ سات رنگ اور پھر سفید۔ وجہ معلوم ہو یا نہ ہو۔ خواہ آپ جانیں یا نہیں۔ پر یہ بات ماننی پڑے گی۔ تُم کہتے ہو کہ یہ پھُول سفید ہے یہ پھول گُلابی ہے۔ یہ پتّا ہرا ہے۔ سائنس والے کہتے ہیں یہ کچھ بھی نہیں۔ وہ ثابت کر کے دکھا دیتے ہیں۔ ایک پھُول اندھیرے میں لے جاؤ۔ پھر دیکھو۔ ویسا ہی ملایم ہے۔ خوشبُو وہی۔ ٹھنڈا بھی ویسا ہی ہے۔ پنکھڑیاں بھی اُتنی ہی ہیں۔ لیکن رنگ کہاں گیا۔ رنگ پھُول میں ہے ہی نہیں۔ وہ روشنی کا رنگ تھا۔ روشنی کے ساتھ گیا۔ پتّے میں کہتے ہو کہ سبز رنگ ہے۔ پتّہ پر ایک قسم کا مصالحہ یا قوت ہے جیسے فوٹوگراف کے پلیٹ پر ہُوا کرتی ہے۔ جس نے چھ رنگوں کو کھا لیا یا جذب کر لیا۔ لیکن ایک رنگ نہیں کھایا۔ یہی وہ رنگ ہے

جو دکھلائی دیتا ہے اور جسے سبز رنگ کہتے ہیں۔ اب دیکھئے روشنی میں سات رنگ ہیں۔ ان میں سیاہ نہیں گنا جاتا۔ کالا رنگ وہ ہے جس نے روشنی کے ساتوں رنگوں کو کھا لیا۔ سفید وہ ہے جس نے ایک رنگ کو بھی نہ لیا۔ سب تیاگ دیا۔ پیارے! دُنیا میں جتنے رنگ نظر آ رہے ہیں یہ طاقتیں یہ عقل اور یہ دانائی یہ فراست۔ یہ سب طاقتیں ایک خالقِ مُطلق ایک ہی رام کی ہیں۔ یُوں دیکھو تو سات رنگوں والا اور یُوں دیکھو تو سارے رنگ اُسی کے۔ اسی رنگ کا نام مایا ہے۔ اس دُنیا میں کہتے ہیں کہ یہ آدمی طاقتور ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ داہنا ہاتھ زیادہ طاقتور ہے۔ وہ اس لئے طاقتور ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کی طاقت کو تیاگتا رہتا ہے یعنی صرف کرتا رہتا ہے۔ پھُول جس رنگ کو تیاگتا ہے وُہی رنگ اُس کا ہوتا ہے۔ پیارے جس چیز کو تُم تیاگو گے وُہی تُمہارے پاس آوے گی۔ جس شئے سے استغنا کرو گے وہی حاضر ہوگی۔ سُورج کی روشنی میں اگر تُم سایہ کا پیچھا کرو گے تو وہ تُمہارے آگے آگے بھاگے گا۔ اور جس وقت تُم اُسے تیاگتے ہو۔ یعنی سُورج کی طرف مُنہ کرکے دَوڑتے ہو۔ تو وہ تُم کو پکڑنے دوڑتا ہے۔ گذشت از مطلب تمام شُد مطلب (مطلب ترک ہوتے ہی مطلب پورا ہوتا ہے) جس رنگ کو کھاتے ہو وہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اور جس کو تیاگتے ہو وہ تمہارا ہو جاتا ہے۔ جس وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ تمہاری عزّت ہو تو اُس وقت عزت نہیں ہوتی۔ جب تم دوسروں کی عزّت کرتے ہو تو تُمہاری خود بخود عزّت ہوتی ہے۔ جس وقت لوگوں کو پیار دیتے ہو تو چاروں طرف سے محبّت تمہاری طرف

دوڑی ہُوئی آتی ہے۔ کالے وہ ہیں جنہوں نے تمام رنگوں کو اپنی انانیت میں جذب کر لیا اور کہا "مَیں اَور ہُوں وہ اَور ہے" جیسے وہ خود غرضی والا لڑکا جس کا میں نے کل ذکر کیا تھا اور جس نے جاپان میں کتاب کا ورق چُرایا تھا۔ اور گورے وہ ہیں جن کا عمل تیاگ۔ تیاگ۔ تیاگ پر ہے۔ جن کا بیان یہ ہے۔ کہ میرا رنگ سب کے رنگ۔ میری جان سب کی جان۔ مال میرا سب کا مال۔ میرا جسم سب کا جسم۔ میرا علم سب کا علم۔ میرا گیان سب کا گیان۔ جو آدمی تمام رنگوں کو تیاگتا ہے۔ اُس کا آتما سب کا آتما ہے جسے پھر نہ کچھ جُستجو ہے نہ کچھ آرزُو ہے بلکہ جس کے لئے

ؔ آرزو بھی وصالِ پردہ ہے
آرزُو ہے کہ آرزُو نہ رہے
جستجو بھی حجابِ حسنی ہے
جُستجو ہے کہ جُستجو نہ رہے
تُو کو اِتنا مٹا کہ تُو نہ رہے
اور تجھ میں دُوئی کی بُو نہ رہے

اوم

———•❊•———

اُنّتی کا مارگ
یا
راہِ ترّقی

(یہ لیکچر غازی پور میں ستمبر ۱۹۰۵ء کو دیا گیا تھا)

لیکچر شروع کرنے سے پیشتر رام آپ کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ self respect (سیلف ریسپیکٹ) آتم پُوجا۔ اپنی قدر (خود داری) ان الفاظ کے کیا معنی ہیں۔ لوگوں نے ان کو غلط سمجھ رکھا ہے اگر self (سیلف) کے محدود معنی سمجھو۔ اور اس کو صرف اپنا جسم اپنی شخصیت (Individuality) ہی سمجھو۔ تو آتم پُوجا۔ سیلف رسپکٹ کے معنی غرُور اور خود ستائی کے ہیں۔ جو گُناہ ہے۔ اگر سیلف کا مطلب ذاتِ خُدا سمجھا جائے تو سیلف ریسپکٹ سے بڑھ کر کوئی پُن نہیں ہو سکتا ہے۔ رام آپ لوگوں سے چاہتا ہے کہ لیکچر شروع کرنے سے پہلے اپنے خیالات کو یکجا کیجئے۔ یعنی ایکاگرتا سے کام لیجئے۔ اور خوب غور سے سُنئے۔ آپ ذاتِ باری ہیں۔ اور جب آپ وہ لا انتہا ذات ہیں۔ تو آپ میں محدود دُنیاوی خیالات کا ہونا بجائے خود غلط ہے

ایک راجہ کا پُتر کسی خراب کام میں مصروف ہے۔ اپنے نوکروں میں بیٹھتا ہے۔ یا کسی کو فحش گالی دیتا ہے۔ اور اُس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم یہ کیا کر رہے ہو۔ یہ تمہارے شایان شان نہیں ہے۔ تم راجہ کے پُتر ہو کر ان پنچ لوگوں میں بیٹھتے ہو۔ اور ایسی گالیاں اپنی زبان پر لاتے ہو۔ وہ فوراً اپنی اصلی حالت معلوم کر کے اپنے فعل پر نادم ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ اپنی ذات کا دھیان کیجئے۔ آپ کی ذات تو پرمیشور ہے۔ وہ ذات تو ترلوک کے آنند دینے والی ہے۔ سورج کو سونا اور چاند کو چاندی دینے والی ہے۔ پس آپ بھی اُس لڑکے کی طرح اپنے افعال پر نادم ہوں۔ اور ان دُنیاوی چیزوں پر اس قدر ملتفت نہ ہوں۔ اپنی ذات کو جانیں اور سمجھیں۔ دیکھو تمہارا گائیتری منتر تم کو کیا سکھاتا ہے۔ رام اس منتر کو نہیں پڑھے گا۔ صرف اُس کا نشا بتلائے گا۔ وہ یہ ہے:۔ میری بُدھی (عقل) کو جو روشن کرتا ہے۔ وہ سورج چاند اور تاروں کو روشنی دینے والا ہے۔ وہ میری ہی آتما ہے۔ پس جب یہ بات ہے تو رام کہتا ہے۔ کہ وہ لوگ جو ابھید وادی ہیں۔ وہ اپنی ابھید درشٹی کو قائم رکھ کے اور وہ جو بھید وادی ہیں وہ اپنی بھید درشٹی کو قائم کر کے اُس جوتی سروپ کا دھیان کریں۔ وہ دھیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ جو ظاہری نور کا چشمہ ہے۔ اور جو نورِ عقل کا منبع ہے۔ وہ میرے ہردے میں ہے۔ میرے ہردے میں وہ دیپک جل رہا ہے۔ میرے ہردے میں وہ روشنی پرکاشمان ہے۔ اب رام آج کے مضمون پر آتا ہے۔ وہ مضمون یہ ہے۔

اُنّتی کا مارگ یا راہِ ترقی

یہ مضمون نہایت وسیع ہے۔ اس لئے اس کے صرف ایک آدھ ضروری حصوں پر رام بولے گا۔ عام طور سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں۔ کہ یہ ترقی ترقی پکارنے والے کہاں سے آگئے۔ ارے میاں! اپنے گھر رہنے اور عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے میں آرام ہے یا ترقی ترقی کا دردِ سر مول لینے میں؟ لوگوں کی زبان پر یہی ہے۔ کہ ہم کو یہیں رہنے دو۔ ہم آگے نہیں جانا چاہتے۔ اسی پر وہ عملی برتاؤ بھی کرتے ہیں۔ اور اُن کا قول ہے۔

بہ قدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را
دویدن رفتن۔ ایستادن نشستن خفتن و مردن

لیکن یہ راحت کیا چیز ہے۔ یہ تو عارضی ہے۔ کوئی حالت قائم نہیں رہ سکتی۔ کبھی تو خفتن کی حالت ختم ہوگی۔ پس اُس کے بعد راحت کا خاتمہ ہے۔ سب سے زیادہ آنند تو وہاں ہوگا۔ کہ جب ایسی موت آوے۔ کہ پھر مرنے کی نوبت نہ آوے۔ ایسے سُستی پرست مہاتاؤں کو رام ایک نیچر کا قانون بتلاتا ہے — Law of Evolution قانونِ ارتقاء ہم کو یہ اُپدیش دیتا ہے کہ "move on or die آگے بڑھو۔ یا مرو"۔ جو کوئی آگے بڑھنے سے انکار کریگا وہ کُچلا جائے گا۔ مرجائے گا۔ اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ دُنیا میں جس قدر مخلوق ہیں۔ سب کے حالات پر غور کرنے سے

یہی قانون معلوم ہوتا ہے۔ کہ آگے بڑھو۔ معدنیات۔ نباتات۔ حیوانات سب جگہ اسی قانون کا سکّہ ہے۔ وحشی اقوام اور حیوانات کے حالات پڑھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے خون کے ہر ایک قطرہ پر لکھ دیا گیا ہے۔ کہ آگے بڑھو۔ کہا گیا ہے۔ اور سچ کہا گیا ہے۔ کہ ترقی (evolution) جنگ و جدل سے اور تکلیف اُٹھانے سے ہوتی ہے۔ جو محنت و کوشش نہ کرے گا۔ وہ خراب ہوگا۔ اور کُچلا جائے گا۔ جس طرح ایک گاڑی میں گھوڑا جوتا جاتا ہے۔ اُس کا کام ہے کہ گاڑی کو کھینچ کر آگے لیجاوے۔ اگر وہ نہ چلے۔ اور رُک جاوے تو کوچبان اُسپر چابک پر چابک مارتا ہے۔ یہی حال افراد اور اقوام کا ہے۔

جو شخص یا جو قوم آگے چلنے سے انکار کرتی ہے اُس کو پرکرتی یعنی (Providence) یا قوانینِ قُدرت چابک مارتے ہیں۔ یہ قانون اٹل ہے۔ اس کے برتنے میں کبھی رعایت نہیں ہوسکتی۔ پرمیشور کو کسی قوم یا ملّت کا لحاظ نہیں ہے جو کوئی اُس کے قانون کے موافق چلتا ہے۔ وہ اُس کا پیارا ہے۔ وہ بچتا ہے۔ لیکن جو اُس کے قانون کو توڑتا ہے۔ وہ اُس کا دشمن ہے۔ وہ مرتا ہے اور خراب ہوتا ہے۔ ذرا دیکھو تو۔ اگر تُم دُنیاوی گورنمنٹ کے قوانین کی خلاف ورزی کرو تو فوراً سزایاب ہوگے۔ کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ جب دُنیاوی گورنمنٹ کے قوانین کی خلاف ورزی کا یہ حال ہے۔ تو بھلا پرمیشور کے قوانین کے خلاف چلنا اور بچنے کی اُمید کرنا محض بے عقلی ہے۔ دھرم شاستر کے موافق بھی آگے بڑھنے سے انکار کرنے ہی کا نام پاپ ہے۔ اس کو

تموگن کہتے ہیں۔

علم طبعیات ہم کو سکھاتا ہے کہ قوانینِ حرکت میں سے ایک قانون کا نام Law of Inertia (قانون سکون یا جڑتا کا قانون) ہے۔ اپنی حالت بدلنے سے انکار کرنے کو جڑتا کہتے ہیں۔ ہر ایک چیز میں یہ خاصیت یا اثر ہے۔ کہ وہ اپنی حالت بدلنا نہیں چاہتی۔ یہی سستی یا جڑتا ہے۔ ہمارے شاستروں میں energy (محنت یا طاقت) سے شونیہ ہونے کو تموگن کہتے ہیں۔ یہ قانون تشریح کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے اگر ایک چیز کو حالتِ سکون میں رکھا جاوے۔ تو وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گی اور جب تک اُس پر کوئی چیتن چیز عمل نہ کرے۔ اُس وقت تک وہ اپنی حالتِ سکون تبدیل نہیں کرے گی۔ اسی طرح اگر ایک چیز کو حرکت کی حالت میں رکھا جاوے۔ تو وہ برابر اُسی حالت میں رہے گی۔ اور جب تک کوئی چیتن چیز اُس پر عمل نہ کرے اُس وقت تک وہ اس حالتِ حرکت کو تبدیل نہیں کرے گی۔ اس کو قانونِ سکون کہتے ہیں۔ پس آگے نہ بڑھنا۔ یا یوں کہئے کہ اپنی حالت کو تبدیل نہ کرنا جڑتا ہے۔ تموگن ہے۔ یعنی پاپ ہے۔ ایک دوسرا قانون Law of acceleration (قانونِ حرکتِ متزاید) ہے۔ اُس سے رجوگن ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی وہ حالت ہے۔ کہ جب جڑتا کے اوپر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور آگے بڑھنے یا حالت تبدیل کرنے کا خیال اور اُس کی طاقت آجاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ انسان تو ذاتِ لا انتہا ہے۔

اُس میں یہ گُناہ کہاں سے آیا۔ اس کا جواب بعض یُوں دیتے ہیں۔ کہ اوّل گُناہ حضرت آدم نے کیا تھا۔ اور اس میں سے ہم کو یہ وِرثہ میں ملا۔ رام اس مسئلہ پر اس طریقہ سے بحث نہیں کرے گا۔ رام آپ کو بتلائے گا۔ کہ ذرا ہندو فلاسفی کی طرف غور کرو۔ اور دیکھو کہ اُس نے کیا سکھایا ہے۔ یہاں پر تناسخ کا مسئلہ آجاتا ہے۔ جو سچ ہے اور جو بذاتِ خود ایک علیحدہ لیکچر کے واسطے مضمون ہے۔ رام اس وقت اُس پر کچھ نہیں بولے گا۔ ہم کو ہندو فلسفہ یہ سکھاتا ہے۔ کہ انسان چوراسی لاکھ یونی میں پھر کر آیا ہے۔ سائنس کا بھی یہ ایک طے شُدہ مسئلہ ہے۔ کہ انسان سب سے بعد کو پیدا ہُوا۔ Geology (علم طبقات الارض) اور Archaeology (علم اشیائے قدیم) وغیرہ سے اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ Embryology (علم جنین در رحم) بھی اس کو ثابت کرتی ہے۔ یہ ایک نیا علم ہے۔ جس کو ہیکل (Haeckel) نے ایجاد کیا ہے۔ اس علم کے عملی تجربوں سے بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ کہ انسان سب سے بعد کو آیا۔ رام خود ایک عجائب خانہ میں گیا۔ اُس میں دیکھا۔ کہ رحم کے اندر کے ایک دن۔ دو دن۔ تین دن۔ پانچ دن۔ اسی طرح پر مہینے دو مہینے تک کے بچے شیشوں کے اندر سپرٹ میں رکھے ہُوئے تھے۔ ان سب سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ماں کے پیٹ میں جنین کی کیا حالت ہوتی ہے۔ وہ مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یعنی مچھلی۔ مینڈک۔ کُتا۔ بندر وغیرہ وغیرہ حالتوں میں ہوکر اس کے بعد انسان کی حالت قبُول کرتا ہے۔ پس صاف ثابت ہے۔ کہ انسان دُنیا میں سب سے بعد کو

آیا۔ اور چونکہ وہ حیوانی حالتوں کو چھوڑ کر آیا ہے۔ اس لئے اُس میں ابھی حیوانی جذبات (animal passion، تموگن) باقی ہیں۔ اس لئے اُس میں گُناہ پائے جاتے ہیں۔ گُناہ یا ثواب۔ پاپ یا پُن relative (نسبتی) الفاظ ہیں۔ جو چیز ایک حالت میں عذاب ہے۔ وہ دُوسری حالت میں ثواب ہے۔ مثلاً جو چیز گرہست کے لئے پاپ نہیں ہے وہ سنیاسی کے لئے پاپ ہے۔ بچے کے لئے جو پُن ہے وہ بُوڑھے کے لئے پاپ ہے۔ چوتھی جماعت کا ایک لڑکا اپنی جماعت کی کتابوں کو پڑھتا ہے۔ وہ اُس کے لئے پُن ہے۔ لیکن اگر ایم۔ اے کلاس کا ایک طالب علم اپنی کتابیں چھوڑ کر چوتھی جماعت کی کتابیں پڑھے تو وہ اُس کے لئے پاپ ہے۔ ایف اے کلاس سے ترقی پاکر بی اے کلاس میں پڑھنا پُن ہے۔ لیکن بی۔ اے میں پاس ہوکر پھر بی۔ اے میں پڑھنا پاپ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ پاپ کی جڑ یا بُنیاد یہ ہے کہ ایک حالت سے آگے نہ بڑھنا۔ ترقی نہ کرنا۔ اسی طرح جو باتیں حیوانوں میں موجود تھیں۔ اور اُن کے لئے پاپ نہ تھیں۔ لیکن انسانی حالت میں آنے سے وہ مبدّل بہ گُناہ ہوگئیں۔ حیوانی قالبوں کو چھوڑنے کے بعد انسان انسانی حالت میں آتا ہے۔ لیکن اُس میں حیوانی جذبہ (animal passion) باقی رہتا ہے۔ اگر اُس وقت وہ اِس عقل سے جو اُس کو حیوانات سے تمیز کرنے کے واسطے دی گئی ہے کام نہ لے۔ اور اُس پر غور نہ کرے۔ کہ کیا

اُس کے واسطے پُن ہے اور کیا پاپ ہے۔ تو وہ قانونِ سکون (Law of Inertia) کے مطابق جڑ ہے کیونکہ وہ اپنی حالت تبدیل کرنا نہیں چاہتا ہے۔ وہ اُن کی باتوں کو جو اُس میں حیوانی قالبوں کی ابھی باقی ہیں جیوں کی تیوں رہنے دینا چاہتا ہے۔ اور عقل کی روشنی سے مستفیض ہوکر آگے نہیں بڑھنا چاہتا ہے۔

پس جو شخص آگے بڑھنے کے واسطے طیّار نہیں ہے۔ وہ گُناہ کرتا ہے۔ یہی گُناہ کی اصلیت ہے۔ اور یہی ذریعہ ہے جس سے گُناہ انسان میں آتا ہے

تُمہاری بائیسکل کا پہیّہ گھُوم رہا ہے۔ اور تُمہارا کُتّا اُس کے آگے آگے دوڑتا چلا جا رہا ہے۔ اگر وہ برابر چلا جائے گا۔ تو اس کو کوئی صدمہ تمہاری بائیسکل کے پہیّہ سے نہیں پہُنچے گا۔ لیکن اگر وہ رُک جائے۔ یا تُمہاری بائیسکل کی رفتار کی بہ نسبت اپنی رفتار کم کردے۔ تو وہ ضرور پہیّہ کے نیچے دب جائے گا۔ ہاں ایک ذریعہ اُس کے بچانے کا یہ بھی ہے۔ کہ تُم خود اپنی بائیسکل کو روک دو + اسی طرح پر زمانہ کا پہیّہ چکر لگا رہا ہے۔ اُس کے ساتھ ساتھ دوڑو تو خیر ہے۔ ورنہ اُس کے نیچے دب کر مرنا مجبوری و لازمی ہے۔ یہاں ایک دِقّت اور بھی ہے کہ پرمیشور اپنے پہیّہ کو نہیں روکے گا۔ اُس کے قانُون اٹل ہیں۔ وہ ہمیشہ جاری ہیں۔ وہاں کسی کا پاس یا لحاظ نہیں ہے۔ پس ترقّی کرو۔ ورنہ کُچلے جاؤ گے۔ پِس جاؤگے۔ اور تباہ ہوجاؤگے۔ وُہی قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ جو آگے نہیں چلتی ہیں۔ جو

ہمیشہ پیچھے ہی کو قدم ہٹاتی ہیں۔ جو Originality اور Innovation کو پاپ قرار دیتی ہیں۔ رامؔ ان الفاظ کی تشریح نہیں کرے گا۔ ان کا مطلب تم خود سمجھ گئے ہوگے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ ترقّی کے معنی کوشش اور پُرشارتھ کے ہیں۔

اس پر یہ سوال ہوتا ہے۔ کہ یہ صحیح ہے۔ کہ ترقّی کے معنی کوشش کے ہیں۔ لیکن کوشش سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہر چیز پراربدھ کے آدھین ہے۔ یعنی قسمت پر منحصر ہے۔ یہ مضمون خود ایسا ہے۔ کہ اس پر ایک علیٰحدہ لیکچر دیا جائے۔ لیکن مختصراً جواب یہ ہے۔

اصل تو یہ ہے۔ کہ جو لوگ کہتے ہیں۔ کہ ہر کام قسمت سے ہوتا ہے۔ وہ بھی سچ کہتے ہیں۔ مگر وہ اس اصول کو (apply عائد) کرنے میں غلطی کرتے ہیں۔ مثلاً جیسا موسم ہوگا۔ ویسا سُبھاؤ ہو جائے گا۔ جاڑے کے موسم میں گرم کپڑا پہنوگے۔ مکان کے اندر رہوگے۔ آگ جلاؤگے۔ وغیرہ وغیرہ۔ گرمی کے موسم میں میدان میں رہوگے۔ ٹھنڈے کپڑے پہنوگے۔ ٹھنڈا پانی پیوگے وغیرہ وغیرہ

اب موسم کا بدلنا دیو اِچھا یا تقدیر یا قسمت ہے۔ یعنی وہ ایک مقرّرہ چیز ہے۔ اور یہ تقدیر سارے مُلک پر حاوی ہے۔ لیکن موسم کے مطابق کپڑے پہننا اور اُس کے مطابق عادات ڈالنا اپنے ہی پُرشارتھ پر منحصر ہے۔ تبدیلیٔ موسم کی حالت اس میں کچھ نہیں کر سکتی۔ چور چوری کرتا ہے۔ طالب علم پڑھتا ہے۔ جج مقدمات فیصل کرتا ہے۔ یہ سب لوگ اپنا اپنا کام سُورج کی مدد سے کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں کام کرنے کی طاقت اناج کھانے سے آتی ہے۔ اناج سُورج کی روشنی

اور قوت کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح پر وہی سُورج کا تیج ان لوگوں
میں آکر کام کرتا ہے۔ دیپک کی روشنی میں بھی تو وہی نُور ہے جو اس
نے سُورج سے اُدھار لیا ہے۔ پس ظاہر ہے۔ کہ در اصل ان سب
کے کاموں کا کرنے والا سُورج ہے۔ لیکن کیا بات ہے۔ کہ سُورج کو
کوئی چوری کا الزام نہیں لگاتا۔ وہ کیوں نہیں ملزم قرار دیا جاتا؟
وجہ یہ ہے کہ سورج جزوِ مشترک (common factor)
ہے۔ کیونکہ اُس نے وکیل مُدعی اور جج کو بھی اُسی طرح پر طاقت
دی ہے۔ جس طرح پر کہ اُس نے چور کو طاقت دی ہے۔ بیوہار میں
جزوِ مشترک نکال دیا جاتا ہے۔ جس طرح جبر مقابلہ میں ا-ب=ج-
ب کے معنی ا=ج ہیں یعنی ب جو جُزو مشترک تھا خارج کر دیا گیا۔
اور اس مساوات میں کوئی فرق بھی نہیں آیا۔ اسی طرح پر فرض
کرو۔ کہ ایک آدمی دُوسرے کے دھکے سے گر پڑا۔ تو در اصل
اُس کے گرنے کا باعث قانونِ ثقل ہے۔ لیکن وہ اُس قانون سے
نہیں لڑے گا۔ وہ تو اُس دھکہ دینے والے کو پکڑے گا۔ پس ہر
انسان میں کچھ حصہ متحرک (variable) ہے اور کچھ حصہ
ساکن (invariable) ہے۔ ساکن حصہ تو قسمت ہے۔ اور
متحرک حصہ پُرشارتھ ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ ان دونوں میں
کوئی تعلق بھی ہے۔ یا ایک دُوسرے سے بالکل لاتعلق اور بیواسطہ
ہے۔ رامؔ اِس کو بیوہارک درشٹی سے آپ کے رُوبرو پیش کر رہا ہے۔
ان میں ایک خاص تعلق ہے۔ آپ کی قسمت آپ ہی کی بنائی
ہُوئی ہے۔ اگر پرشارتھ کوئی چیز نہیں ہے۔ تو مذہبی کتابوں میں امر

وِدھی یعنی بِدھی اور نشیدھ کیوں سکھایا گیا ہے۔ اسی کے واسطے کہا ہے

؎ درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ؛
بازمیگوئی کہ دامن تر مکُن ہُشیار باش

مذہبی کتابوں کے دیکھنے سے چاہے وہ مسلمان۔ ہندو یا عیسائی مذہب کی ہوں۔ یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اُنھوں نے تمہارے اندر پُرشارتھ کا ایک جُزو پایا ہے۔

اب رام دونوں کا تعلق دکھاتا ہے۔ ریل گاڑی پٹری کو چھوڑ کر اِدھر یا اُدھر نہیں جا سکتی ہے۔ پٹری اُس کی قسمت ہے۔ لیکن چلنے میں وہ خود مختار ہے۔ یہ اس کا پُرشارتھ ہے۔ لیکن ریل جاری ہونے سے پہلے پٹری بھی ریل والوں کے اختیار میں تھی۔ اسی طرح ایک شخص ایک غریب کے ہاں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اُس کے والدین کھانے تک کو محتاج ہیں۔ وہ اس کی معمولی پرورش بھی نہیں کر سکتے۔ ایک دُوسرا شخص کسی امیر کے ہاں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں ہر طرح کے ناز و نعمت میں پلتا ہے۔ ایک لڑکا کسی عالم کے ہاں پیدا ہوتا ہے اور دُوسرا کسی جاہلِ مُطلق کے ہاں جنم لیتا ہے۔ یہ تو ریل کی پٹری کی طرح اُس کی قسمت ہے۔ لیکن اس میں پُرشارتھ کا بھی حصّہ ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنی حالت کو سنبھال سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ قسمت کی پٹری اُنہیں کے پُرشارتھ کے مطابق بنائی جاتی ہے۔ دیکھو! مکڑی اپنے مُنہ سے تار نکالتی ہے۔ اور اُس کے بعد اُسی پر چلتی ہے۔ اب وہ کسی دوسری طرف نہیں جا سکتی۔ اگر وہ کسی دوسری طرف جانا چاہے۔ تو پھر اپنے مُنہ سے تار نکالے۔ اور اُسکو

اُسی جانب لے جاوے۔ تب اُس جانب بھی جاسکتی ہے۔ تار نکلنے سے پہلے وہ اس کا پرشارتھ تھا۔ لیکن نکلنے کے بعد وہ اس کی تقدیر بن گیا۔ اب اس کو بجز اس پر چلنے کے دُوسرا چارہ نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ تار نکالنے سے پیشتر اس کے اختیار میں تھا کہ کسی جانب اس کو لیجاوے۔ یعنی اپنی تقدیر کا بنانا اُس کے اختیار میں تھا۔ لیکن جب ایک مرتبہ بن گئی۔ پھر اُس کے تبدیل کرنے کے واسطے پھر وُہی کُل کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ جو ایک مرتبہ کرچُکی ہے۔ ریشم کے کیڑے کی حالت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ایک اور مثال لیجئے۔ فرض کیجئے۔ کہ ایک آدمی دستاویز لکھنا چاہتا ہے۔ یعنی کچھ پُرشارتھ کرنا چاہتا ہے اب اس پُرشارتھ کے وقت اس کو اختیار ہے۔ کہ کرے یا نہ کرے۔ یعنی دستاویز لکھے یا نہ لکھے۔ یا جو شرائط چاہے لکھے۔ لیکن جب ایک مرتبہ لکھ چُکا۔ تو پھر پابند ہوگیا۔ وہ اس کی تقدیر ہوگئی۔ اب بجز شرائط کی پابندی کے دُوسرا کوئی چارہ نہیں ہے۔

ع یارِ من خود کردہ را علاجے نیست

ع کردنی خویش و آمدنی پیش ؛

ے ہیں خطِ تقدیر سے یہ خطِ پیشانیاں

پیش آتی ہیں وُہی جو کہ ہیں پیش آنیاں

یوگ بششٹ میں لکھا ہے۔ پُرشارتھ (ہمّت) ہی سے کارج کی سِدھی ہوتی ہے۔ تمام عقلمند لوگوں کے فعل ہمّت ہی سے سرزد ہوتے ہیں۔ قسمت کا لفظ تو صرف اُن لوگوں کے آنسو پونچھنے کے واسطے بنایا گیا تھا۔ جو نازک دِل ہیں اور جن پر کوئی مصیبت آپڑی ہے

ورنہ روز مرہ کی زندگی کے کل کام ہمّت ہی سے ہو سکتے ہیں۔ انسان کھانا بھی ہمّت ہی سے کھاتا ہے۔ پانی بھی ہمّت ہی سے پیتا ہے۔ نوکری بھی ہمت ہی سے کرتا ہے۔ کوئی پبلک کام بھی ہمت ہی سے کرتا ہے

اس تمہید کے بعد ضروری ترقّی کو کامیابی کے ساتھ کرنے کے طریقے رام بتاتا ہے۔ اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل کرنے کے واسطے ان باتوں کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

(۱) دُنیاوی کاروبار کے واسطے سب سے پہلی چیز روشنی ہے۔ کیسا ہی صاف سُتھرا مکان کیوں نہ ہو۔ اگر اندھیرے میں جاؤگے۔ تو کہیں کُرسی کی چوٹ لگے گی۔ کہیں دیوار سے سر ٹکرائے گا۔ کہیں لمپ سے ٹھوکر لگے گی اور وہ ٹوٹ جائے گا۔ غرضیکہ ہر قدم پر دُکھ ہی دُکھ ہوگا۔ پھر بلا روشنی کے کوئی چیز اُگ نہیں سکتی۔ ایک پودا اندھیرے میں بویا جائے۔ اور دُوسرا روشنی میں۔ اور دونوں کی پرداشت ایک ہی طرح کی جائے۔ نتیجہ کیا ہوگا۔ صاف ہے کہ اندھیرے میں بویا ہُوا پودا سُوکھ جائے گا۔ اور روشنی والا خُوب ہرا بھرا ہوتا چلا جائے گا۔ پھر جب بغیر روشنی کے پودے نہیں ترقّی کر سکتے ہیں۔ تو آدمی کا ترقی کرنا تو درکنار ہے۔ اب روشنی سے مُراد کیا ہے۔ وُہی دھیان جس کا ذکر رام لیکچر کے آغاز میں بتا آیا ہے۔ وُہی نوراً علیٰ نور۔ جُوتی سروپ آتم دیو۔ اُس کا نہ بھُولنا اسی کا نام روشنی ہے۔ آپ اس پر شاید کہوگے۔ کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔ دُنیا میں ہزاروں ناستک ہوتے ہیں۔ کیا اُنھوں نے کوئی ترقّی نہیں کی ہے۔ رام کا جواب یہ ہے۔ کہ یہ نامور بزرگ جن کو آپ ناستک کہتے ہیں۔ اور جو بڑے بڑے کام کر گئے ہیں۔ مثلاً

Herbert Spencer, Spinoza & Huxley

(ہربرٹ سپنسر۔ سپائنوزہ۔ ہکسلے) مان بھی لیجئے۔ کہ یہ لوگ ناستک تھے۔ لیکن عملی طور پر اُن کی ترقی کا باعث اُن کی خُدا روی اور اُن کی خُدا پرستی ہے۔ ان لوگوں کی سوانح عمریاں پڑھئے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ گو وہ ہمارے بنائے ہوئے خُدا کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن وہ خُدا کی سپرٹ (Spirit) کو اپنے رگ و ریشہ میں رکھتے تھے۔

ایک راجہ کے یہاں دو نوکر ہیں۔ ان میں سے ایک تو راجہ کی خُوب خوشامد کرتا ہے۔ لیکن کام کچھ نہیں کرتا ہے۔ اور دُوسرا راجہ کی خوشامد سے کچھ کام نہیں رکھتا۔ صرف اپنا فرض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ راجہ کس سے خوش ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ کام کرنے والے سے خوش ہوگا۔ کام پیارا ہے چام نہیں پیارا۔ بس یہی حال اُن ناستکوں کا ہے۔ اُنھوں نے مالا نہیں جپی۔ اُنھوں نے ماتھا نہیں رگڑا۔ لیکن اُنھوں نے اپنے آچرن سے خُدا کی پرستش کی۔ ان کا ہر فعل مالا کا ایک دانہ تھا۔ اور اُن کی زندگی ایک مالا تھی۔

رام آپ سے یہ نہیں کہتا۔ کہ آپ ناستک ہو جائیے۔ آپ درشن بھی کیجئے اور کام بھی کیجئے لیکن ناستکوں کی طرح ہر شخص عمل نہیں کرسکتا۔ خالی گیان یوگ سے نہیں ترقی کرسکتا۔ سہارے کی ضرورت ہے۔ Personal god (ساکار ایشور) کا ماننا اس سہارے کی ضرورت کی وجہ سے ہے۔ پس اُن لوگوں کو جو بلا سہارے کے نہیں چل سکتے۔ یہ چاہیئے۔ کہ روز مرہ بلا ناغہ رُوحانی غذا کھائیں۔ اُس سے اُن کو بڑی مدد ملے گی۔ وہ رُوحانی غذا کیا ہے۔ دھیان۔ بھجن۔ پرستش۔ کرامول (Cromwell)

بابر۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بابت لکھا ہے۔ کہ جب یہ کوئی مہم شروع کرتے تھے۔ تو اپنے تن۔ من۔ دھن کو پرماتما کے ارپن کرکے پرارتھنا کے ساتھ کام کا آغاز کرتے تھے۔ اور کامیاب ہوتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کے واسطے کہا ہے

ع دولت غلام من شُد و اقبال چاکرم

سہ باندھے ہوئے ہاتھوں کو بامید اجابت؛
ہیں رہتے کھڑے سینکڑوں مضموں مرے آگے

لیکن پرارتھنا میں دو جُزو ہیں۔ ایک مانگنا اور دُوسرا ارپن کرنا۔ مانگنے کا جُزو خود غرضی ہے۔ ارپن کرنا یہی اصل جُزو پرارتھنا کا ہے۔ یہی communion with God (وصلِ حق) ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو فعل کیا جاتا ہے۔ وہ خُدا کے لئے کیا جاتا ہے۔ سمرپن کے معنی دِل میں نُور کا رکھنا ہے اور یہی اصل پرارتھنا ہے۔ جو شخص اپنے دِل کو منفی (negative یعنی نُور سے خالی) حالت میں رکھتا ہے۔ یعنی جو ہمیشہ خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے۔ اُس کے کاموں میں بڑا ہرج ہوتا ہے۔ اور ایسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ کامیاب وُہی ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ خندہ پیشانی اور ہنس مُکھ رہتے ہیں۔ غمناک لوگوں کی ترقی نہیں ہوسکتی ہے جیسی تُمھارے اندر کی حالت ہوگی۔ ویسی ہی تمہاری کامیابیاں ہوں گی۔ مثل مشہور ہے۔ گھر سے جاؤ کھائے کے۔ باہر مِلے پکائے کے۔ گھر سے جاؤ بھُوکے۔ باہر ملیں دھکّے؛

اگر آپ پرمیشور کی بھگتی دھن یا اولاد کی غرض سے کرتے ہیں

تو وہ پرمیشور کی بھگتی نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو اپنی خود غرضی کی بھگتی ہے آپ در اصل پرمیشور کی بھگتی نہیں کرتے۔ بلکہ اُس کو اپنا خانساماں بناتے ہیں۔ کہ وہ ہر وقت آپ کی خدمت کو موجود رہے۔ اور جب جس چیز کی آپ کو ضرورت ہو۔ اُس کو وہ فوراً آپ کے سامنے حاضر کرتا رہے۔

ہائے! یہ تو اُلٹی گنگا بہانا ہے۔ پیارے پرمیشور کو اپنی خواہشات نفسانی کے واسطے مت نچاؤ۔ تُم کو چاہئے کہ ہر کام کو ہمت اور شانتی کے ساتھ کرو۔ یہی ذریعہ کامیابی کا ہے۔ اگر تُمہارے پاس کوئی شخص بھیک مانگنے آئے۔ تو تُم اُس سے آنکھ چُراتے ہو۔ اُسی طرح جب پرمیشور کے پاس بھکاری بن کر جاؤ گے تو وہ بھی تُم سے آنکھ چُرائے گا۔ پرمیشور سے صفائی دل اور بھگتی کے ساتھ ملو۔ اگر تُمہارے یہاں کوئی بڑا آدمی آجائے۔ تو تُم اُس کو بڑے آدر سے بٹھا لیتے ہو۔ لیکن ایک منگتا اور بیکس تُمہارے پاس آکر بیٹھنا چاہے۔ تو تُم اُس سے گریز کرتے ہو۔ یاد رکھو۔ کہ یہ آتما کمزور سے نہیں ملنا چاہتا ہے۔

नायं आत्मा बलहीनेन लभ्य:।

کمزور کی پرمیشور کے گھر دال نہیں گلتی ہے۔ بقول

ہر دیدہ جلوہ گاہِ آں ماہ پارا نیست

تُم اس کی فکر نہ کرو۔ کہ تُمہاری ضروریات کہاں سے پُوری ہونگی رام تُم کو وہ قانونِ قُدرت بتلاتا ہے۔ جس سے ہر شخص کی ضرورت کی چیز اُس کے پاس خود بخود پہنچ جاتی ہے۔ Law of Affinity جس کو قانون کششِ کیمیائی کہتے ہیں۔ یہ قانون قُدرت ہے۔ جس کے

بموجب جلتے ہوئے چراغ کے واسطے آکسیجن کُرۂ باد میں سے مہیّا کیا جاتا ہے۔ پس اگر آپ اپنے تن کو ہَر کے واسطے جلا رہے ہو۔ تو آپ کے پاس آپ کی غذا خود بخود کھنچ کر آ ہی جائے گی۔ آپ کے پاس وہ کُل چیزیں جن کی آپ کو ضرورت ہے آئیں گی اور ضرور آئیں گی۔ اس میں کچھ شک و شبہ نہیں۔ دیکھو! قُدرت کا تماشہ! کیا انتظام کر رکھا ہے! جب چراغ جیسی غیر ذی رُوح چیز کے واسطے قُدرت نے اُس کی غذا کا انتظام کر دیا ہے۔ تو کیا انسان ہی محروم رہے گا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں! لیکن شرط یہ ہے کہ اپنے میں بھی گداز چاہئے۔

؎ اثر ہے جذبِ اُلفت میں تو کھنچ کر آہی جاویں گے
ہمیں پرواہ نہیں اُن کی اگر وہ تن کے بیٹھے ہیں

ع تھامے ہوئے کلیجہ کو آؤ گے بے طلب

؎ عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود
تا نسوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

آپ تمام اشیاء کو دیکھتے ہو۔ کہ اُن کے رنگ ہیں۔ لیکن یہ رنگ اشیاء کے ذاتی رنگ نہیں ہیں۔ پتّے کا رنگ ہرا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ ہرا رنگ پتّے کا نہیں ہے۔ رنگ سب سُورج کے ہیں۔ چیزوں کے نہیں ہیں۔ اگر رنگ در اصل چیزوں کے ہوتے اور سُورج کے نہ ہوتے تو ان کو اندھیرے میں دیکھنے سے بھی وہ دکھائی دیتے۔ اگر تُم ایک پتّے کو اندھیرے میں دیکھو۔ تو تم اُس کی اور سب چیزوں کو محسوس کرو گے مگر رنگ کو نہیں محسوس کرو گے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ یہ رنگ تو رنگ والے کا ہے۔ ہرے پتّوں میں ایک مصالحہ chlorophyll ہے

اس میں یہ خاصیت ہے کہ وہ سورج کی کرن کے اور کُل رنگ کھا لیتا ہے۔ لیکن ہرے رنگ کو واپس کر دیتا ہے یعنی یہ کہ جو رنگ اُس پتے میں بالکل نہیں ہے۔ وہی ہم کہتے ہیں کہ پتہ اُس رنگ کا ہے۔ کالی چیزیں وہ ہیں۔ جو ان سب ساتوں رنگوں کو کھا جاتی ہیں۔ سفید چیزیں وہ ہیں۔ جو ان ساتوں میں سے ایک کو بھی نہیں کھاتی ہیں۔ سب کو واپس کر دیتی ہیں۔ یہ قانونِ قُدرت ظاہری دُنیا میں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قانون ہر جگہ ایک ہی ہے۔ وہی قانونِ ظاہری دُنیا میں ہے۔ اور وہی رُوحانی دُنیا میں بھی ہے۔ رُوحانی دُنیا میں اس قانون کو دیکھو۔ جس طرح سورج میں یہ سات رنگ ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ اُسی طرح پرمیشور میں بھی سب گُن ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ اسی کا نام مایا ہے۔ جس بات کی ہم پورے طور سے تشریح نہ کر سکیں اُسی کا نام مایا ہے۔ دُنیا کے لوگوں کو جو گُن دیئے جاتے ہیں وہ در اصل اُن کے نہیں ہیں۔ وہ پرم آتما کے ہیں۔ لیکن انسان کے گُن وہ اس وجہ سے کہلاتے ہیں۔ کہ وہ ان کے ساتھ کام کرتا ہے یعنی ان کو اصل منبع کی طرف واپس کرتا ہے۔ دولتمند دولت کو خرچ کرنے کی وجہ سے دولتمند بنتا ہے۔ عقلمند عقل کو خرچ کرنے سے عقلمند بنتا ہے۔ داہنا ہاتھ بائیں سے زیادہ قوی کیوں ہے۔ کیونکہ وہ طاقت کو استعمال کرتا رہتا ہے یعنی مثل chlorophyl کے یہ سب ہمیشہ کام کیا کرتے ہیں۔ قُدرت کا ایک قانون یہ ہے کہ جتنا صرف کرو گے۔ اُتنا پاؤ گے۔ سیاہ دِل لوگ وہ لوگ ہیں۔ جو کہتے ہیں۔ "یہ بھی میرا ہے"۔ "وہ بھی میرا ہے"۔ سفید یعنی صاف دِل وہ ہیں۔ جو ہر چیز کو پرمیشور کے سمرپن کرتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی جو پر اوپکار کرتے ہیں

اپنے ہر کام کو جو پرمیشور کے واسطے کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہتے۔ کہ فلاں کام میں ہم نے یُوں کامیابی حاصل کی۔ بلکہ وہ اس سب کو پرمیشور ہی سے منسُوب کرتے ہیں۔ محمود شاہ غزنوی کا ایک دوست صادق ایاز نامی تھا۔ یہ در اصل گھسیارہ تھا۔ لیکن بادشاہ کی دوستی کی وجہ سے اس کو یہاں تک عُروج ہُوا۔ کہ وہ عہدۂ وزارت پر ممتاز کیا گیا۔ جب اس کو عُروج ہُوا۔ تو چند حاسدوں کو بُرا معلوم ہُوا۔ اور وہ اس فکر میں لگے۔ کہ اس کو کسی طرح پر ذلیل کریں۔ چنانچہ اُنہوں نے محمود سے شکایت کی۔ کہ ایاز ہر روز خزانہ میں جاتا ہے۔ اور وہاں سے روز جواہرات نکال لیجاتا ہے۔ محمود نے چاہا کہ اس کو اپنی آنکھ سے دیکھوں۔ ایک روز جب ایاز اپنے وقت مقرّرہ پر خزانہ میں گیا تو لوگوں نے بادشاہ کو خبر دی۔ محمود معہ ان لوگوں کے وہاں گیا۔ اور روشندان کے ذریعہ سے دیکھنے لگا۔ وہاں کیا دیکھتا ہے۔ کہ ایاز نے اپنے تمام لباس وزارت کو اُتار کر ایک طرف رکھدیا۔ اور اُس نے اپنے کُھرپے کو اپنے سامنے رکھ لیا ہے۔ اور کمبل کو بچھاکر اُس پر نماز پڑھ رہا ہے۔ اور یہ سمرن کر رہا ہے۔ "ہے بھگوان! یہ وزارت میری نہیں ہے۔ یہ تیری ہے۔ یہ لباسِ وزارت میرا نہیں ہے۔ تیرا ہے۔ یہ جسم میں طاقت تیری ہے۔ یہ آنکھ میں نُور تمہارا ہے۔ یہ ہاتھوں میں طاقت تمہاری ہے۔ یعنی وہ اپنے کُل رنگوں سے جو جہاں سے آئے تھے ان کو وہاں کو واپس کر رہا تھا۔ اور پریم سے زار زار روتا تھا۔ جب ایاز اس سے فارغ ہوکر جانے کا ارادہ کرنے لگا۔ تو محمود فوراً وہاں پہنچ گیا۔ اور ایاز سے کہنے لگا کہ تُم میرے مُرشد ہو۔ تُم نے مُجھکو بچالیا۔ ورنہ میَں تو دُنیا کے ان بدارتھوں

میں ڈوب چُکا تھا۔ پس اوّل شرط کامیابی کی یہ ہے۔ کہ دِلوں میں نُور بھرا جائے۔ نُور سمرپن سے بھرا جاتا ہے۔ کرم کرنے کا تُم کو اختیار ہے۔ لیکن کرم کے ساتھ جو خود غرضی لگی ہُوئی ہے۔ اُس کو چھوڑ دو۔ جن لوگوں اور جن قوموں کو کامیابی ہُوئی ہے۔ ان کو اسی طرح پر عمل کرنے سے ہُوئی ہے۔ اگر کسی تاریخ یا سوانحِ عُمری میں اس کے خلاف لکھا ہے۔ کہ کوئی شخص یا کوئی قوم خود غرضی کے ساتھ کام کرکے کامیاب ہُوئی ہے۔ تو اس کی نسبت رام نہایت زور کے ساتھ کہتا ہے۔ کہ وہ غلط ہے۔ اور جھُوٹ ہے۔ آرتھر ہیلپس Arthur Helps نے ایسے ہی موقعوں پر کہا ہے۔ کہ مُجھکو تاریخ مت دکھاؤ۔ کیونکہ وہ ضرور غلط ہوگی۔ جس قدر تُم دُنیا کے پیچھے پڑوگے۔ اُسی قدر وہ تُم سے دُور رہے گی۔

۵۔ بھاگتی پھرتی تھی دُنیا جب طلب کرتے تھے ہم
اب جو نفرت ہم نے کی وہ بیقرار آنے کو ہے

پس جب تک تُم اپنے من کو ہائے ہائے وائے وائے میں رکھتے ہو۔ اُس وقت تک تُمہاری مطلب براری نہیں ہوسکتی۔ پرمیشور آنند ہے۔ جو آدمی آنند میں رہتا ہے۔ وہ پرمیشور میں رہتا ہے۔ اور پرمیشور اُس میں رہتا ہے۔ پرمیشور کو دھیان کرنے کا طریقہ یہ ہے

The way to more light is the faithful use of what we have.

کہ جو چیز تُمہارے پاس موجود ہو۔ اُس پر قانع ہوکر اُس سے مستفید ہو۔ پس اس وقت جس قدر روشنی یا نُورِ الٰہی تُمہارے پاس موجود ہے اُس کو عملی برتاؤ میں لاؤ۔ اُس کے بعد تُم کو آگے راستہ ملے گا۔

اس طریقہ پر عمل کرنے سے مذہبی لڑائی جھگڑے فوراً بند ہو سکتے ہیں۔ آپ سوال کریں گے۔ کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس کا جواب صاف ہے۔ آپ اپنے مذہبی اصول کو عمل میں لائیے۔ پھر دیکھئے۔ کہ لڑائی جھگڑے بند ہوتے ہیں یا نہیں۔ لڑائی جھگڑے تو اس راستہ کے چھوڑ دینے سے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس ایک لالٹین ہے۔ جو دو سو قدم تک تُم کو تمہارا راستہ دکھلا سکتی ہے۔ اب اگر آپ اس روشنی کے سہارے دو سو قدم تک چلے جاؤ۔ پھر وہاں سے وہ اور دو سو قدم آپ کو لیجا سکے گی۔ اسی طرح پر اس لالٹین کے سہارے سے جس میں صرف دو سو قدم تک روشنی ڈالنے کی طاقت ہے۔ آپ کوسوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ پہلے ہی سے اپنی کوسوں کی منزل کا خیال کرنے لگیں۔ تو نتیجہ کیا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ کہ لڑائی جھگڑا پیدا ہوگا۔ یہی حال تمہارے مذہبی اصولوں کا ہے۔ اگر تُم ان کی روشنی کو علٰحدہ رکھکر پہلے بحث مباحثہ کرنے لگوگے۔ تو جھگڑا ہونا ضروری ہے۔ مذہبی لڑائی صرف وہی لوگ کرتے ہیں۔ جو اپنے اندر کے نُور کو عمل میں نہیں لاتے ہیں۔

ع صد جان فدائے آنکہ زبان و دِلش یکیست

شاید اس پر یہ اعتراض ہو۔ کہ ہم تو زمین پر رہتے ہیں۔ ہم سے زمین کی باتیں کہنا چاہئے۔ یہ آسمانی باتیں ہمارے کس مصرف کی۔ پیارے! اس کا یہی جواب ہے۔ کہ یہاں زمین پر بھی ایسے ہی عمل کرنا چاہئے یعنی ہاتھ رہے کام میں اور دِل رہے رام میں۔ جب قُمری سروٗ کی شاخ میں بیٹھتی ہے۔ اُس کی زبان سے میٹھے میٹھے راگ اور سُر آپ ہی نکلنے لگتے ہیں اسی طرح جب آپ کا دِل اس نورِ خُدا یعنی نورِ

ذات سے بھر جاتا ہے۔ تو آپ کے دِل سے بھی وہ پیارے پیارے راگ آپ ہی آپ نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ لمپ جو رکھا ہُوا ہے۔ اس سے روشنی کیوں نکلتی ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ اس کی چمنی جو اس کا قالب ظاہری ہے صاف و شفاف ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر کا نُور بلا روک کے باہر چلا آتا ہے۔ اب شفاف ہونے سے کیا مطلب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس نے اپنے دِل کی تاریکی اور کدُورت کو نکالدیا ہے۔ اسی طرح اگر تُم بھی اپنے دِل کی کدُورت اور خودی کے خیالات کو نکالدو۔ تو تُمہارے اندر کا نُور بھی خود بخود باہر نکل آئے گا۔ بقولِ شاعر

کب لباسِ دُنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شُعلہ عُریاں ہی رہا۔
کب سبکدوش رہے۔ قیدیٔ زندانِ وطن
بُوئے گُل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

شاید یہ کہا جائے کہ ہم اپنے مذہبی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں اور مذہبی اصول چاہتے ہیں کہ جھگڑا کیا جاوے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مذہبی اصولوں کی منشاء ہرگز لڑائی جھگڑا کرنا نہیں ہو سکتی۔ ہر مذہب کا پہلا اصول یہ ہے۔ کہ خُدا کو جانو اور مانو۔ کیا اس پر آپ عمل کرتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگر آپ اس پر عمل کرتے ہوتے۔ تو کیا آپ پرمیشور کا اتنا بھی لحاظ اور ادب نہ کرتے جتنا کہ آپ اپنے ضلع کے کلکٹر کا کرتے ہیں۔ اگر اس وقت اس جماعت میں کلکٹر صاحب آجاویں۔ تو سب دم بخود ہو جاویں گے۔ ہر وقت اس بات کا خیال کریں گے۔ کہ کوئی کلمہ گُستاخانہ مُنہ سے نہ نکل جاوے۔ یا کوئی گستاخانہ حرکت نہ سرزد

ہو جاوے۔ آپ کبھی کلکٹر صاحب کے سامنے چوری نہ کریں گے۔ کبھی اُن کے سامنے کسی عورت کو نگاہِ بد سے نہ دیکھیں گے۔ اور نہ ان کے سامنے کوئی مذموم گفتگو کریں گے۔

ع ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

آپ کا مذہب سکھاتا ہے۔ کہ پرمیشور ہر جگہ موجود ہے۔ مگر افسوس ہے۔ اور رونا آتا ہے۔ کہ آپ اس بات کو جان کر بھی ہر قسم کی مذکورہ بالا باتیں کرتے ہیں۔ اور آپ کے دِل میں ذرا بھی خوفِ خُدا نہیں آتا ہے۔ اگر ہم لوگ پرمیشور کی موجودگی کو مانتے اور جانتے تو اس کی موجودگی میں عورتوں کی طرف بدنگاہ سے تکتے ہُوئے آنکھیں پھُوٹ نہ جاتیں۔ جھُوٹ بولتے وقت زبان نہ نکل پڑتی۔ عالِم باعمل ہونا چاہیئے۔ اگر عمل نہ ہُوا تو علم بیکار ہے۔ بلکہ مُضِر ہے۔ دماغ کی وہ نسیں جو علم کو گرہن کرتی ہیں۔ اُن کو گیان اِندریہ کہتے ہیں اور جو نسیں اندر کے علم کو باہر عمل میں لاتی ہیں اُن کو کرم اِندریہ کہتے ہیں۔ اور تندرستی کی حالت میں قائم رکھنے کے واسطے کُل اِندریوں کو کام میں لانا چاہیئے۔ ورنہ نتیجہ خراب پیدا ہوگا۔ جو لوگ عالم باعمل نہیں ہوتے۔ اُنکی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ وِدیا کو اندر ٹھونستے جاتے ہیں۔ مگر اس کو باہر نہیں نکالتے ہیں یعنی ایک قسم کی اِندریوں سے کام لیتے ہیں۔ اور دوسری قسم کی اِندریوں کو بیکار رکھتے ہیں۔ ان کو روحانی قبض اور عقلی بدہضمی ہوجاتی ہے۔ اسی کی وجہ سے وہ لڑائی جھگڑے میں پڑتے رہتے ہیں۔ لہذا شرط یہ ہُوئی کہ دُنیا میں کامیاب ہونے کے واسطے ہم کو چاہیئے۔ کہ جس قدر عقل ہمارے پاس ہے۔ اس کو محض عقلی ہی بنائے نہ رکھیں بلکہ اس کو عملی بھی بنادیں۔

دوسری شرط کامیابی کی یہ ہے۔ کہ برہمچرج قائم رکھنا چاہیئے۔ خواہ آپ نئی روشنی کے ہوں۔ یا پُرانی روشنی کے ہوں۔ خواہ آپ کی کتابوں نے اس پر زور دیا ہو۔ یا نہ دیا ہو۔ کچھ پرواہ نہیں ہے۔ رام آپ سے یہ کہتا ہے۔ کہ کامیابی کے واسطے عفت۔ پاکبازی یا برہمچرج کی بہت ضرورت ہے۔ اگر ہندوستانی بچے رہنا چاہتے ہیں تو ویرج کو قائم رکھیں۔ ورنہ کُچلے جائیں گے۔ یہ دیپک آپ کے سامنے جل رہا ہے۔ یہ کیوں جلتا ہے۔ اس کے نیچ کے حصے میں تیل بھرا ہُوا ہے۔ وہ تیل بتّی کے ذریعہ سے اُوپر چڑھتا ہے۔ اور اوپر آکر روشنی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے تیل والے حصے میں کوئی سُوراخ ہو جاوے۔ تو اس کا تیل رفتہ رفتہ بہ جائے گا۔ اور پھر اس سے روشنی نہ نکل سکے گی۔ یہی حال تمہارا ہے۔ اگر تمہارے اندر کا ویرج نیچے نہ گرے گا۔ تو یہ اوپر چڑھکر دماغ میں جاکر نُورِ رُوحانی بن جائے گا۔ لیکن اگر تُم اس کے خلاف کروگے۔ یعنی اپنے ویرج کو گراؤ گے۔ تو تمہاری وہی دیپک کی حالت ہوگی۔ جن لوگوں کے جسم سے کوئی ناپاک فعل سرزد نہیں ہوتا یا جن کے من میں کوئی ناپاک خیال پیدا نہیں ہوتا۔ اُن کا ویرج اوپر چڑھکر نورِ عقل میں بدل جاتا ہے۔ ایسی ہی حالت کو انگلستان کے مشہور شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

"My strength is as the strength of ten
Because my heart is pure". (Tennyson)

دس جوانوں کی مجھ میں ہے طاقت ؎
کیونکہ مجھ میں ہے عفّت و عصمت

ہنومان سب سے بڑا بیر (مہابیر) کیوں تھا۔ کیونکہ وہ یتی تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ میگناد بڑا یودھا (بہادر) تھا۔ اُس کو وُہی شخص مار سکتا تھا جس کے دِل میں بارہ برس تک کوئی ناپاک خیال نہ گذرا ہو۔ یہ کون شخص تھا۔ یہ شری لچھمن جی تھے۔ بھیشم کا نام بھیشم اس وجہ سے پڑا۔ کہ اُس نے زندگی بھر برہمچاری رہنے کی سخت پرتگیا کی۔

Sir Isaac Newton (سر آئزک نیوٹن) مشہور مہندس جس کے اوپر آج انگلستان کو ناز ہے۔ سناسی برس تک زندہ رہا۔ مرتے وقت تک اس کے ہوش و حواس نہایت درست تھے۔ کیونکہ وہ جتیندری تھا۔ نہایت پاکباز تھا۔ جس فلاسفر نے دُنیا کی فلاسفی کو پلٹا دیا۔ کون تھا Immanuel Kant (امینویل کینٹ)۔ یہ بڑا بھاری جتی تھا۔ اس کے دِل میں کبھی ناپاک خیال تک نہیں آیا۔ امریکہ کے Henry David Thoreau (ہنری ڈیوڈ تھورو) اور جرمنی کے مشہور فلاسفر Herbert Spencer (ہربرٹ سپنسر) دونوں بڑے جتیندری تھے۔ اس وقت امریکہ۔ انگلستان۔ جرمنی۔ جاپان وغیرہ مُلک ترقی کر رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ ان کے یہاں کے گرہستی بھی آپ کے یہاں کے جتیندریوں سے اچھے ہیں۔ اوّل تو اُن کی شادی بیس برس کے بعد ہوتی ہے۔ پھر ان کی عورتیں بھی تعلیم یافتہ ہوتی ہیں۔ جب مرد اور عورت ملتے ہیں۔ تو عمدہ عمدہ مضامین پر بحث کرتے ہیں۔ ایک دُوسرے کی صحبت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کبھی ناپاک خیالات کا موقعہ نہیں آنے پاتا۔ برخلاف اس کے آپ کے یہاں کی عورتیں تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ آپ کے یہاں مرد اور

عورت کی مُلاقات کے معنی ہی ناپاک خیالات ہیں۔ اور صحیح بھی ہے۔ جب وہ کچھ جانتی ہی نہیں۔ تو آپ اُن سے کیا باتیں کریں گے۔ بجز اُن ناپاک باتوں کے۔ اپنی روز مرہ کی زندگی میں دیکھو۔ کہ پاکبازی کا آپ کے کاموں اور ارادوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر آپ پاکباز ہیں۔ یعنی اگر آپ اپنے وِیرج (sex energy) کو قابو میں رکھے ہوتے ہیں۔ تو آپ بہت جلد کامیاب ہوں گے۔ رامؔ جب پروفیسر تھا۔ اُس نے تجربہ بذات خود کیا ہے۔ جس وقت رامؔ کامیاب اور ناکامیاب طلباء کے نقشے بناتا تھا۔ اور ان سے دریافت کرتا تھا۔ کہ امتحان سے چند روز قبل ان کی کیا حالت تھی۔ رامؔ نے اس سے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ جو طلباء امتحان کے قبل عمدہ اور پاک خیالات رکھتے تھے۔ وہ کامیاب ہوتے تھے۔ اور جو ناپاک خیالات رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ خایف رہتے تھے۔ کہ کہیں ناکامیاب نہ ہوں۔ وہ ناکامیاب ہوتے تھے۔ پس ثابت ہے۔ کہ جیسے جس کے خیالات دِل کے اندر ہوتے ہیں۔ ویسا ہی اُس کو نتیجہ ظاہر ہونا ہے۔ اس بات کا ثبوت تاریخ سے بخوبی مِل سکتا ہے۔ پرتھوی راج مشہور یودھا جو کئی ایک لڑائیوں میں مسلمانوں کو شکست فاش دے چُکا تھا۔ بالآخر عیش و عشرت میں ڈُوب گیا۔ اور آپ کو تعجب ہوگا۔ کہ آخر مرتبہ جب وہ میدانِ جنگ کو گیا۔ تو اُس کی کمر اُس کی رانی نے کسی تھی۔ نتیجہ کیا ہُوا۔ میدان جنگ سے مُنہ کالا کر کے ناکامیاب واپس آیا۔ نپولین جس کی ہمت اور بہادری کا سِکّہ چار دانگ عالم میں بج گیا تھا۔ جب واٹرلُو کے میدانِ جنگ کو جانے لگا۔ تو اس کے پہلے شام کو وہ اپنے آپ کو ایک

ناپاک چاہ میں گرا چکا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ شکست فاش کھائی۔ ابھیمنو کرو کھیشتر کی جنگ کا مشہور یودھا جس روز مارا گیا۔ اُس سے پہلی شام کو وہ اپنی نئی بیاہی بیوی کے پاس گیا تھا۔ اور وہاں بیرج گرا کر آیا تھا۔ یاد رکھو کہ اس ناپاک چیز میں کچھ لطف نہیں ہے۔ جیں طرح گلاب کا پھول کیسا خوشبودار ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شہد کی مکھی بھی رہتی ہے۔ جب آپ نے اس کو ناک کے پاس لگایا۔ اس نے ناک کی نوک پر ڈسا۔ اسی طرح دُنیا کے ناز و کرشمے اور دُنیاوی چیزیں بڑی دلکش اور بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ آپ کے دِلوں کو لُبھاتی ہیں۔ لیکن چکھ کر دیکھو۔ کہ ان میں ایک رُوحانی زہر ہے۔ جو آپ کو ترقی کرنے سے باز رکھے گا۔ یہ ناجائز محبتیں۔ یہ ناجائز عشقبازیاں۔ یہ ناجائز عصمت کا توڑنا۔ یہ سب اس گلاب کے پھول کی طرح ہیں جن میں شہد کی مکھی ہے۔ اور جو آپ کے ناک کی نوک پر کاٹ لیتی ہے۔ پس قانون یہ ہے۔ کہ اگر تم کو یہ دُنیاوی باتیں نہیں ہلا سکتیں۔ تو تُم دُنیا کو ضرور ہلا سکتے ہو۔

تیسری شرط کامیابی کی ایک رُوحانی شرط ہے۔ ناروے کے ایک بادشاہ کی روایت ہے کہ اس نے ایک کمرہ میں ایک سینگ رکھا تھا۔ اور اس سینگ کے خول میں پانی بھرا تھا۔ بادشاہ نے یہ اشتہار دے رکھا تھا۔ کہ جو کوئی اس سینگ کا کُل پانی پی لے۔ اور سینگ خالی کر دے۔ تو اس کو وہ اپنا کُل راج دے دیگا۔ بہت سے لوگ آئے۔ اور اُنھوں نے پانی پیا۔ لیکن کوئی بھی اُس کو خالی نہ کر سکا۔ وہ سینگ دیکھنے میں ذرا سا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اُس کا تعلق سمندر سے تھا۔ اور یہی

وجہ تھی۔ کہ وہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح پر گو آپ کے جسم ذرا ذرا سے ہیں۔ لیکن ان کا مخفی تعلق سمندروں کے سمندر اُس ذاتِ خُدا کے ساتھ ہے۔ جو شخص اس تعلق کو جگائے رکھتا ہے۔ اور اُس کو قائم رکھتا ہے۔ اُس کی طاقت لا انتہا ہے۔ آپ سوائے اُس کے اور کچھ ہو نہیں۔ جب یہ معاملہ ہے۔ تو چونکہ پرمیشور ست کام ست سنکلپ ہے لہذا آپ کے دل کی تہ کی تہ میں جو خیال ہے۔ وہ ست ہونا چاہئے اور اس خیال کی ہمیشہ جے ہے۔ بقول

ع دولتِ غلام من شُدو اقبال چاکرم

اب رام چند مثالیں تاریخ سے دے گا۔ جس سے ثابت ہوگا۔ کہ یہ مسئلہ بالکل صحیح ہے۔ شیرِ نیستاں مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی فوج لئے ہُوئے دریائے اٹک کے کنارے پڑا ہُوا تھا۔ اُس پار غنیم کی فوج تھی۔ رات کا وقت تھا۔ تاریکی چھائی ہُوئی تھی۔ نہ وہاں پر کوئی کشتی تھی جس کے ذریعہ پار اُترا جائے۔ اور نہ وہاں کوئی دوسرا ذریعہ معلوم ہوتا تھا۔ اب بڑی مشکل تھی۔ کہ کیا کیا جائے۔ سپاہیوں نے رنجیت سنگھ سے جاکر اپنی دقتیں بیان کیں۔ وہ تو جیسا سری کرشن جی نے فرمایا ہے جنگ کے واسطے کھڑا ہوجا ورنہ تو پاپ کو کماوے گا

सुखदु:खे समे कृत्वा लाभालाभौ जयाजयौ।
ततो युद्धाय युज्यस्व नैवं पापमवाप्स्यसि॥

سُکھ و دُکھ ہان لابھ جیت اور ہار
کے خیالات ترک کر اِک بار

اُس خیال میں مست تھا۔ اس کو نہ فتح کی خوشی تھی۔ اور نہ شکست

کا ملال تھا۔ وہ تو اس خیال میں مست ہوکر اپنا دھرم اپنا فرض ادا کرتا تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا۔

ؔ جاکے من میں اٹک ہے وہ ہی اٹک رہا
جاکے من میں اٹک نہ واکو اٹک کہاں

یہ سُنتے ہی لشکر پھاند پڑا۔ اور اُس پار پہنچ گیا۔ اس کو دیکھکر غنیم کی ہمّت ٹُوٹ گئی۔ جب ایسے بڑے دریا ناپیدا کنار سے یہ لوگ بلا کسی کشتی وغیرہ کے آن کی آن میں پار اُتر آئے ہیں۔ تو اُن کا مقابلہ ناممکن ہے۔ بھاگ کھڑے ہُوئے۔ اور میدان رنجیت سنگھ کے ہاتھ میں رہا۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت محمدؐ صاحب ایک مہم پر جانے کے واسطے بڑی طیاری کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ اس قدر طیاری تو کر رہے ہیں۔ لیکن اگر آپ کو شکست ہُوئی۔ تو کس قدر ندامت ہوگی۔ اور علاوہ اس کے آپ کی ہمّت بھی ٹُوٹ جائے گی۔ اس پر وہ کِھل کِھلا کر ہنس پڑے۔ اور کہنے لگے۔ محنت کرنا میرا کام ہے نہ کہ کامیابی چاہنا۔ میں تو اللہ کے حُکم سے کام کر رہا ہُوں۔ اپنا فرض ادا کر رہا ہُوں۔ اس سے زیادہ مجھکو کچھ تعلق نہیں ہے۔ فرانس اور جرمنی کی لڑائی میں شاہ فریڈرک کو بالکل شکست ہوگئی تھی۔ غنیم کے سپاہی اس کے قلعہ میں گھُس گئے تھے۔ اور رنگ رلیاں مچا رہے تھے۔ لیکن فریڈرک کو اپنے حق بجانب ہونے کا یقین تھا۔ پس اُس نے ہمت کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اُس نے اپنے لوگوں کو جمع کیا۔ اور اُن میں سے چند کو ایک جانب بھیجدیا۔ تم اُس ٹیلے پر جاکر کھڑے ہو۔ چند کو دُوسری جانب بھیجا۔ اسی

طرح چاروں طرف بھیجدیا۔ اس کے بعد خود ہمت باندھے ہوئے بیدھڑک قلعہ کے اندر گھس گیا۔ اور سپاہیوں سے کہا۔ کہ تم لوگ ہتھیار رکھدو۔ اُنہوں نے سوال کیا کہ کیوں؟ اُس نے کہا۔ تم نہیں دیکھتے ہو کہ میری فوج ہر طرف سے آرہی ہے اور تم گھیرے گئے ہو۔ یہ دیکھکر لوگ خائف ہوئے۔ اور کُل ہتھیار اُس کے سامنے ڈال دئے۔ اگر تمہارا دل ایمان سے بھرا ہے۔ تو ایک دشمن کیا ساری دُنیا تمہارے سامنے ہتھیار ڈال دے گی۔ یہی دِل کا حوصلہ ہے۔ جس نے شکست فاش کو فتح تمام میں تبدیل کردیا

ع ساری خُدائی اِک طرف فضلِ الٰہی اِک طرف

ے نہ مہنگے پر نہ سستے پر نہیں موقوف غلہ پر
فتح تو بس اُسی کی ہے خُدا ہے جس کے پلہ پر

ہاتھی اور شیر کی جسامت میں کتنا فرق ہے۔ لیکن دیکھو۔ شیر کے حوصلہ اور ہمت کی وجہ سے ہاتھی کو باوجود اپنی جسامت کے مقابلہ شیر کا کرنا مشکل پڑجاتا ہے۔ ہاتھی کو اپنی قوت پر بالکل بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ گروہوں میں رہتا ہے۔ کیونکہ اس کو اندیشہ رہتا ہے۔ کہ اکیلا پاکر اس کو کوئی کھا نہ جائے۔ شیر گو اُس سے جسامت میں چھوٹا ہے۔ مگر ہمت اُس میں بھری ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہاتھی اس کے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا ہے۔ شیر اپنے اندر والے خُدا کو یعنی آتما کو مار نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کو عملی طور پر ظاہر کرتا ہے۔

چین میں ایک لڑکا تھا۔ اس کے ماں باپ نہایت مصیبت زدہ تھے۔ وہ یہاں تک محتاج تھا۔ کہ پڑھنے کے واسطے تیل تک

نہیں ملتا تھا۔ لیکن اس کو پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ بہت سے جُگنوؤں کو جمع کرکے ایک کپڑے میں باندھتا تھا۔ اور جب وہ چمکتے تھے۔ اُن کی روشنی سے پڑھ لیتا تھا۔ لوگوں نے اُس کو کہا۔ کہ تُم یہ کیا بیہودہ حرکت کرتے ہو۔ ایسی محنت کس واسطے کرتے ہو۔ کیا بادشاہ کے وزیر تُم ہی ہوگے۔ آہاہا! اس نے کیا جواب دیا۔ طبیعت خوش ہوگئی۔ کہتا ہے۔ میرے دِل میں ایسے حوصلے اُٹھتے ہیں۔ اور ایسی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ جس سے اُمید بندھتی ہے۔ کہ مَیں وزیر بنوں گا۔ آخر وہ لڑکا چین کا وزیر ہو ہی گیا۔

اکثر لوگ کہتے ہیں۔ کہ ہم فلاں کام کیونکر کریں۔ ارے بھائی خودکشی یا خُداکشی کیوں کر رہا ہے۔ تُو جسم نہیں ہے۔ تُو خود ہی لا انتہا ہے۔ پھر کس طرح کیا پوچھتا ہے۔ تُم کو کیا معلوم نہیں ہے کہ علمِ آب (Hydro-Statics) کا ایک اصول ہے۔ جس سے تمام سمندر کے پانی کو ایک ذرا سا پانی روک سکتا ہے۔ اس طرح ایک آدمی ساری دُنیا کو روک سکتا ہے۔ اگر وہ اپنے اندر کی خُدائی پر کھڑا ہو جائے۔ مسبب الاسباب تو تُو ہی ہے۔ پھر سامان یا ذرایع کیا ڈھونڈھتا ہے۔

اسکاٹ لینڈ کا ایک بچہ وہاں کے یتیم خانہ سے بھاگ کر لنڈن چلا آیا۔ لنڈن میں وہ اتّفاق سے لارڈ میر کے باغ میں پہنچ گیا۔ اور وہاں کھیلنے لگا۔ اتّفاق سے اُدھر سے ایک بِلّی نکلی۔ بچّے نے اس کی دُم پکڑلی۔ اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں قریب سے گھنٹہ کی آواز سُنائی دی جو لگاتار بج رہا تھا۔ بس اب وہ بلّی سے بات

کرنے لگا۔ اور کہنے لگا۔

What does the mad bell say?
Ton! Ton!! Ton!!! Whittington
Lord Mayor of London.

وہ اپنی اس گفتگو میں مشغول تھا۔ کہ اتفاق سے لارڈ میئر اُدھر سے آنکلا۔ اُس نے سُنا۔ کہ کوئی شخص بات کر رہا ہے۔ وہاں آکر یہ حال دیکھا۔ اُس نے لڑکے سے پُوچھا۔ کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اُس نے جواب دیا لارڈ میر آف لنڈن۔ لارڈ میر بہت خوش ہُوئے۔ اُس کو اپنے یہاں لے گئے۔ اور اس کو تعلیم کے واسطے اسکول میں بھیجا۔ وہاں اس نے نہایت محنت کے ساتھ پڑھا اور خوب علم حاصل کیا۔ رفتہ رفتہ وہ ایک دن لارڈ میئر آف لنڈن ہو ہی گیا۔

ایک شاعر تھا۔ اپنے فن کا ماہر تھا۔ اس نے بہت سے اشعار کہے۔ اور بادشاہ کے حضور میں لے گیا۔ بادشاہ ان کو سُن کر نہایت خوش ہُوا۔ اور انعام خوب دیا۔ بیگمات نے بھی اس کے کلام کو پسند کیا۔ اور جب بادشاہ محل میں آیا۔ اُس سے خواہش ظاہر کی۔ کہ شاعر کہیں محل کے قریب رکھا جائے۔ دُوسرے روز بادشاہ نے شاعر سے دریافت کیا۔ کہ کہاں رہتے ہو۔ وہ مطلب سمجھ گیا۔ اور بادشاہ سے کہا۔ مَیں تو اندھا ہُوں۔ یہ سُن کر بادشاہ نے کہا۔ جب یہ اندھا ہے۔ تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس کو محل کے قریب ایک کمرے میں ٹھیرادو۔ پس ایسا ہی کیا گیا۔ اب وہ وہاں رہنے لگا۔ اور نوکروں چاکروں کو دق کرنے لگا۔ ایک روز لونڈی سے کہا۔ کہ لوٹا اُٹھادے۔ مجھے ضرورت

ہے۔ اُس نے کہا۔ یہاں لوٹا کہاں ہے۔ کہنے لگا اُٹھا دے۔ اُس نے پھر وہی جواب دیا۔ غرض بعد بڑی زدو کد کے بول اُٹھا۔ اری وہ لوٹا پڑا ہے۔ کیوں نہیں اُٹھا دیتی۔ بس لونڈی دوڑی ہوئی محلوں میں گئی۔ اور بیگمات سے کہا یہ مُوا تو دیکھتا ہے۔ اندھا نہیں ہے۔ یہ مُوا ہم سب کو گھورتا ہے۔ فوراً بادشاہ کو خبر کی گئی۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ دربار سے نکالا گیا۔ اور اندھا بھی ہو گیا۔ آپ کہتے ہیں۔ سامان نہیں ہیں۔ کیسے کام کریں۔ یہ سب خیالات کا کھیل ہے۔ جب تمہارے اندر یقین کی طاقت آجائے گی۔ تو سب سامان خود بخود تمہارے سامنے آجائینگے۔ دیوتا (قدرت کی طاقتیں) تمہارے لئے اپنا سبھاؤ بدل دیں گی۔ اُوپر جو مثالیں بیان کی گئیں ہیں۔ ان سے ثابت ہے۔ کہ اچھے خیال والے اچھے ہوں گے۔ لیکن بُری مراد مانگنے والے بُرے ہوں گے۔ جیسا خیال کرو گے ویسے ہو جاؤ گے۔

گر در دلِ تو گُل گزرد گُل باشی
ور بُلبُلِ بے قرار بُلبُل باشی
سودائے بلا رنج و بلا سے آرد
اندیشۂ کُل پیشہ کُنی کُل باشی

ہر ایک پرارتھنا سُنی جاتی ہے۔ جو پرارتھنا دِل کی تہ سے نکلتی ہے۔ وُہی قبول ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ جیسا آپکا خیال ہو گا۔ اُس کو آپ کے اندر کا ست (دل) پُورا کر دے گا۔ آپ میں وہ طاقت موجود ہے۔ جس سے آپ دیوتاؤں کی برابری کر سکتے ہیں۔ دیوتا کے معنی قُدرت کی طاقتوں کے ہیں۔ اگر آپ وید کے مطابق

چلیں۔ تو آپ دیوتاؤں تک پہنچ سکتے ہیں، آپ اپنے بشواش (یقین) کے بل سے قدرت کی طاقتوں کو کھینچ کر لا سکتے ہیں۔ اور اُن سے برابری کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے اُن طریقوں کو بُھلا دیا ہے۔ جب تک اُن طریقوں پر عمل تھا۔ اس طرح کے خیالات دل میں جاگزیں تھے۔ اُس وقت ویسے ہی نتیجے ظاہر ہوتے تھے۔ لیکن جب سے اُن طریقوں کو چھوڑا۔ اور خراب خیالات نے دل میں جگہ پکڑلی۔ رنگت بھی تبدیل ہو گئی۔ جب ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہوا۔

ہم کو نوکر راکھو جی ہم کو نوکر راکھو جی
مَیں غلام مَیں غلام مَیں غلام تیرا

اور ہندوؤں میں ایک خوبی یا وصف یہ ہے۔ کہ وہ ہمیشہ سچّے ہوتے ہیں۔ پس اُن کی وہ فطرتی سچائی مذکورہ بالا خیال پر لگائی گئی۔ چونکہ اُن کا یہ دلی خیال تھا۔ اُن کی یہ مراد پوری ہُوئی۔ ظاہر ہے۔ کہ جیسا خیال کروگے ویسا پاؤگے۔ ہم کو اپنے خیالات کو درست کرنا چاہئے۔ بُدھ بھگوان نے بھی یہی سکھلایا ہے۔ پس نہ اپنے متعلق اور نہ کسی غیر کے متعلق اپنے دل میں کمینے خیالات کو آنے دو۔ اندر اور باہر خُدا ہی خُدا کو دیکھو۔ محمدؐ صاحب کے دل میں یہ بات سما گئی تھی۔ اس وجہ سے اُنہوں نے سکھایا تھا۔ کہ نہیں ہے کچھ سوائے خُدا کے۔ لا الہ الا اللہ۔ حضرت عیسیٰؑ مسیح کے رگ و ریشہ میں بھی یہی خیال رواں تھا۔ پس اُنہوں نے بھی یہی کہا۔ کہ مَیں اور میرا باپ (خُدا) ایک ہیں۔ "I and my father are one"۔ اب اس کو لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔ مگر اصل بات یہی ہے۔ جب حضرت محمدؐ صاحب کے دل میں یقین آگیا

تو اُنہوں نے کہا۔ کہ اگر سورج میرے داہنے اور چاند میرے بائیں آکر دھمکانے لگے۔ کہ پیچھے ہٹ جا۔ تب بھی مَیں پیچھے نہ ہٹوں گا۔ ایک آدمی جو جنگلوں کا رہنے والا تھا۔ اس کے سینے میں اس یقین کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور اُس نے عرب کے ریگستان میں اس کے کالے ریت کے والوں کو بھڑکایا۔ وہ ذرّے بارُود کے چھرّے بن گئے اور یورپ وافریقہ کے مغربی سرے سے لیکر ایشیا کے مشرقی سرے تک ایک صدی کے اندر پھیل گئے۔ یہ زور ہے آتم بل کا۔ یہ زور ہے وِشواس کا۔ یہ زور ہے یقین کا۔ اس پر بھی کہتے ہو کہ سامان کی ضرورت ہے۔ سامانوں کے سامان تو تُم خود ہو۔ اس خیال کو برہم وِدّیا کہتے ہیں۔

جس طرح ایک خوبصورت لڑکا چیچک کے مرض سے بالکل بدصورت ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی جان پر بن آتی ہے۔ اور اُس کو فائدہ گائے کے تھن کے لمف کا ٹیکہ لگانے سے ہوتا ہے۔ اُسی طرح ہندو قوم کو اوِدیا کی چیچک نکلی ہے۔ اور وہ بدصورت ہُوئی جاتی ہے۔ اُس کا خاتمہ بھی قریب معلوم ہوتا ہے۔ پس اُس کو بھی ٹیکہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اس ٹیکہ کے واسطے لمف کہاں سے آوے گا۔ وہ بھی گوتھن سے لیا جاوے گا۔ گو کے معنی اُپنشد کے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ برہم وِدّیا اُپنشدوں سے سیکھو اور اُس پر عمل کرو۔ تو یہ اوِدیا کی چیچک فوراً اچھی ہو جائے گی۔

لوگ کہتے ہیں۔ تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جو قوم ایک مرتبہ ترقّی کرکے زوال پذیر ہُوئی۔ پھر وہ دوبارہ ترقّی نہیں کرتی۔ یہ خیال خام ہے۔ آپ کی تاریخ کیا؟ وہی ایک ہزار سال کی تاریخ

اور اس پر یہ ناز۔ ارے میاں! وہ تو ایک دور کی بھی کامل تاریخ نہیں ہے۔ تاریخ صعودِ قدرت کی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی چیز نیست نہیں ہوئی۔ کسی نہ کسی شکل میں وہ موجود رہتی ہے کہتے ہیں کہ

ع رنگ آمیزی در فصلِ خزاں۔ انداختہ

پھر دیکھو قدرت تمہیں بتاتی ہے۔ کہ ستارے مشرق سے مغرب کو جاتے ہیں۔ اور پھر وہاں سے مشرق کو واپس آتے ہیں۔ یہی دور ہے۔ اسی طرح اقبال کا ستارہ مشرق سے مغرب کو گیا اور پھر وہاں سے مشرق کو واپس آ رہا ہے۔ تاریخ اس کا ثبوت دیتی ہے۔ دیکھو! ایک زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کا ستارہ عروج پر تھا۔ وہاں سے مغرب کو چلا۔ فارس میں آیا۔ اس کے بعد آسٹریا وغیرہ کی باری آئی۔ وہاں سے یونان پہنچا۔ یونان کو چھوڑ کر روم گیا۔ روم کے بعد اسپین وغیرہ کی باری آئی۔ پھر انگلستان پر نظر عنایت ہوئی۔ وہاں سے امریکہ گیا۔ اس وقت امریکہ کا مغربی حصہ کیلیفورنیا نہایت عروج پر ہے۔ وہاں سے جاپان میں آیا۔ پھر اب کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہندوستان محروم رہے گا۔ اس کی باری نہیں آئے گی۔

اوم! اوم!! اوم!!!

آنند! آنند!! آنند!!!
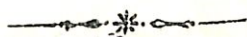
رام ڈھنڈورہ

یا

صدائے رام

(سوامی رام تیرتھ جی کا پیغام اپنے نوجوان ہموطنوں کے نام۔ جو اُنہوں نے لالہ ہردیال ایم۔اے کے پاس ینگ مینس انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے جلسہ میں پڑھنے کے لئے بھیجا تھا یہ اُس انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے)

اتّفاق۔ اتّفاق۔ ہر ایک شخص اتّفاق کی ضرورت کو محسوس کر رہا ہے۔ ہزاروں طاقتیں ایک دُوسرے کے زور کو مٹا رہی ہیں۔ اور کوئی نتیجہ خیز طاقت (resultant force) ظاہر نہیں ہوتی۔ کروڑوں دماغ اور ہاتھ چل رہے ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ کس طرف۔ ہزاروں فرقے اور جماعتیں اپنی اپنی خیالی منزلِ مقصود کی طرف ناویں کھیئے چلی جا رہی ہیں۔ مگر کوئی باقاعدہ جہازرانی نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی یہ موجودہ حالت ہے۔ پتواروں کو وہیں رہنے دو جہاں اب ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہوں پر ڈٹے رہو۔ ہٹو مت۔ مگر ایک ہی طرف کھینا تو شروع کردو۔ اس قسم کی ہارمونی (harmony) یا وحدت (ایکتا یا اِتحاد) سے جو اس کثرت میں جھلک رہی ہے۔ اس بات کا یقین ہوتا

ہے۔ کہ اب ترقی ہوگی۔ بس اپنی اپنی جگہوں پر ڈٹے ہُوئے کام کرتے رہو اور گاتے ہُوئے آگے بڑھتے چلو۔ قومی اور ذاتی فوائد بھی ایسا ہی چاہتے ہیں۔ اس طرح پر زبانی جمع خرچ کرنا تو بہت آسان ہے۔ مگر یہ تو بتلاؤ۔ کہ کیوں ایک مُدت مدید اور عرصہ بعید سے اتحاد اور ہارمونی کی رُوح اِس مُلک سے عنقا صفت پرواز کرگئی۔ اس کے اصلی وجوہات یہ معلوم ہوتے ہیں۔

(الف) عملی عقل یا لیاقت کی کمی۔

(ب) آبادی کی زیادتی۔

آؤ اب ان دونوں وجوہات پر ذرا غور تو کریں۔

(الف) مسلمانوں کی علمداری سے پہلے اَلبیرُونی خُراسانی نے اس مُلک کا سفر کیا تھا۔ یہ ایک روشن ضمیر حکیم اور نہایت عالم فاضل شخص گُذرا ہے۔ اور کسی طرح پر ہندوؤں سے اُس کو تعصّب نہ تھا۔ اُس نے سنسکرت اور ہمارے ہاں کے شاستروں کو اُسی شوق کے ساتھ پڑھا۔ جس شوق سے اُس نے افلاطون اور ارسطو کے فلسفہ کا مطالعہ کیا تھا۔ اُس نے ہندوستان کو جیسا پایا ویسا ہی بجنسہٖ بالتفصیل بیان کیا ہے۔

ہندوؤں کے درشن (فلسفہ) کاویہ (شاعری) اور جیوتش (نجوم) کا نہایت ادب اور عزّت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ بعض بعض پنڈتوں کی وِدّیا کی جن سے اُس کی ملاقات ہُوئی بڑی تعریف کرتا ہے۔ لیکن عوام الناس کی حالت اور اِستریوں کی دُرگت (مستوُرات کی خراب و خستہ حالت) نہایت ہی مایوسانہ الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ عوام الناس

کو تو وہ جسمانی۔ دماغی۔ اخلاقی اور نیز روحانی لحاظ سے خستہ و خوار بتلاتا ہے کہ ہر طرح سے یہ لوگ ذلیل اور پامال ہیں۔ سوشیل۔ پولیٹیکل اور مذہبی معاملات میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ ان لوگوں کے بیشمار جتھے کے جتھے جن کے خیالات منتشر اور فرقے تتر بتر ہیں۔ بیقاعدگی کے مارے مسلمان حملہ آوروں کے سامنے جو محمود غزنوی کے زیر کمان سال بسال ہندوستان کو لوٹنے کی غرض سے آتے تھے۔ خاک کے ذرّوں کی طرح اُڑتے چلے جاتے تھے۔

اس کے بعد بابر باشندگان ہند کی اس طرح شکایت کرتا ہے کہ یہ لوگ اختراع پردازی یعنی نئی چیز پیدا کرنے کا مادّہ کچھ بھی نہیں رکھتے اور علمی صُورت میں صنعت اور حرفت سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ نہ تو ان کے ہاں کہیں عمارتی باغیچے ہیں۔ اور نہ نہریں۔ حتیٰ کہ ان کے ہاں بارود بھی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ اس قابل بھی نہیں کہ ایک دوسرے سے ذرا آزادی کے ساتھ ملیں جُلیں تو سہی۔

ان (مورخین) کے بیانات میں جسے ذاتی رائے کہتے ہیں اُس کو درگزر کر کے اور دیگر مبالغوں کو اگر کوئی ہوں تو اُن کو نظر انداز کر کے ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے۔ کہ یہ بیانات سچّے ہیں۔ یہ ہی علمی عقل یا لیاقت کی کمی ہے۔ جس کا ان لوگوں نے اظہار کیا ہے۔ اور جس سے ہندوستان کا زوال ہُوا ہے۔ جو کُچھ ان بدیشی مؤرخوں نے بیان کیا ہے۔ اُس کو زبانی جمع خرچ سے رد کرنا رام کے لئے ایسا ہی آسان ہے۔ جیسا کہ کسی اور کے لئے۔ لیکن ہائے غضب! یہ سیدھے سادے حالات اور سچے واقعات ہیں۔ جن کو یہ لوگ بے کم و کاست

تحریر میں سے آئے۔ اگر اس کا بدیہی ثبوت نہ ملتا۔ تو بھلا کوئی کیسے کہہ سکتا۔ اُس عملی عقل یا لیاقت کی کمی میں جس کا اشارہ اوپر ہو چکا ہے۔ سوسائٹی کی ساری بُرائیاں جیسے دستکاری کی حقارت اور بدیشی جاترا یعنی غیر مُلک کے سفر سے نفرت اور بچپن کا بیاہ (کم سنی کی شادی) اور عورتوں کی جسمانی اور دماغی تمام کمزوریاں شامل ہیں۔

ان سوشل بُرائیوں سے سابقہ پڑنا ہی آفت ہے۔

برک (Burke) نے کیا خوب کہا ہے

"Reform is a thing which has to be kept at distance to please us."

؎ خوش چاہو اگر رکھنا اپنے کو تم
ریفارم سے دُور ہی رہو تم

رسم اور رواج کی قیود کو توڑ کر باہر نکل آنا ایک بڑے معرکہ کا کام ہے۔ سوسائٹی لامحالہ کام کرنے والوں کی نکتہ چینی اور بدگوئی کرتی ہے۔ اور سوسائٹی کے کام کرنے والوں میں اسی سے آپس میں بدظنی۔ نافہمی اور نفاق پیدا ہوتا ہے۔ کیا اس نفاق سے بچنے کے لئے ہم اُن معاملات کو یُوں ہی اٹکل پچو چلنے دیں اور "ہم کو اپنے مطلب سے کام" ایسا کہکر اپنا راستہ لیں۔ "ہم کو اپنی نجات سے کام۔ سوسائٹی پڑے چُولھے بھاڑ میں۔" اوہ! کہیں ایسا ہوتا تو کیا اچھا تھا۔ سوسائٹی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ تم کو اُس کے ساتھ ڈُوبنا ہوگا اگر وہ ڈُوبے گی! اور اُٹھنا ہوگا اگر وہ اُٹھے گی۔ گویا سوسائٹی کہتی ہے

؎ ہم جو ڈُوبینگے تو پھر تُم کو بھی لے ڈُوبینگے — ہم جو اُٹھینگے تب ہی تم کو بھی لے اُٹھینگے

اس بات کا یقین کرنا کہ کوئی شخص پُورن یعنی کامل ہو جائے جبکہ سوسائٹی ادھوری یعنی نامکمل ہے۔ سراسر داخلِ نادانی ہے۔ یہ ٹھیک ایسا ہی ہے کہ ہاتھ دھڑ سے الگ کٹ کر طاقت کے کمال کو پہنچ جائے۔

مُدتّوں اس غیر ویدانتی خیال نے ہندوستان میں پرورش پائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ سوسائٹی کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے۔ اے ہوشیار نوجوانو! تمہارے مُلک کا مستقبل تمہارا مستقبل ہے۔ اور اُس کا دارومدار تم ہی پر ہے۔ بُزدِلوں پر ہی میجورٹی یا اکثریت کا جادو چلا کرتا ہے۔ قوم کے خیال اور دِل پر تو سچی اور جیتی جاگتی رُوح ہی حکومت کرتی ہے۔ چاہے باہر کا برائے نام حاکم کوئی کیوں نہ ہو۔ بی۔ اے یا ایم۔ اے کے درجے تو تم یونیورسٹیوں سے حاصل کر لیتے ہو مگر بُزدِل اور بہادر ہونے کے درمیان تم ہی کو خود فیصلہ کرنا پڑے گا۔ بولو تم کون سا درجہ چاہتے ہو۔ آیا غلام کا یا زندگی کے سلطان کا۔ تمہاری ہی طاقتور اور پاک زندگانی تاریخ کی جان ہے۔ نیوٹن کا دوسرا قانونِ حرکت یہ سکھلاتا ہے۔ کہ کسی جسم کی حرکت میں اُس قوّت سے جو اُس پر کام کرتی ہے ایک تبدیلی وقوع میں آتی ہے۔ صدیوں سے غیر قُدرتی اختلافات اور اس سے بھی بدتر سُستی کا دَورہ ہمارے مُلک کے رسم و رواج اور توہمات پر برابر ہو رہا ہے۔ اے نونہالو اور تعلیم یافتہ خوش خصالو! یہ تمہارا ہی کام ہے کہ جیتی جاگتی قوّتیں بن کر اُن فضولیات کو جن کی اب ضرورت نہیں رہی بدل دو۔ اور پُرانی طاقتوں پر غالب آؤ۔ اور حرکت کے رُخ کو جدھر ضرورت ہے پھیر دو۔ اور جہاں کہیں کمی ہو۔ اُس کو حرکت کی تیزی سے

پورا کر دو۔ اور سادھارن لوگوں یعنی عوام الناس کا رُجحانِ طبع اُسی طرف پھیر دو۔ جدھر اُس کی ضرورت ہو۔ اور اپنے دم قدم سے اس بات کو دکھلا دو۔ کہ ایسے مورّخین جو ہندوستان کو محض گذشتہ بغیر کسی آیندہ کے بتلاتے ہیں یعنی یہ کہتے ہیں کہ "ہندوستان کو جو ترقّی کرنی تھی، وہ زمانہ گذشتہ میں کر چکا ہے۔ اب آیندہ کوئی ترقّی نہ کرے گا" ایسا کہنے والے سخت غلطی پر ہیں۔ زمانہ گذشتہ سے زمانہ حال کو بناؤ اور بہادری کے ساتھ پاک اور مضبوط زمانہ حال کو آئندہ کے لئے تیار کرو۔ بغیر اپنے بزرگوں کے ترکہ کے ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ وہ سوسائٹی جو اس ترکہ کو ترک کرتی ہے۔ باہر سے غارت ہو جائے گی۔ اور "ہم کچھ نہیں" سے بھی کم کر سکیں گے۔ اگر اس ترکہ کو حد سے زیادہ لیں۔ وہ سوسائٹی جس میں اس ترکہ کا خیال سب پر غالب بلکہ اغلب ہے وہ اندر سے تباہ ہو جائے گی۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تُم میں صداقت ہونے سے سوسائٹی میں جھگڑا اور نفاق پیدا ہو جائے گا؟ جمے ہوئے ڈٹے رہو۔ چاہے اکیلے ہی کیوں نہ ہو۔ پھرو مت۔ مُنہ مت موڑو

؎ جوانمرداں نہ پیچید از کسے رُو ؛ ؛
ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گو ؛

جوانمردی اسی کا نام ہے

اگرچہ قُطب جگہ سے ٹلے تو ٹل جائے
اگرچہ بحر بھی جُگنو کی دُم سے جل جائے
ہمالہ باد کی ٹھوکر سے گو پھسل جائے
اور آفتاب بھی قبلِ عروج ڈھل جائے

مگر نہ صاحبِ ہمت کا حوصلہ ٹوٹے
کبھی نہ بھولے سے اپنی جبیں پہ بل آئے

اگر تم ست کے مارگ یعنی صداقت کے راستہ سے نہیں ہٹتے۔ تو میدان تمہارے ہاتھ ہے۔ لوگوں کو پچھلی عظمت پر اُچھلنے دو۔ اگلی عظمت ساری کی ساری تمہاری ہی ہے۔

قوم۔ کیا وہ آپ کا اتفاق جو سچائی کے لئے نہ ہو۔ قوم کو بچا سکتا ہے؟ کیا لوگوں کو تاریکی میں رکھکر تم اتفاق پیدا کرسکتے ہو؟ کیا غلطیوں اور توہمات کی غلامی سے قوم میں ایکا ہوسکتا ہے؟ اچھا فرض کرلو کہ سب کے سب ملاح ایک ہی طرف کشتی کو کھینے لگیں۔ مگر جس طرف کھے رہے ہوں وہ رُخ غلط ہو۔ یعنی وہ رُخ ترقی اور راستی کا راستہ نہ ہو۔ تو کون اس کو پسند کرے گا۔ ایسی کشتی تو بہت جلد کسی چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی۔ اور شاید جتنی جلدی ٹوٹے۔ اُتنا ہی بہتر۔

ایکا (اتفاق) تو سورگ یعنی بہشت ہی میں ممکن ہے۔ کیول پوترتا اور ستیہ یعنی صرف عصمت اور صداقت ہی میں یکتائی ہوتی ہے۔

اے قومی اتفاق کے چاہنے والا۔ قوم کو پہلے بے انتہا غیر انسانی غلطیوں سے آزاد تو کرو۔ اگر انسانیت۔ صداقت اور ترقی کے لئے آج عوام الناس کو تکلیف دی جارہی ہے۔ اور کُل کام کرنے والے ستائے جارہے ہیں۔ تو مُلک روحانیت کے لحاظ سے ابھی زندہ ہے۔ اور نیچے اوپر سانسیں ٹھیک لے رہا ہے۔

اعلیٰ چال چلن والا (آدرش چرتروان) جانتا ہی نہیں کہ دُکھ کیا ہے۔ وہ شانتی کی مُورتی ہوتا ہے اور اُس سے چاروں طرف پریم

و پرکاش پھیلتا رہتا ہے۔ لیکن جس سوسائٹی (سماج) میں روشنی کی آمد باعثِ زحمت محسوس ہوتی ہو۔ تو اُس میں وہ شانتی (جس میں دُکھ کا احساس نہ ہو) اور وہ روشنی (جو جگا دینے والی ہو) یہ ہردو ایک ساتھ کیسے پرورش پاسکتی یا زندہ رہ سکتی ہیں؟ پس ایسی حالت میں اگر آپ آدرش چرتر وان یعنی اعلیٰ چال چلن والے نہیں ہو سکتے تو کم سے کم اتنا تو ضرور ہو کہ جو بھی آپ کا آچرن (چلن) ہو وہ اندر باہر سے ایک ہو یعنی تمہارا قول و فعل تو ایک ہو۔ یہ بات ہے جس کی (مُلک میں) از حد کمی و ضرورت ہے۔ چھوٹے چھوٹے (ادنیٰ) خیال والے بڑے آدمیوں سے نہیں بلکہ بڑے بڑے (اعلیٰ) خیال والے چھوٹے آدمیوں سے مُلک کو طاقت ملتی ہے۔

شانتی کیا ہے؟ کیا جانوروں کی کاہلی شانتی کہی جاسکتی ہے۔ کیا سڑی بدبُو دار قبر شانتی کہلاسکتی ہے؟ نہیں۔ ہم تو جیتی جاگتی شانتی کے خواہشمند ہیں۔ نہ کہ مُردہ شانتی کے۔ جب لوگ تو اندھیرے میں ٹھوکریں کھا کھا کر گر رہے ہوں اور آپ اپنی روشنی کو چھپائے رکھے ہوں۔ تو اس سے یہی بہتر تھا کہ آپ کے پاس روشنی ہی نہ ہوتی۔ اگر کوئی شخص اپنا فرض ادا کرنے میں گریز کرے اور اُس موقعہ پر اُس بات (بھید) کو نہ کہے کہ جس کے کہنے سے اوروں کا بھلا ہوتا ہو۔ تو وہ شخص ضرور مُجرم ہے۔

(ب) اب ہم آبادی کی طرف آتے ہیں۔ اس مضمون پر جو کچھ مال تھس (Malthus) اور دیگر پولیٹکل ایکانومی یا سیاست مدن والوں نے کہا ہے اُس کے بیان کرنے کی یہاں کچھ ضرورت نہیں ہے۔ مال تھس

صرف علم الحیات کے نتیجوں کو دوہراتا ہے۔ آؤ ذرا دیکھیں تو سہی کہ نیچرل فلاسفی یعنی علوم طبیعیات کے ماہر اس معاملہ میں کیا رائے زنی کرتے ہیں۔ ہکسلے ایک نو آبادی یا قوم کو تشبیہ اُس باغیچہ سے دیتا ہے جو ایک خودرَو جنگل کے بیچ میں واقع ہے۔ طریقۂ سوشل ایوولیوشن (social evolution) یا ساماجک وکاش (جس کا نام اُس نے اخلاقی طریقہ رکھا ہے) طریقہ باغبانی یا گُلستانی سے بالکل تشابہ ہے۔ مگر یہ دونوں طریقے جنگلی طریقہ کے بالکل برعکس ہیں۔ جنگلی طریقہ کا یہ خاصہ ہے۔ کہ زبردست اور لگاتار جدو جہد برائے زندگی ہوتا ہے۔ گُلستانی یا اخلاقی طریقہ اس جد و جہد کی جڑ کو اُکھاڑتا ہے یعنی اُن اسباب کو جن سے جنگ و جدل پیدا ہو دُور کرتا ہے۔ ہنری ڈرمنڈ (Henry Drummond) ان دونوں طریقوں کو ایک ثابت کرنے کی بڑی زبردست کوشش کرتا ہے۔ مگر باوجود اس شور و غوغا کے وہ اُن نتائج سے جو ڈاروِن (Darwin) اور ہکسلے (Huxley) نے اخذ کئے ہیں۔ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا ہے۔ اس بات سے اُس کو بھی انکار نہیں ہے۔ اور نہ کسی اَور کو جس کے ہوش و حواس بجا ہیں۔ اس سے انکار ہو سکتا ہے۔ کہ اگر باغبان برابر نرائی (گوڈی) نہ کرتا رہے۔ یعنی خودرَو گھاس پھُوس نہ اُکھاڑتا رہے۔ تو بہت جلد وُہی جنگلی طریقہ باغ میں پھر اپنا تسلّط جما لے گا۔ اور پھر شانتی اور اُنتی یعنی تسکین اور ترقی کو دور کر اُس کی جگہ جنگ و جدل والے بیرحمانہ طریقہ سے اُکھاڑ پچھاڑ مچا دے گا۔ سوسائٹی یا قوم کا بھی ٹھیک ایسا ہی حال ہے۔ جس وقت کسی مُلک کی آبادی اپنی انتہائی حد تک

پہنچ جاتی ہے۔ اور اُس حد سے زاید آبادی کے دُور کرنے کا کچھ انتظام نہیں کیا جاتا۔ تو آئے دن خونخوار لڑائی اور جھگڑے کھڑے ہو کر شانتی کو نیست و نابود کر دیتے ہیں ۔ اخلاقی ترقی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں ۔ مذہبی پند و نصائح کو باطل کر دیتے ہیں اور احکامِ الٰہی کو ناکارہ و منسوخ ۔ ایسے نازک وقت میں قوموں میں بد خُلقی اور زوال پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔

رُوم و یونان اور دیگر مُلکوں کے زوال کے اسباب کی تہ میں یہ ہی سوالِ زاید آبادی موجود تھا ۔ مُدتیں ہُوئیں کہ ہندوستان بلحاظ آبادی اپنی حد تک پہنچ چُکا ۔ اور ہم نے اس بُرائی کو جڑ سے اُکھاڑنے کا اب تک کوئی انتظام نہیں کیا ۔ اس دُنیا کے پردہ پر کوئی مُلک ایسا نہیں ہے جو ہندوستان کا سا غریب اور حد سے زیادہ آباد ہو ۔ اس دیش کا ایک سادھارن یعنی اوسط درجہ کا گھر ساری قوم کی حالت کا ایک خاکہ ہے ۔ آمدنی بہت کم اور ہر سال کھانے والوں کی تعداد ہی میں زیادتی نہیں بلکہ لغو اور ظالم رسم و رواج کی غلامی میں پڑکر بیجا و ناجائز اخراجات کی بھی زیادتی ہوتی جاتی ہے ۔ جب چارہ تو ہو صرف ایک یا دو کے لئے مگر جانور بہت سے ۔ تو ایسی حالت میں وہ بھی تو ایک دوسرے سے لڑ مرتے ہیں ۔ لڑائی جھگڑے کی جڑ کو تو دُور نہ کرنا اور شانتی و صُلح کا اُپدیش دینا ۔ یہ اُپدیش کا مضحکہ اُڑانا نہیں تو اور کیا ہے ۔ ہمارے دیش والے بڑے بھولے بھالے اور شانت سُبھاؤ ہیں ۔ اُن کا دِل بیشک ملائم و صُلح کُل ہے ۔ مگر حسد و خود غرضی سے وہ کیسے بچ سکتے ہیں جبکہ جسمانی کمزوریوں

اور ضروریات نے اُن کو مجبور کر رکھا ہے۔ اگر آبادی والا مسئلہ بلا حل ہُوئے رہ گیا۔ تو قومی اتفاق اور اتحاد کے بارہ میں بات چیت کرنا محض خیالی پلاؤ پکانا ہوگا۔ بیتال کا یہ معمّہ حل کرنا ہوگا۔ ورنہ موت کے مُنہ میں جانا ہوگا۔ علم الحیات کے مسائل کے مطابق ہمدردی اور بیغرضی اُس سوسائٹی میں نشوونما نہیں پاسکتیں۔ جہاں آئے دن دُکھ اور درد سامنے کھڑا ہو۔ اے ہندوستانیو! ایسی آبادی اور مفلسی کے ہوتے ہُوئے ہمدردی۔ محبت اور اتفاق کی ترّقی کی بابت اُمید کرنا تمہارے لئے لا حاصل ہے۔ علم طبیعات کے طُلبا اس بات کو جانتے ہیں کہ ہرایک مادّہ کا حجم چاہے وہ کسی قسم کا ہو۔ اپنی اندرُونی مساوات اُسی وقت تک قائم رکھ سکتا ہے۔ جب تک کہ اُس کے ذرّات جن سے وہ مرکّب ہے۔ ایک دوسرے سے برابر فاصلہ پر رہیں۔ تاکہ ہرایک ذرّہ کو باقاعدہ حرکت کرنے کی کافی جگہ مل سکے۔ اب ہندوستان کی آبادی کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ کیا اُس کا ہر فرد بشر بلا اوروں سے ٹکرائے ہُوئے باقاعدہ حرکت کر رہا ہے۔ کیا اُن کو آزادی کے ساتھ قدرتی طور پر حرکت کرنے کے لئے جگہ کافی ہے۔ اگر ایک کے کھالینے سے دس بھُوکے رہ جاتے ہیں۔ تو قومی مساوات کو محفوظ رکھنے کے لئے تمہیں بہت جلد انتظام کرنا چاہئے۔ ورنہ ہندوستان کو آخر میں جنگلی قُدرت کے خطرناک لاڈ و پیار کا شکار ہونا ہوگا۔ جس کا نتیجہ ہماری جیسی ناگفتہ بہ حالت والوں کے لئے بقول مہرشی وسشٹ جی بجزُ وبا۔ قحط۔ تباہ کُن جنگ اور زلزلہ کے اور کچھ نہ ہوگا۔

بس بُرائیوں کا بہت ذکر ہوچُکا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ بہت

سے ہیں۔

(۱) ایسے تاریک خیال کو کہ ہندوستان سے باہر قدم رکھنا بہشت سے اپنے آپ کو محروم کرنا ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس سرزمین سے نکال دینا چاہئے۔ اور وہ ہندوستانی جو یہاں بسر اوقات نہیں کر سکتے۔ اُن کو چاہئے کہ اس سرزمین کو چھوڑ دیں اور باہر جا کر آباد ہوں۔ کنوئیں کے مینڈک بننے میں کیا مزا دھرا ہے۔ کیا تُم اس کو نہیں دیکھتے کہ تم ہندوستان جنت نشان کو اپنے لئے گلہ گھونٹو کال کوٹھری بنا رہے ہو؟

(۲) ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کے نو آباد آریوں کے لئے بہت سی اولاد کا پیدا کرنا مُبارک تھا۔ لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا بلکہ تختہ پلٹ گیا ہے۔ آج کل بے انداز آبادی کے لحاظ سے بہت بڑے کنبہ کا ہونا وبالِ جان ہوگیا ہے

وہ لاپرواہ آدمی جو ابھی تک اس طفلانہ خیال کو کہ "مرنے کے بعد مجھے بہشت کا ملنا میری اولاد پر منحصر ہے" لئے بیٹھا ہے ذرا آنکھ کھول کے دیکھے تو سہی۔ کہ مرنے سے پہلے ہی اُس کا گھر کثرتِ اولاد کے مارے دوزخ (نرک) بنا ہوُا ہے۔ ارجن کا ٹھیک یہی وہم کہ "پِتروں کے دوارا سورگ ملتا ہے"۔ سری کرشن کے مدِّنظر تھا جب بھگوت گیتا کے دُوسرے ادھیائے میں ۴۲ سے ۴۵ شلوک تک اُنہوں نے اُن لوگوں کو جو خواہشات نفسانی کے جنّت کے پیچھے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ذلیل کیا ہے۔ بقولیکہ

جنّت پرست زاہد کب حق پرست ہے
حُوروں پہ مر رہا ہے۔ شہوت پرست ہے

यामिमां पुष्पितां वाचं प्रवदन्त्यविपश्चितः।

वेदवादरताः पार्थ नान्यदस्तीति वादिनः॥ ४२॥

कामात्मानः स्वर्गपरा जन्मकर्मफलप्रदाम्।

क्रियाविशेषबहुलां भोगैश्वर्यगतिं प्रति॥ ४३॥

भोगैश्वर्यप्रसक्तानां तयापहृतचेतसाम्।

व्यवसायात्मिका बुद्धिः समाधौ न विधीयते॥ ४४॥

त्रैगुण्यविषया वेदा निस्त्रैगुण्यो भवार्जुन।

निर्द्वन्द्वो नित्यसत्त्वस्थो निर्योगक्षेम आत्मवान्॥ ४५॥

ذرا ان اشلوکوں کو پڑھو تو سہی۔ اور اُس سوتنترتا کے بھاؤ یعنی آزادی کے جوش کو جو اُن سے ظاہر ہو رہا ہے حاصل تو کرو۔ آؤ اس مضر مسئلہ کو جو مُدتوں سے ہم پر حکومت کرتا چلا آیا ہے ہم دیش سے باہر نکال دیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ بُواہ کرو۔ دھڑا دھڑ اولاد پیدا کرو۔ جہالت (اگیانتا) میں زندگی بسر کرو اور غلامی میں مرو۔ ہم کبھی مسلمانی عملداری کو اپنے زوال کا باعث جان کر اُسے کوسنے لگتے ہیں۔ کبھی برٹش راج میں نُقص نکالنے لگتے ہیں۔ کبھی ہندوستان کے مذاہب کو اُس کی تباہی و بربادی کا سبب کہتے ہیں۔ اور کبھی طریقہ تعلیم کو بدنام کرنے لگتے ہیں۔ اس قسم کی نُکتہ چینیوں میں ایک حد تک ہم صحیح ہو سکتے ہیں۔ مگر اصل الزام کا سبب وہ اپوترتا یا اگیانتا یعنی وہ ناپاکی یا جہالت ہے۔ جو دُنیا میں سب سے پاک رشتہ کو ناپاک کردیتی ہے۔ یہ وُہی رشتہ ہے۔ جس سے ہم سب ہندوستانی پیدا ہوئے اور جس نے ہم کو ایسا بنا رکھا ہے۔ جیسے ہم آج ہیں۔ یہ رشتہ بُواہ

یا شادی ہے۔ اس اشد ضروری اور پاک رسم کے منعقد کرنے میں سب سے زیادہ غفلت اور بے پرواہی کی جاتی ہے۔ باوجود جنم پتروں یعنی زائچوں کی مطابقت اور جیوتش یعنی علمِ نجوم کے متابعت کے اور باوجود شگون کی پہچان اور منتروں کے گان اور بھی بے انتہا متبرک رسم اور رواج کے ہندوستان میں شادی بیاہ بے وقت۔ نامبارک اور ناپاک ہوتے ہیں۔ کوئی بھی نکشتر (ستارے) ایسے نامبارک گھروں پر نہیں ٹھیر سکتے۔ جہاں وہ دیکھ رہے ہوں کہ کم سن بچوں کی شادیاں نکشتروں کے لگن اور مہورت کے نام سے ہو رہی ہیں۔ اس نظارے کو جو انسانیت سے بعید اور حیوانیت سے بھی نیچے ہے دیکھ کر وہ ڈر کے مارے کانپنے لگتے ہیں اور اپنی جگہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ ایسے میاں بیوی کی نامبارک شادی پر جو اپنی بسر اوقات کا انتظام خود نہ کر سکتے ہوں۔ وید پاک کی رچائیں بھی اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ ساری اُمیدوں کا خُون اُسی دم سے ہو جاتا ہے وہ پھُول کہاں ہیں۔ جن کی خوشبو اس رسم کی نامبارک بدبُو کے سامنے ٹھیر سکے۔ جس کے ذریعہ مفلسوں کے میل سے نالائق بیکار نکمے اور مفت خور بچے مُلک میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

اے نوجوانو اس کو روکو! روکو! اے نوجوانوں! تمہارے ہی اوپر ہندوستان کی بہبودی (مستقبل) کا دارو مدار ہے۔ اس کو روکو! روکو!! روکو!!! اخلاق کے نام پر۔ ہندوستان کے نام پر۔ اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے مہربانی کر کے اس طوفانِ بدتمیزی یعنی بے وقت اور اندھا دُھند کی شادیوں کو جو مُلک میں ہو رہی ہیں۔ روکو! روکو! اس سے لوگ پذیر ہو جائیں گے اور آبادی والا مسئلہ بھی کسی قدر

حل ہو جائے گا۔

فرض کرد یہ تجاویز قدرتی نہیں۔ تو بھی تمہیں قحط و موت کے کوڑے تلے ان ہدایتوں پر چلنا ہوگا۔ اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ یہ بڑے کرخت واقعات اور ہولناک اصل حالات ہیں۔ جو ان الفاظ سے ملبوس ہیں۔ کیا بچپن کی شادی اور بال بدھوا کی بربادی دُنیا میں غیر قدرتی نظارے نہیں ہیں۔ دُنیا کی کسی مہذّب قوم سے پوچھ دیکھو۔ کیا کوئی ذرہ انسانیت کا تُم میں باقی رہ گیا ہے۔ ان غیر انسانی اور غیر قدرتی رسم و رواج کے روکے بغیر بھلا تمہیں کیسے چین آسکتا ہے؟ بال بدھوائیں یعنی معصوم بیواہیں بے تحاشا اپنے نازک بازو امداد کے لئے پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ جیتی جاگتی ستیاں عین تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری بھُننے والی رسم و رواج کی چِتا پر گڑھ کڑھ کر جل رہی ہیں۔ ان معصوم بیواہوں کی بھولی بھالی روتی ہوئی آنکھوں سے ساکھشات بھوانی تمہاری مدد کے لئے تک رہی ہے۔ کب تک آپ اس فریاد کرنے والی بھوانی سے مُنہ پھیرتے رہوگے۔ کچھ عرصہ اور اس کی گریہ و زاری بھری فریادوں کو نہ سُنو۔ پھر دیکھو تو سہی کہ یہ بھوانی ضرور خونخوار و بھیانک کالی کا روپ دھارن کرلے گی اور قہر و انتقام کی مورتی بنجائیگی۔

مگر جب تک یہ اپنے آپ سے آئی ہوئی کالی دیویاں مُلک میں موجود ہیں۔ شانتی کہاں؟ کیا تُم اس لئے رُکے ہو کہ ذرا اس بات کو سوچ بچار لیں۔ اور اس مسئلہ کی بابت ست شاستروں میں دیکھ بھال لیں کہ وے کیا کہتے ہیں؟ افسوس۔ یہ تو بالکل صاف ہے۔ پرتیکش ہے۔ رُکو مت۔ بھگوان شنکر کی نیک نصیحت

(جو گیتا بھاشیہ کے ادھیائے ۱۸ شلوک ۶۶ میں ہے) ہمیشہ یاد رکھو۔ کہ کتبِ پاک یا شرتی انہیں باتوں کے لئے پرمان یا حوالہ مانی جاتی ہیں جن کو علم کے معمولی ذریعوں (جیسے پرتیکش) سے ہم نہیں جان سکتے۔ وہ شارح عظیم (یعنی بڑا بھاری بھاشکار) اس طرح فرماتا ہے کہ شرتی صرف اُسی بات کے جاننے کے لئے پرمان یا حوالہ ہیں جو منش کے گیان (یعنی انسانی علم کی پہنچ) سے پرے ہے۔ آگے بڑھ کے آچاریہ جی مہاراج اس طرح تشریح کرتے ہیں۔ چاہے سینکڑوں شرتیاں کہا کریں کہ آگ سرد اور تاریک ہوتی ہے۔ مگر اس معاملہ میں یہ کوئی پرمان نہیں ہوسکتیں۔

یورپ میں جس قدر نیچی جماعت کے لوگ ہوتے ہیں اُسی قدر جلدی اُن کے یہاں شادی بواہ ہوتا ہے۔ اُتنی جلدی کسی نیچ سے نیچ قوم کا بھی وہاں بواہ نہیں ہوتا۔ اُونچی قومیں تو ۳۰ برس سے پہلے کبھی بھی شادی بواہ نہیں کرتیں۔ اُن کا یہ خیال ہے کہ بچے کم ہوں۔ مگر لائق ہوں۔

ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) اپنے اصول علم الحیات میں اس بات کو دکھلاتا ہے کہ جیوں جیوں خیالات اعلیٰ ہوتے جاتے ہیں۔ تیوں تیوں زرخیزی (ترقی نسل) کم ہوتی جاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو کب تک اتنا نیچا بنائے رکھیں گے۔ اور جانوروں کی طرح نسل بڑھانے کو اچھا سمجھتے رہیں گے۔ ہمارے یہاں کے شاستروں کے بموجب۔ جو برہم چریہ کی خوبیوں کی مدح سرائی کرنے میں کبھی اُکتاتے نہیں۔ کوئی طاقت خواہ جسمانی ہو یا رُوحانی ایسی نہیں ہے جو عصمت

کے بغیر حاصل ہو۔ انسانی قوّت کا وہ حِصّہ جو نفس پرستی نفسانی خواہش وغیرہ
میں نفس امّارہ کے نام سے نمودار ہوتا ہے اگر روکا جاوے اور قابو
میں لایا جاوے تو وہ نُور ربانی یا قوّتِ رُوحانی میں بدل جاتا ہے۔ اس
لئے دیوتاؤں کے ہمرکاب جنگ کرنے والی قوم کی اَولاد! تم کو جذباتِ
نفسانی کو اپنے قابو میں کرنا چاہئے۔ وہ بیوقوف جو جذبات حیوانی کو قابو
میں نہیں لاسکتا۔ اور قدرت کے سنجیدہ ترین تعلّق یعنی حیوانی و
نفسانی جذبہ کو کھیل تماشا سمجھتا ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ سچ مچ اپنا ہی
خون۔ اپنا ہی سفید خون جو اُس کی جان ہے۔ بہا رہا ہے۔ سارے
پاپوں کی جڑ اسی قوّتِ ربانی کا نامناسب استعمال ہے۔ جیسے کو پاتر
(غیر مستحق) کے پاس دھن یا مال۔ یعنی نا مناسب جگہ پر دولت ہی
کوڑا کرکٹ ہے۔ اس جذبہ کو لوگ حیوانی جذبہ نام دے کر حقیر قرار
دیتے ہیں۔ حیوان بیشک حقیر اور بیوقوف ہیں کیونکہ اندھا دُھند نسل
بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اور اُس دھڑا دھڑ اولاد پیدا کرنے کا نتیجہ خونخوا
جنگ و جدل ہے۔ جس سے کلنک یعنی بدنامی کا ٹیکا اُن کے سر
لگتا ہے۔ پھر بھی حیوان اس لئے بالکل بے گناہ ہیں۔ کہ لذّت کے لئے
وہ اس حرکت کو نہیں کرتے۔ انسان تو حیوان سے اعلیٰ اس لئے مانا
جاتا ہے۔ کہ اُس کے خیالات اُس کی عقل کے بس میں ہوتے ہیں۔
مگر وہ انسان جو اولاد کے اندھا دُھند پیدا کرنے میں حیوانوں کے
برابر ہے۔ اور غیر ضروری اور ناپاک لذّت کے حاصل کرنے میں حیوانوں
سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے وہ کون سی ذلّت اور خواری ہے جو اس
پر نازل نہ ہوگی۔

عصمت۔ یہ عصمت یا پوترتا تو تمہیں کھانڈے کی دھار پر حاصل کرنی ہوگی۔ اگر تم عصمت یا پوترتا کو حاصل نہ کروگے تو ایوولیوشن یعنی ارتقاء کے جد و جہد کا بیرحم پہیہ تمہیں کچل ڈالے گا۔ اور بالکل نیست و نابود کردے گا۔ اس وقت تمہارے مستقبل کا انحصار صرف تمہاری عصمت پر ہے۔ جس طرح وحشیوں کے درمیان ایوولیوشن یعنی ارتقاء عالم کے طریقہ نے قریبی رشتہ داروں میں عفت یا پوترتا کا رواج زبردستی پیدا کردیا ہے۔ اُسی طرح اَے ہند کے رہنے والو! قانونِ ارتقاء اس امر کا بڑے زور سے مقتضی ہے۔ کہ تمہارے خیالات پاک ہوں اور تمہارا چال چلن پوتر۔ اگر تم اس کو حاصل نہیں کرتے تو تم زندہ نہیں رہ سکتے چاہے یہ مشکل ہو یا آسان۔ نہیں تو یہ حاصل کرنا ہی پڑے گا۔ ہندوستان کے لئے۔ اپنے جسموں کے لئے۔ اپنے دماغوں کے لئے۔ اپنے مذہب کے لئے۔ اس لوک کے لئے۔ پرلوک کے لئے۔ دُنیا کے لئے۔ اور عقبیٰ کے لئے۔ تمہیں تو بالکل ہی پوتر ہونا پڑے گا۔ بنا پوترتا[1] کے ویرتا[2] نہیں۔ بلا عفت کے ہمت نہیں۔ بنا شُدھتا[3] کے ایکتا نہیں۔ بنا عصمت کے ایکا نہیں اور بغیر پوترتا کے شانتی نہیں

رباعی۔ بنا شُدّھی کے وِیرتا ہے نہیں
جہاں ہے پوترتا ہے ایکا وہیں
بلا عِفّت کے ہمّت عُنقا سمجھ
بلا شُدھی ہے شانتی کب کہیں

---

[1] پاکیزگی [2] بہادری [3] صفائی۔

(۳۱) تعلیم۔امریکہ اور انگلینڈ کے ان پڑھ لوگ بھی ہمارے ہاں کی یونیورسٹیوں کے معمولی انڈر گریجوائیٹوں سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔ یہ کیسے؟ اُن کی تعلیم کا خاص ذریعہ روزانہ سستے اخبار ہوتے ہیں۔ انگلینڈ۔جاپان اور امریکہ میں کالجوں سے بڑھکر اخبار علم کی اشاعت یعنی وِدیا کا پرچار کرتے ہیں۔گورنمنٹ اور دیگر جماعتوں کا ہم اس لئے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے مُلک میں کسی قدر تعلیم پھیلاتے ہیں۔ مگر یہ عملی صورت میں نہیں کے برابر ہے۔عوام الناس کی جہالت اور عورتوں کی لاعلمی کی خوفناک حالت کے بارے میں سوائے ہمارے کسی اور پر درحقیقت کوئی الزام نہیں عاید ہوسکتا ہے۔اُس زندہ طاقت کو جو ذلیل کاموں و بیکاری میں لاپرواہی سے ضایع کیا جا رہا ہے عورتوں کی حالت سُدھارنے میں عوام الناس کو تعلیم دینے میں اور اپنے آپ اور قوم کو اُٹھانے کی کوشش میں لگا دو۔اس کام کے لئے سب سے آسان اور سیدھا طریقہ جو اختیار کرنا پڑے گا وہ دیسی اخباروں کی حالت کو سنبھالنا ہوگا۔اِستریوں اور سادھارن لوگوں کی بھاشا میں ایسے اخبار نکالو جو سچ مچ مفید ہوں۔ اور اُن اخباروں کو جو متذکرہ بالا بھاشا میں پہلے سے نکلتے ہوں بہتر بنادو۔ اس بارہ میں پہلے بھی کچھ کوشش کی گئی تھی مگر ناکام رہی۔کیونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ عموماً دیسی اخباروں سے نفرت کرتا ہے۔تمہیں اپنی ماتری بھاشا یعنی مادری زبان کی عزت کرنا سیکھنا چاہئے۔

ینگ مین انڈین اسوسیشن (Y. M. Indian Association) کو چاہئے کہ سیدھی سادی ہندی بلکہ پنجابی زبان کا ہندی حرفوں میں ایک پرچہ نکالے اور جہاں تک ہوسکے۔ فارسی اور سنسکرت کے لفظوں کو اُس

میں آنے ندے۔ اور اُس قسم کی ناقص طرز تحریر سے پرہیز کرے۔ جس کو وہ پُورے طور سے ادا نہ کر سکتی ہو۔

جو ہو سو ہو (اندر باہر سے ایک ہو) جیسا خیال کرتے ہو۔ ویسا لکھو۔ کسی کی نقل مت کرو۔ کالج کے طلباء بھی اُس پرچہ میں چھوٹے چھوٹے مضامین دیا کریں۔ اُن تعجب انگیز اثر کرنے والے بھاوؤں اور روشنی بخشنے والے خیالوں کو جو تمہارے پڑھتے وقت پیدا ہوں۔ اپنی ماتر بھاشا میں کبھی کبھی ادا کرنے سے تم کو بمقابلہ ناظرین کے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ اگرچہ اوروں کی نگاہ میں ناظرین تم سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے معلوم دیں گے۔ اس کام کے لئے کسی بڑے لمبے چوڑے بیان سے تم کو تھکانے کی ضرورت نہیں پہلا نمبر اُس پرچہ کا ہندی ابجد (ورن مالا) اور حرفوں کی آسان ملاوٹ اور گھریلو لفظوں سے شروع ہونا چاہیئے۔ اور کالج کے مبارک طالبعلموں کو جو مُلک میں روشنی اور تعلیم پھیلانے کے لئے رہبر ہیں چاہیئے کہ اس مبارک ڈیوٹی کو اپنے ذمہ لیں۔ یعنی اپنی بہنوں۔ ماتاؤں۔ بیویوں۔ لڑکیوں اور دیگر رشتہ دار عورتوں کو جو لکھ پڑھ نہیں سکتیں۔ لکھنا پڑھنا سکھلا دیں۔ پبلک اسکولوں یعنی سرکاری مدرسوں کے لئے بیٹھے مت رہو۔ یہ مبارک ذمہ داری تُمہارے ہی کندھوں پر ہے۔ اگر ہندوستان کو زندہ رہنا ہے۔ تو اِستری شِکشا (تعلیم نسواں) کو نہایت وُسعت کے ساتھ پرچار (اشاعت) کرنا پڑے گا۔ تو پھر تُمہارے ہی ہاتھوں سے یہ کام کیوں نہ شروع ہو جائے۔ دیکھو مُلک میں کوئی عورت یا غریب آدمی اَن پڑھ (جاہل) نہ رہنے پاوے۔ مُلک کے چہرے سے اس کلنک کے ٹیکے یا بدنامی کے داغ کو مٹا دو۔ کیا تم کو اپنی ٹرِدسن

بھنگن کو پڑھاتے ہُوئے شرم معلوم دیتی ہے یا ڈر؟ اگر ایسا ہے تو تمہارے آداب اور اخلاق پر تُف۔ غریب اور ان پڑھ لوگوں کے پاس مادرانہ ہمدردی اور محبّت کو لیکر اُن کو پڑھانے کے لئے جاؤ۔ یہ کیسا دیوتاؤں یعنی فرشتوں کا ساکام ہے۔ ینگ میز انڈین اسوسی ایشن کے آرگن یعنی نوجوانانِ ہند کی انجمن کے پرچہ میں علومِ طبیعیات۔ فزیالوجی (علم الاعضاء) نجوم۔ تاریخ۔ سیاست مدن۔ سائیکالوجی۔ اور دیگر علوم ایک نہایت دلچسپ اور آسان طریقہ میں جیسے تم لکھ سکتے ہو۔ رفتہ رفتہ جگہ پاویں۔ اور رفتہ رفتہ عبارت میں بھی ترقّی ہوتی جاوے۔ رام پرچہ کے لئے ہندی حرفوں کے استعمال کی سفارش کرتا ہے۔ کیونکہ بہت جلد ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہُوا چاہتی ہے۔ عورتوں اور غریبوں کو تعلیم دینا تُمہارے لئے بڑا بھاری کام یعنی فرضِ اولےٰ ہے۔ یہ وہ کام ہے۔ کہ اگر پُورے طور سے انجام دیا جاوے۔ تو تُم کو انجام کار یہ عرشِ معلّےٰ تک پہنچاویگا۔ مگر بھُولنا مت۔ تُمہارے لئے ایک اور کام ہے۔ جو اس سے بھی زیادہ سیدھا سادہ اور اشد ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ تربیت یافتہ مُلکوں میں جاکر فنِ زراعت اور صنعت و حرفت کو سیکھو اور اس مفیدِ علم کو سارے ہندوستان میں پھیلا دو۔

خوراک۔ خوراک کا سوال بھی بڑا ہی ضروری ہے۔ دماغی اور جسمانی طاقتیں اُسی وقت پُورا پُورا عروج پا سکتی ہیں۔ جس وقت کھان پان کے مسئلہ پر مناسب توجہ دی جاوے۔

سہ جیسا کھاوے اَنّ۔ تیسا ہووے من
جیسا پیوے پانی ویسی ہووے بانی

اگر تم اپنی طاقت کے خاص ذریعہ یعنی خوراک کا پورا علم رکھتے ہو تو ساری نامناسب تھکاوٹ دور اور طاقت کی کمی بھرپور ہوسکتی ہے۔ کیا کھانا چاہئے اور کیسے کھانا چاہئے؟ اس علم کو سائنس کے رُو سے آپ جانو۔ اور پھر عورتوں کو جو ہم کو کھلاتی ہیں۔ کھان پان کی فلاسفی بتلاؤ۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں نے نہایت اہم کھان پان کا مسئلہ بغیر حل کئے چھوڑ دیا۔ اور نہایت شرم کی بات ہے کہ ماہرانِ سائنس بھی کھانے کے ساتھ بعض ادویات اور الکوہل وغیرہ کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ زیادہ نہیں جانتے۔

مذہب۔ کیا اس پرچہ نے تمہارے صبر کو تھکا دیا؟ اور کیا تم سُنتے سُنتے اُکتا گئے؟ چاہے اُکتا گئے ہو یا نہیں۔ جب تک وہ ایک بات جو رام جانتا ہے۔ تم سے کہہ نہ لے گا تمہیں کہیں جانے نہ دے گا۔ اے شادی کے مہمانو! کیا تمہیں کہیں بڑے ضروری کام پر جانا ہے؟ باشد۔ مگر یہ خرانٹ ملاح تمہیں اُس وقت تک نہ چھوڑے گا جب تک کہ وہ ایک بات جس کے کہنے کے لئے یہ پیدا ہوا ہے۔ تم سے کہہ نہ لے۔ کوئی اور کام رام کے پیام کو سُننے سے بڑھ کر ضروری ہو نہیں سکتا۔ گھریلو۔ سوشل یا قومی فرائض تمہارے کرم کانڈ ہیں اور نہ کوئی کرم یا عمل نیک اندھیرے میں کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اندھیر کھاتا ہی اندھیرے میں ہوسکتا ہے۔

Deeds of darkness may be committed in the dark.

وشواس یا یقین کا شعلہ بھڑکائے بغیر اور دہکتے ہوئے گیان کی مشعل

کو ہردے میں جگائے بغیر تم کچھ کر نہیں سکتے۔ ایک قدم آگے بڑھ نہیں سکتے۔ یہ ساری ہدایتیں اور تفصیل وار باتیں جو ہر روز تمہارے کانوں میں بھری جاتی ہیں۔ ویسی ہی ہیں جیسے تمہاری جانوں کے قالب۔ مگر بغیر روح کے کوئی قالب ٹھیر نہیں سکتا۔ ساری کامیاب تحریکوں کی جان ایک جیتا جاگتا وشواس یعنی زندہ ایمان اور جلتا دہکتا گیان ہے۔ بڑے بڑے نامی گرامی مادہ پرست۔ شکی یا منکر۔ ناستک اور دہریوں تک کی کامیابی کا نادانستہ باعث اسی دھرم کی روح رواں ہے جو اُن میں موجود ہے۔ بعض موقعوں پر ان لوگوں نے اپنے جیون میں اُن لوگوں سے جو دھارمک بنے بیٹھے ہیں بہت زیادہ دھرم برتا ہے۔ ایک ربڑ کا کارخانہ لیجئے۔ یہ ہزاروں بلکہ لاکھوں بیکاروں کی روزی چلاتا ہے۔ یہ لوگ۔ قومی تجارت کو چلا کر مُلک میں روپیہ اکٹھا کرتے ہیں۔ اور غریب اور محنتی لوگوں کے لئے دُخانی کشتیاں (اگن بوٹ) ریل اور ڈاک وغیرہ کے بہت سے کام نکال کر اُن کا ڈھارس باندھتے ہیں اگر ایک ایک Inner اور chemical equation یا reaction یا ہر ایک مساوات کیمیادی اور جوابات عملِ اندرونی سے شان و شوکت اور بزرگی و عظمت نہ ٹپکتی ہوتی۔ تو یہ رونق کہاں سے آتی۔ پس جب تک کہ اندرونی جواب عمل پیدا نہ ہو۔ تمہارا کوئی کام چاہے ذاتی ہو۔ چاہے خانگی اور چاہے سوشل چاہے پولیٹکل۔ چل نہیں سکتا۔ اس جوابِ عمل کو انقلابِ قلب۔ دماغی یعنی مانسک سُدھار۔ رُوحانی مساوات یا اپنے آپ میں پرماتما کا پرکاش بھی کہتے ہیں۔ کارلائل (Carlyle) اس طرح رقمطراز ہے کہ وشواس (یقین

یا ایمان) بڑا ہی زندگی بخش ہے۔ ہر ایک قوم کی تواریخ اُس کے اپنے یقین (یہ شواس) کے مطابق ثمرہ ور، رُوح افزا اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ اہلِ عرب میں حضرت محمد کو دیکھئے کہ ایک صدی میں اُنھوں نے (اپنے وِشواس کی بدولت) کیا کا کیا کر دکھایا۔ گویا اُس عالم پر جو بظاہر تاریک اور کس مپرس ریگستان تھا چنگاری آن پڑی اور وہ ریگ کے ذرّے بارُود کے چھرّے بن گئے۔ اور دہلی سے گربناڈا تک آسمان کو اُڑا دُھواں دھار کر دیا۔ اللہ و اکبر۔ خُدا ہی بڑا ہے اور سب ہیچ ہے۔

جو سچ مچ بڑا ہے۔ وہ اندر کی نا معلوم گہرائی سے نکلتا ہے۔ جو کوئی پُورے طور سے خُدائی خیالات میں نہیں رہتا۔ یا جُزوًا ان خیالات میں رہ کر کلیتہً ان میں رہنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ چاہے جہاں رہے اُس کا گھر عدم میں ہے۔ وہ زندہ نہیں مُردہ ہے۔

ہربرٹ سپنسر نک نے بھی اُس اخیری تصنیف میں جو dying Swan Song اس راج ہنس کا نغمۂ الوداعی کہا جاسکتا ہے۔ ہکسلے کے اُس تجربہ کا جو اُسنے ایک بڑے دماغ والے کچھوے پہ کیا تھا حوالہ دیتے ہُوئے یوں کہا ہے کہ ہمارے علم الخیال (thought consciousness) کا جسم احساس (feeling) سے بنا ہے اور یہ اس جسم کی باہری صورت ہے کہ جس کو ہم ذہانت (intelligence) کہتے ہیں۔ خیال کے بابت تذکرہ کرتے وقت جو حصہ ہم عموماً اُڑا دیتے ہیں وُہی ضروری ہے اور وہ احساس ہے۔ احساس آقا ہے۔ اور عقل نوکر ہے۔ اس محسوس کرنے والی قوّت کو عام لوگ دِل کہتے ہیں۔ جو وِشواس اور

دھرم کا ستھان یعنی یقین اور ایمان کا مکان ہے۔ یہ ہی قوّت کام کراتی اور کام کے سرانجام دینے کے لئے ہماری اِنرجی (طاقت) کو اُبھارتی ہے۔ سپنسر صاحب پھر یُوں فرماتے ہیں کہ فکر (دماغ) کو ترقّی دینے اور آدا (دل) کو یوں ہی پڑے رہنے دینے سے کچھ کام نہیں نکلے گا۔ اوسو کِس خوبی کے ساتھ اس نامی ناستک کا اخذ کیا ہُوا نتیجہ آج کل کے سب سے لائق سائیکالوجی کے جاننے والے پروفیسر جیمس صاحب کے اس بیان سے مطابقت کرتا ہے کہ مذہبی تجربہ ایسا ہی یقین دلانے والا ہے۔ جیسا کوئی حواسوں سے دُوبدُو تجربہ ہووے۔ اور یہ قاعدہ کُلیہ ہے کہ اُن مسائل سے جو علمِ منطق کے دلائل سے ثابت ہوں۔ بدرجہا زیادہ یقین مذہبی تجربہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس زبانی جمع خرچ کی سطح کے نیچے اپنی نیچر کی گہری سطح پر رہنا۔ اپنے وجود کی گہرائی کو ناپنا یعنی پریکٹس کرنا اور اپنی اندر والی حقیقت کو جو درحقیقت نیچر کی حقیقت ہے محسوس کر کے آپ ہی وہ حقیقت بن جانا۔ "تت توم اسی" یا "انت الحق" کا ایک جیتا جاگتا روپ بننا ہے۔

This, this is Life: this, this is Immortality!
This is to live and move as Power, Shakti,
That splits pillars with the glances,
Such can say.

سہ یہ ہی تو زندگی ہے۔ جیوَن امر یہی ہے
یہ ہی تو ہے وُہ شکتی۔ جس کی نظر یا درشٹی
دے پھاڑ کھمبے یکدم۔ اس طور کے تو ہیں ہم

1— The world turns aside,
To make room for me;
I come blazing Light
And the shadows must flee.

2— O mountains, Beware!
Come not in my way;
Your ribs will be shattered
And tattered today.

3— O Kings and Commanders!
My fanciful toys;
Here's a Deluge of fire,
Line Clear! my boys.

4— I hitch to my chariot,
The Fates and the Gods.
With thunder of Cannon,
Proclaim it abroad:

5— Shake! Shake off delusion.

Wake! Wake up! Be free.
Liberty! Liberty!
Liberty!

غزل

(۱) دُنیا ہٹ دُور پرے اب تو مَیں جاگ اُٹھا ہُوں
نورِ روشن ہُوں مَیں۔ تاریکی تُو ہٹ دُور پرے
(۲) ہو خبردار پہاڑو۔ میرے رستہ سے ہٹو
ورنہ ڈالوں گا کُچل ہاڑ اور پنجر سارے ؛
(۳) اے سلاطین و سردار! تُم ہو کھلونے میرے
لاین کلیر کرو اِس نُورِ مجسّم کے لئے ؛
(۴) توپ اور گولے سے ہُوں مَیں تو ڈھنڈورا پیٹوں
قسمت اور دیوتا ہیں رتھ سے مرے دیکھو بندھے
(۵) مایا ہٹ دُور پرے اب تو مَیں جاگ اُٹھا ہُوں
جاگ جاگ اور ہو آزاد اے پرکاش مرے

یہ گیان جس کا ایک پہلو اننت شکتی یعنی لا انتہا قوّت ہے۔
اسی کا دُوسرا پہلو اننت شانتی یا لامحدود راحت ہے۔

ٹھنڈک بھری ہے دِل میں آنند بہہ رہا ہے
امرت برس رہا ہے۔ رجھم! رجھم!! رجھم!!!
پھیلی ہے صُبح شادی۔ کیا چین کی گھڑی ہے
سُکھ کے چھُٹے پھوارے۔ فرحت چٹک رہی ہے

کیا نُور کی جھڑی ہے رِجھم ! رِجھم !! رِجھم !!!
شبنم کے دل نے چاہا۔ پامال کر دے گُل کو
سب فکر مل کے آئے کہ نڈھال کر دیں دل کو
آیا صبا کا جھونکا وہ صبائے روشنی کا
جھڑتی ہے شبنمِ غم رِجھم ! رِجھم !! رِجھم !!!

—·—·—✻—·—·—
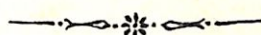
اطلاعِ عام

شری سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کی کُل تقاریر و تصانیف
زبان اُردو ہندی و انگریزی جو شری۔ آر۔ ایس۔ نارائن
سوامی جی مہاراج سے مُرتب ہوکر بذریعہ شری رام تیرتھ
پبلیکیشن لیگ لکھنؤ مسلسل شایع ہوئی اور ہو رہی ہیں
اُن سب کے حقوق محفوظ ہیں۔ تاکہ کوئی صاحب تجارت
کے خیال سے بغیر اجازت لیگ مذکور قصد طبع نہ کرے
یہ سب کُتب لیگ مذکور سے ہر وقت مل سکتی
ہیں۔ اور تاجرانِ کُتب کو واجب کمیشن بھی دیا جاتا
ہے

منیجر شری رام تیرتھ پبلیکیشن لیگ۔ لکھنؤ
نمبر ۲۵۔ ماڑواڑی گلی